اثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد 27

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
سورۂ بلد	۲۹
سورۂ بلد کی فضیلت اور اس کا مضمون	۳۰
آیت ۱ تا ۷	۳۳
اس شہر مقدس کی قسم	۳۴
آیت ۸ تا ۱۰	۴۰
آنکھ زبان اور ہدایت کی نعمت	۴۰
چند نکات	
۱ : آنکھ زبان اور ہدایت کی	۴۲
۲ : زبان کی حیرت انگیزیاں	۴۵
۳ : نجدین کی طرف ہدایت	۴۵
آیت ۱۱ تا ۲۰	۴۷
دشوار گزار گھاٹی	۴۸
چند قابل توجہ نکات	۵۰
سورۂ الشمس	۵۵
سورۂ الشمس اور اس کی فضیلت	۵۷

عنوان	صفحہ
آیت ۱ تا ۱۰	۵۹
۱ تہذیب نفس کے بغیر نجات ممکن نہیں	۶۰
چند نکات	
۱ : قرآنی قسموں کا ان کے نتائج کے ساتھ ربط	۶۷
۲ : سورج کا عالم حیات میں نقش و اثر	۶۷
آیت ۱۱ تا ۱۵	۶۹
سرکشوں کا ہلاکت خیز انجام	۷۰
چند نکات	
۱ : قوم ثمود کی سرگزشت کا خلاصہ	۷۴
۲ ۲ : اشقی الاولین و اشقی الآخرین	۷۵
۳ : تہذیب نفس ایک عظیم خدائی وظیفہ ہے۔	۷۵
سورۂ اللیل	۷۹
سورۂ اللیل کے مضامین اور اس فضیلت	۸۰
آیت ۱ تا ۱۱	۸۱
سورۂ اللیل کا شان نزول	۸۲
تقویٰ اور خدائی امدادیں	۸۴

عنوان	صفحہ
آیت آیت ۱۲ تا ۲۱	۸۸
انفاق اور جہنم کی آگ سے دوری	۸۹
ایک نکتہ	
۱: سورۂ اللیل کی شان کے بارے میں ایک بات۔	۹۲
۲: انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت	۹۴
سورۃ الضحیٰ	۹۷
سورۃ الضحیٰ کے مضامین اور اس کی فضیلت	۹۹
آیت ۱ تا ۵	۱۰۱
شانِ نزول	۱۰۱
تجھے اس قدر عطا کرے گا کہ تو خوش ہو جائے گا	۱۰۲
ایک نکتہ	
انقطاعِ وحی کا فلسفہ	۱۰۵
آیت ۶ تا ۱۱	۱۰۶
ان تمام نعمتوں کے شکرانے میں جو خدا نے تجھے دی ہیں۔	۱۰۷
چند نکات	
۱: مصائب و آلام کے درمیان سے مبعوث ہونے والا پیغمبر	۱۱۲
۲: یتیموں پر نوازش و شفقت	۱۱۳
۳: نعمتوں کو بیان کرنا۔	۱۱۵
سورۂ الم نشرح	۱۱۸
سورۂ الم نشرح کے مضامین اور اس کی فضیلت	۱۱۹
آیت ۱ تا ۸	۱۲۱
ہم نے تجھے انواع و اقسام کی نعمتیں عطا کی ہیں	۱۲۲
چند نکات	
سورۃ التین	۱۳۱
سورہ التین کے مطالب و فضیلت	۱۳۳
آیت ۱ تا ۸	۱۳۵
ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا	۱۳۶
سورہ العلق	۱۴۳
سورہ علق کے مطالب اور فضیلت	۱۴۵
آیت ۱ تا ۵	۱۴۷
شانِ نزول	۱۴۸
اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ	۱۴۹
چند نکات	
۱: وحی کا آغاز ایک حرکتِ عملی کے ساتھ ہوا۔	۱۵۲
۲: ہر حال میں ذکرِ خدا	۱۵۳
آیت ۶ تا ۱۴	۱۵۵
کیا تجھے معلوم نہیں کہ خدا تیرے تمام اعمال کو دیکھتا ہے۔	۱۵۶
ایک نکتہ	
عالم ہستی خدا میں ہے۔	۱۵۹
آیت ۱۵ تا ۱۹	۱۶۰
سجدہ کر اور تقرب حاصل کر	۱۶۱
ایک نکتہ	

عنوان	صفحہ
سرکشی اور بے نیازی کا احساس	۱۶۴
سورۃ القدر	۱۶۷
سورۂ قدر کے مطالب اور اس کی فضیلت	۱۶۹
آیت ۱ تا ۵	۱۷۱
شبِ قدر نزولِ قرآن کی رات	۱۷۲
چند نکات	
۱: شبِ قدر میں کون سے امور مقدر ہوتے ہیں	۱۷۵
۲: شبِ قدر کون سی رات ہے۔	۱۷۶
۳: شبِ قدر مخفی کیوں رکھی گئی	۱۷۷
۴: کیا گذشتہ امتوں میں بھی شبِ قدر تھی۔	۱۷۷
۵: شبِ قدر ہزار ماہ سے کیسے برتر ہے؟	۱۷۸
۶: قرآن شبِ قدر میں کیوں نازل ہوا؟	۱۷۹
۷: کیا مختلف علاقوں میں ایک ہی شبِ قدر ہوتی ہے؟	۱۷۹
سورۃ البینہ	۱۸۱
سورۃ البینہ کے مطالب اور اس کی فضیلت	۱۸۳
آیت ۱ تا ۵	۱۸۵
یہ جاودانی دین ہے۔	۱۸۶
آیت ۶ تا ۸	۱۹۱
بہترین اور بدترین مخلوق	۱۹۲
چند نکات	
۱: علیؑ اور ان کے شیعہ خیر البریہ ہیں	۱۹۴
۲: عبادت میں خلوص نیت لازم ہے۔	۱۹۷

عنوان	صفحہ
۳: انسان کی عجیب قوسِ صعودی اور نزولی	۱۹۷
سورۃ الزلزال	۱۹۹
سورۃ الزلزال کے مطالب اور فضیلت	۲۰۱
آیت ۱ تا ۸	۲۰۳
جس دن انسان اپنے تمام اعمال دیکھے گا	۲۰۴
چند نکات	
۱: قیامت کے حساب و کتاب میں دقت اور سخت گیری	۲۰۹
۲: ایک سوال کا جواب	۲۱۰
۳: قرآن کی سب سے زیادہ جامع آیات	۲۱۰
سورہ والعادیات	۲۱۳
سورہ والعادیات کے مطالب اور اس کی فضیلت	۲۱۵
آیت ۱ تا ۱۱	۲۱۷
شانِ نزول	۲۱۸
بیدار مجاہدین کی قسم	۲۱۹
چند نکات	
۱: اس سورہ کی قسموں اور اس کے ہدف کے درمیان ربط۔	۲۲۶
۲: کیا انسان طبعاً ناشکرا اور بخیل ہے۔	۲۲۷
۳: جہاد کی عظمت	۲۲۸
سورۃ القارعہ	۲۲۹

عنوان	صفحہ
سورۃ القارعہ کے مطالب اور اس کی فضیلت	۲۳۱
آیت ۱ تا ۱۱	۲۳۱
چھپنے والا حادثہ	۲۳۲
ایک نکتہ	
میزان اعمال کی سنگینی کے اسباب	۲۳۶
سورۃ التکاثر	۲۳۹
سورۃ التکاثر کے مطالب اور اس کی فضیلت	۲۴۱
آیت ۱ تا ۸	۲۴۳
شانِ نزول	۲۴۴
تکاثر و تفاخر کی مصیبت	۲۴۴
چند نکات	
۱ : تفاخر کا سرچشمہ	۲۴۸
۲ : یقین اور اس کے مراحل	۲۵۰
۳ : سب لوگ دوزخ کا مشاہدہ کریں گے	۲۵۱
۴ : قیامت میں کون سی نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا۔	۲۵۲
سورہ والعصر	۲۵۵
سورہ والعصر کے مطالب اور اس کی فضیلت	۲۵۷
آیت ۱ تا ۳	۲۵۹
نجات کی صرف ایک راہ	۲۵۹
ایک نکتہ	
خوش بختی کا چار نکاتی پروگرام	۲۶۳
❊ ❊ ❊	

عنوان	صفحہ
سورۃ الہمزۃ	۲۶۷
سورۂ ہمزہ کے مطالب اور فضیلت	۲۶۹
آیت ۱ تا ۹	۲۷۱
شانِ نزول	۲۷۲
عیب جوئی اور غیبت کرنے والوں کے لیے وائے ہے۔	۲۷۲
چند نکات	
۱ : کبر و غرور بڑے بڑے گناہوں کا سرچشمہ ہے۔	۲۷۹
۲ : مال جمع کرنے کی حرص۔	۲۸۰
سورۃ الفیل	۲۸۵
سورۃ الفیل کے مطالب اور فضیلت	۲۸۷
آیت ۱ تا ۵	۲۸۹
شانِ نزول	۲۹۰
اصحاب فیل کی داستان	۲۹۰
ابرہہ سے کہہ دو کہ آنے میں جلدی نہ کرے	۲۹۴
چند نکات	
۱ : ایک بے نظیر معجزہ (اس گھر کا ایک مالک ہے)	۲۹۶
۲ : معمولی وسیلہ سے سخت ترین سزا	۲۹۷
۳ : داستان فیل کے اہداف	۲۹۸
۴ : ایک مُسلّم تاریخی رُوئیداد	۲۹۸
سورہ قریش	۳۰۱

عنوان	صفحہ
سورہ قریش کے مطالب اور اس کی فضیلت	۳۰۲
آیت ۱ تا ۴	۳۰۳
اس گھر کے پروردگار کی عبادت کرنی چاہیے	۳۰۴
سورۃ الماعون	۳۰۷
سورہ ماعون کے مطالب اور فضیلت	۳۰۸
آیت ۱ تا ۷	۳۰۹
معاد کے انکار کے اثرات بد	۳۱۰
چند نکات	
۱ : سورہ ماعون کے مباحث کی جمع بندی	۳۱۳
۲ : تظاہر و ریا ایک بہت بڑی اجتماعی مصیبت ہے۔	۳۱۴
سورۃ الکوثر	۳۱۷
سورۃ الکوثر کے مطالب اور فضیلت	۳۱۹
آیت ۱ تا ۳	۳۲۱
ہم نے تجھے فراواں خیر و برکت دی	۳۲۱
چند نکات	
۱ : حضرت فاطمہؑ اور کوثر	۳۲۴
۲ : اس سورہ کا اعجاز	۳۲۵
۳ : خدا کے لیے جمع کی ضمیر کس لیے ہے۔	۳۲۶
سورۃ الکافرون	۳۲۷
سورہ کافرون کے مطالب اور فضیلت	۳۲۹
آیت ۱ تا ۶	۳۳۱

عنوان	صفحہ
شان نزول	۳۳۱
۱ : بت پرستوں کے ساتھ ہرگز مصالحت نہیں ہو سکتی	۳۳۲
۲ : کیا بت پرست خدا کے منکر تھے۔	۳۳۴
۳ : یہ تکرار کس لیے ہے	۳۳۴
۴ : کیا لکم دینکم ... کی آیت کا مفہوم بت پرستی کا جواز ہے۔	۳۳۶
۵ : آپ نے ایک لمحہ کے لیے بھی شرک سے مصالحت نہیں کی۔	۳۳۷
سورۂ والنصر	۳۳۹
سورۂ والنصر کے مطالب اور فضیلت	۳۴۱
آیت ۱ تا ۳	۳۴۳
جب اصلی کامیابی آن پہنچے	۳۴۳
ایک نکتہ	
فتح مکہ، اسلام کی عظیم ترین فتح	۳۴۶
سورۃ اللہب	۳۵۳
سورۃ اللہب کے مطالب اور فضیلت	۳۵۴
شان نزول	۳۵۵
آیت ۱ تا ۵	۳۵۷
ابولہب کا ہاتھ کٹ جائے	۳۵۸
چند نکات	
۱ : قرآن کے اعجاز کی ایک اور نشانی	۳۶۲
۲ : ایک اور سوال کا جواب	۳۶۲

عنوان	صفحہ
۳ : بے بصیرت رشتہ دار ہمیشہ دور ہوتے ہیں۔	۳۶۳
سورۃ الاخلاص	۳۶۵
سورۂ اخلاص کے مطالب وفضیلت	۳۶۷
آیت ۱ تا ۴	۳۷۱
وہ یکتا اور بے مثال ہے	۳۷۱
چند نکات	
۱ : توحید کے دلائل	۳۸۱
۲ : توحید کی اقسام	۳۸۲
۳ : توحید افعالی کی اقسام	۳۸۳
۴ : توحید در مالکیت	۳۸۳
۵ : توحید حاکمیت	۳۸۴
۶ : توحید اطاعت	۳۸۴
سورۃ الفلق	۳۸۷
سورۂ فلق کے مطالب وفضیلت	۳۸۹

عنوان	صفحہ
آیت ۱ تا ۵	۳۹۱
میں سپیدۂ صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں	۳۹۲
چند نکات	
۱ : شر و فساد کے اہم ترین سرچشمے	۳۹۵
۲ : آیات کا تناسب	۳۹۵
۳ : جادو کی تاثیر	۳۹۵
۴ : حاسدوں کا شر	۳۹۶
سورۃ الناس	۳۹۹
سورۃ الناس کے مطالب وفضیلت	۴۰۱
آیت ۱ تا ۶	۴۰۲
لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں	۴۰۴
چند نکات	
۱ : ہم خدا کی پناہ کیوں مانگتے ہیں۔	۴۰۶
تفسیر نمونہ کا اختتام	۴۰۹
تمام جلدوں کی اجمالی فہرست	۴۱۱

❖ ❖ ❖

ایک[1] تجربہ کا اختتام
دُوسرے[2] تجربہ کا آغاز

اَب جب کہ خُدا کے لُطف و کرم اور اس کی توفیق و عنایت سے "تفسیر نمونہ" کا کام "پندرہ سال" کے بعد ختم ہو رہا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم قارئینِ عزیز کی خدمت میں، جنہوں نے اس طویل سفر میں ہمارا ساتھ دیا ہے، چند نکات اس عظیم تجربہ کے ثمرہ اور نتیجہ کے طور پر پیش کریں، جو شاید قرآن مجید کا مطالعہ اور تحقیق کا راستہ طے کرنے والوں کے لیے مُفید ہوں۔

۱۔ ہم اس مسلسل مطالعہ کے دوران قرآنِ مجید کے بارے میں چند احادیث کے مفہوم کے عمق اور گہرائی سے آشنا ہوئے ہیں اور ان کی حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ پہلی حدیث وُہ ہے جس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کے بارے میں فرماتے ہیں:

"له نجوم وعلی نجومه نجوم لا تحصی عجائبه ولا تبلی غرائبه فیه مصابیح الهدی و منازل الحکمة"

"قرآن میں درخشاں ستارے ہیں اور ان ستاروں کے اُوپر اور دوسرے ستارے ہیں۔
اس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے اور اس کے عُمدہ مطالب پُرانے نہیں ہوتے۔
اس میں ہدایت کے چراغ اور حکمت کی منزلیں ہیں"[1]

ایک اور حدیث میں امام علیؑ بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کی:

"ما بال القرآن لا یزداد علی النشر والدرس الا غضاصة"

"قرآن کا جتنا مطالعہ اور نشر و اشاعت ہوتی ہے یہ اتنا ہی زیادہ تر و تازہ کیوں ہوتا جاتا ہے؟"

---

[1] بحارالانوار جلد ۸۹ ص ۱۷ (کتاب نوادر راوندی میں "تخوم" کی لفظ ہے، تخوم جو اصل اور بیج کے معنی میں ہے۔

آپ نے فرمایا :

" لان الله تبارك و تعالیٰ لم یجعله لزمان دون زمان ولا لناس دون ناس فهو فی کل زمان جدید وعند کل قوم غض الی یوم القیامة " :

" اس کی وجہ یہ ہے کہ خُدا نے قرآن کو کسی خاص زمانہ کے لیے قرار نہیں دیا = اسی لیے وہ ہر زمانہ میں تر و تازہ اور ہر گروہ اور قوم کے لیے قیامت تک سرسبز و شاداب ہے " [1]

حقیقت یہ ہے کہ شجرۂ طیبۂ قرآن ایسا ہے کہ جب بھی اس کی کسی شاخ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں تو وہ تر و تازہ پھل دیتا ہے : تؤتی اکلها کل حین باذن ربها " اور وہ ایک ایسا بیکراں سمندر ہے کہ جس قدر اس میں غوطہ لگائیں تازہ اور نئے گوہر ہاتھ آتے ہیں جب انسان " تفسیر موضوعی " کی بحث میں وارد ہوتا ہے تو آیاتِ قرآنی سے ایسے نئے مطالب اس پر منکشف ہوتے ہیں جو اس وقت تک اس پر منکشف نہیں ہوئے تھے ۔

یہ حقیقت تمام تفسیرِ قرآن کی راہ طے کرنے والوں کو ایسا شوق اور اُمید دلاتی ہے کہ وہ کسی وقت بھی طلب و تلاش سے دست بردار نہیں ہوتے ، اور آخر عمر تک کسی زمانہ کو قرآن مجید کے سلسلے میں کام کا اختتام اور انتہا تصور نہیں کرتے ،

ایک اور حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

" فیه ربیع القلب وینابیع العلم وما للقلب جلاء غیره " :

" قرآن میں دلوں کی بہار اور علم و دانش کے سرچشمے ہیں اور کوئی چیز بھی قرآن کی مانند دل کو جلاء نہیں بخشتی " [2]

اس حدیث کے وجود کو ہم نے خُود بھی پُورے وجود کے ساتھ اپنے آپ میں محسوس کیا ہے کیونکہ انسان قرآن میں جتنا کام کرتا ہے یہ اتنا ہی نیا نور و صفا اور نئی رُوح و رواں اس میں پیدا کرتا ہے جو شخص قبول نہیں کرتا وہ تجربہ کر کے دیکھ لے ۔

۲ ۔ تمام پہلوؤں سے قرآنی تعلیمات کی وسعت کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ ہم مسلمان معارف اور اعتقادی مسائل کے لحاظ سے ، اور اسی طرح سیاسی ، اقتصادی اور اجتماعی قوانین کی نظر سے کسی قسم کی کمی نہیں رکھتے ۔ قرآن اس لحاظ سے ایسا غنی اور بے نیاز ہے کہ ہماری سب ضروریات کو پُورا کر سکتا ہے (البتہ قرآن میں ان مسائل کے اصول و کلیات آئے ہیں ، اور ان کی تشریح معصومین کی سُنّت اور اخبار میں ہے) ۔

اس بنا پر ہمیں " مشرق و مغرب کے فلسفوں " اور ان کے قوانین کی طرف ہاتھ پھیلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور امیرالمومنین علی علیہ السلام کے فرمان کے مطابق :

" واعلموا انه لیس علی احد بعد القرآن من فاقة ولا لاحد قبل القرآن

---

[1] گزشتہ ماخذ ص ۱۵

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶

من غنی :

" جان لو کہ کوئی شخص قرآن کے ہوتے ہوئے فقیر و محتاج نہیں ہے اور کوئی شخص قرآن کے بغیر غنی و بے نیاز نہیں ہے "[1]

ہماری مشکلات اور نقصانات معرفت کے اس عظیم منبع سے پُورے طور پر آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے ہیں ۔

قرآن ایک ناشناختہ خزانے کے مانند ہمارے درمیان موجود ہے ۔ اور وہ گوہر ، جو کون و مکان کے صدف میں نہیں ملتے اور ان کی جگہ صرف قرآن میں ہے ، ہم انہیں دریا کے کنارے گمشدہ لوگوں سے طلب کرتے ہیں اور جو چیز خود ہمارے پاس موجود ہے ہم اس کی غیروں سے تمنا رکھتے ہیں ۔

ہماری دوسری مشکل یہ ہے کہ ہم پہلے سے کیے ہوئے فیصلوں اور مشرق و مغرب کے طریقوں پر چل کر قرآن کی آیات کی ان پہلے سے کیے ہوئے فیصلوں پر تطبیق کرتے ہیں ۔ قرآن کے ساتھ یہ سلوک بالکل غلط ہے ۔ اسی نے ہمیں اس کے معارف سے محروم کر رکھا ہے اور اس کو ہم نے اپنے ناقص افکار کے حصول اور اپنی غلطیوں کی توجیہ کے لیے ایک آلۂ کار بنا کر رکھ دیا ہے ۔

۳ ۔ بہت سے مسلمان قرآن کو صرف اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ یہ ایک مقدس کتاب ہے ، جس کی تلاوت باعثِ ثواب و برکت ہے ، اور اس کی آیات کو حفظ کرنا فضیلت کی دلیل ہے ۔

وہ اس بات کو بھولے ہوئے ہیں کہ قرآن عمل کا پروگرام ہے اور وہ جتنا بھی احترام و عظمت رکھتا ہے یہ اس کے تربیتی نتائج کی بنا پر ہے ۔ اگر قرآن کے الفاظ ، اس کے کلمات اور اس کے حروف محترم ہیں ـــ جو یقیناً محترم ہیں ـــ تو وہ اس عالی ہدف اور مقصد کی بنا پر ہیں ۔ لیکن انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ایک گروہ اس ہدف اور مقصد کو بھولے ہوئے ہے ، اور صرف اس کے الفاظ کے اندر پھنسا ہوا ہے ۔

قرآن کو حفظ اور یاد کرنے کے لیے بہت سے اسلامی ممالک میں مدارس اور محافل کی بُنیاد ڈالی گئی ہے اور علماء تجوید و قرأت بڑی دقت اور باریک بینی ، اور بعض اوقات الفاظ سے مربوط امور میں ، وساوس میں مشغول ہیں ۔ جس وقت ایک قاریٔ قرآن کسی چھوٹی سورت یا کسی طویل آیت کو ایک ہی سانس میں پڑھتا ہے تو سب " اللہ اللہ " پکار اُٹھتے ہیں ، اور ایک فنی کام اور مہارت کے عنوان سے اس کی تعریف اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں ، لیکن اس سُورہ کے مضمون پر کوئی " اللہ اللہ " نہیں کہتا ، بلکہ اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کے سلسلے میں بہت سے اسلامی ممالک اور اسلامی معاشروں میں کوئی خبر ہی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اسے اہمیت دیتا ہے ۔

ہم نے تفسیر نمونہ میں سُورتوں کے آغاز میں اس جملہ کا شاید ۱۱۴ مرتبہ (قرآنی سُورتوں کی تعداد تکرار کیا ہے کہ روایات میں جو کچھ قرآن کے فضائل کے بارے میں آیا ہے وہ فضائل اس شخص کے لیے ہیں جو تلاوت کرے ، ایسی تلاوت جو غور و فکر کی تمہید اور مقدمہ ہو ، ایسا غور و فکر جس کا نتیجہ عمل ہو ۔

یہ بار بار کی تکرار شاید بعض کی نظر میں بلا سبب معلوم ہوتی ہو ، لیکن یہ صرف اسی وجہ سے ہے کہ اس خیال کو توڑا اور ختم کیا جائے کہ قرآن کی فضیلت صرف اس کی آیات پڑھنے کے لیے ہے ۔ جی ہاں ! یہ تکرار اسی بنا پر ہے کہ قرآن ایک عملی کتاب کی صُورت

---

[1] نہج البلاغہ ، خطبہ ۱۷۶

اختیار کرلے۔

ہمیں اُمید ہے کہ وہ سعی و کوشش، جو بہت سے اسلامی علما اور دانش مندوں کی طرف سے اس سلسلہ میں ہوئی ہے یا ہو رہی ہے، ہماری اس آرزو کو پُورا کردے گی کہ تمام مُسلمان اس عظیم آسمانی کتاب کی آیات کی طرف زندگی کے ایک پروگرام کے عنوان سے دیکھنے لگیں، اور ایک جامع حیات بخش اور انسان ساز دستور العمل کی صُورت میں اسے اپنالیں۔ تفسیرِ نمونہ میں یہ ہماری آخری بات تھی، اور باقی چیزوں کو ہم "تفسیرِ موضوعی" کے سپرد کرتے ہیں۔ (والحمد للہ رب العالمین)۔

قم حوزہ علمیہ۔ ناصر مکارم شیرازی

❖ ❖ ❖

جلد ۲۷

(آخری جلد)

تفسیر نمونہ

البلد	البیّنة	القریش
الشمس	الزلزال	الماعون
اللیل	العٰدیات	الکوثر
الضحیٰ	القارعة	الکافرون
الم نشرح	التکاثر	النصر
التین	العصر	اللهب
العلق	الهمزه	الاخلاص
القدر	الفیل	الفلق
		الناس

اس تفسیر کا آغاز ۸ ماہِ رمضان مبارک ۱۴۰۷ھ کو ہوا۔

سُورَہ بَلَدْ

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہُوا۔

❖ اس کی بیس آیات ہیں۔

سُورۂ بلد کی فضیلت اور اس کا مضمُون

یہ سُورہ مختصر ہونے کے باوجود عظیم حقائق اپنے اندر لیے ہوئے ہے :۔

۱۔ اس سُورہ کے پہلے حصّہ میں پُر معنی قسموں کے ذکر کے بعد اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ انسان کی زندگی اس عالم میں مشکلات اور تکلیفوں کے ساتھ توأم ہوتی ہے، تاکہ وہ ایک طرف تو اپنے آپ کو مشکلات سے جنگ کرنے کے لیے آمادہ کرے اور دُوسری طرف اس دُنیا میں راحت و آرام اور مطلق آسُودگی کی توقع اپنے ذہن سے نکال دے، کیونکہ مطلق آسُودگی و راحت تو صرف آخرت کی زندگی میں ہی ممکن ہے۔

۲۔ یہ سورہ دُوسرے حصّہ میں انسان پر اللہ کی کچھ اہم ترین نعمتوں کو شمار کرتا ہے، اور اس کے بعد ان نعمتوں کے مقابلہ میں اس کی ناشکری اور کُفرانِ نعمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۳۔ اس سُورہ کے آخری حصّہ میں لوگوں کو دو گروہوں "اصحابِ میمنہ" اور "اصحابِ مشئمہ" میں تقسیم کرتا ہے، اور پہلے گروہ (صالح مومنین) کے صفاتِ اعمال کے ایک گوشہ کو اور پھر ان کی سرنوشت کو بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد ان کے نقطۂ مقابل یعنی کفار و مجرمین اور ان کی سرنوشت کو پیش کرتا ہے۔

اس سُورہ کی آیات کی تعبیریں بہت ہی قاطع اور دو ٹوک اور چُبھنے والی ہیں، اس کی جُملہ بندیاں مختصر اور زوردار ہیں الفاظ بہت ہی مؤثر اور انتہائی فصیح ہیں، آیات کی صُورت اور اس کا مضمون اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ سُورہ مکّی سُورتوں میں سے ہے۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :

من قرأها اعطاه الله الامن من غضبه يوم القيامة ۔

"جو شخص سورۂ بلد کو پڑھے گا خدا اُسے قیامت میں اپنے غضب سے امان میں رکھے گا۔"[1]

نیز ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ :

"جو شخص نمازِ واجب میں سورہ "لا اقسم بھذا البلد" کو پڑھے گا وہ دُنیا میں صالحین میں شمار ہوگا اور آخرت میں ایسے لوگوں میں سے پہچانا جائے گا جو بارگاہِ خدا میں مقام و منزلت رکھتے ہیں، اور وہ انبیاء، شہداء اور صلحاء کے دوستوں میں سے ہوگا۔"[2]

❖ ❖ ❖

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۰

[2] "ثواب الاعمال" مطابق نقل نورالثقلین جلد ۵ ص ۵۷۸۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ
۲۔ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ
۳۔ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۙ
۴۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ؕ
۵۔ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۘ
۶۔ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ
۷۔ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ؕ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خُدا کے نام سے

۱۔ قسم ہے اس شہر مقدس (مکّہ) کی۔
۲۔ وُہ شہر کہ جس میں تو ساکن ہے!
۳۔ اور قسم ہے باپ اور اس کے بیٹے کی (ابراہیمؑ خلیل و اسمٰعیلؑ ذبیح)۔
۴۔ کہ ہم نے انسان کو تکلیف میں پیدا کیا ہے۔ (اور اس کی زندگی رنج و الم سے پُر ہے)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ
۲۔ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ
۳۔ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۙ
۴۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ؕ
۵۔ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۘ
۶۔ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ
۷۔ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ؕ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خُدا کے نام سے

۱۔ قسم ہے اس شہر مقدس (مکہ) کی۔
۲۔ وُہ شہر کہ جس میں تو ساکن ہے!
۳۔ اور قسم ہے باپ اور اس کے بیٹے کی (ابراہیمؑ خلیل و اسمٰعیلؑ ذبیح)۔
۴۔ کہ ہم نے انسان کو تکلیف میں پیدا کیا ہے۔ (اور اس کی زندگی رنج و الم سے پُر ہے)۔

۵۔ کیا وُہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس پر کوئی بھی قُدرت نہیں رکھتا ؟!
۶۔ وُہ یہ کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال (اچھے کاموں میں) تلف کر دیا ہے !
۷۔ کیا وُہ یہ گمان کرتا ہے کہ اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔ (اور نہ ہی دیکھتا ہے) ؟

تفسیر

اس شہرِ مقدّس کی قسم

بہت سے موارد میں قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ اہم حقائق کو قسم کے ساتھ شروع کرتا ہے، ایسی قسمیں جو خُود بھی انسانی عقل اور فکر و نظر کے تحرک کا سبب ہوتی ہیں، ایسی قسمیں جو اس موردِ نظر مطلب کے ساتھ ایک خاص ربط رکھتی ہیں۔
یہاں بھی اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے کہ دُنیا میں انسان کی زندگی دُکھ، درد اور رنج و الم کے ساتھ توأم ہے ایک نئی قسم سے شروع کرتا ہے اور فرماتا ہے :
"قسم ہے اس شہرِ مقدّس مکہ کی" (لا[1] اقسم بھٰذا البلد)۔
"وہ شہر کہ جس میں تو ساکن ہے" (وانت حل بھٰذا البلد)۔
اگرچہ ان آیات میں مکّہ کا نام صراحت کے ساتھ نہیں آیا، لیکن ایک طرف تو اس سُورہ کے مکّی ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور دُوسری طرف اس مقدّس شہر کی حد سے زیادہ اہمیت کی بنا پر یہ بات واضح ہے کہ اس سے مُراد مکّہ ہی ہے۔ اور مفسّرین کا اجماع بھی اسی پر ہے۔
یقیناً سرزمینِ مکّہ کی شرافت اور عظمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ خدا اس کی قسم کھائے، کیونکہ توحید اور پروردگار کی عبادت کا پہلا مرکز یہیں بنایا گیا تھا، اور عظیم پیغمبروں نے اس گھر کے گرد طواف کیا ہے۔ لیکن "وانت حل بھٰذا البلد" کا جملہ ایک نئے مطلب کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے، جو یہ کہتا ہے کہ یہ شہر تیرے وجود کے فیض و برکت سے اس قسم کی عظمت کا حامل ہو گیا ہے کہ وہ اس قسم کے لائق ہو گیا ہے۔
اور حقیقت بھی یہی ہے کہ سرزمینوں کی قدر و قیمت ان میں مقیم انسانوں کی قدر و قیمت کی وجہ سے ہوا کرتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کفّار یہ تصوّر کرنے لگیں کہ قرآن نے جو اس سرزمین کی قسم کھائی ہے تو وہ ان کا وطن ہونے، یا ان کے بتوں کا مرکز ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت کا قائل ہو گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اس شہر کی قدر و قیمت (اس کے مخصوص تاریخی حالات سے قطع نظر) خدا کے خاص

---

[1] یہاں "لا" زائدہ ہے، جو تاکید کے لیے آیا ہے۔ البتہ ایک دوسری تفسیر کے مطابق احتمال ہے کہ "لا" نافیہ ہو (اس سلسلہ میں مزید وضاحت سُورۂ قیامت کی ابتدا میں دی گئی ہے)۔

بندے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجودِ ذیجود کی بنا پر ہے :

اے کعبہ را زیمن قدوم تو صد شرف
دی مروہ را زِ مقدمِ پاکِ تو صد صفا
بطحا ز نورِ طلعت تو یافتہ فروغ
یثرب ز خاک پائے تو بارونق و نوا

اے وہ کہ تیرے قدوم میمنت لزوم سے کعبہ کا شرف سوگنا ہوگیا ہے۔
اور تیرے پاک قدم کے آنے سے مروہ کو صفائی حاصل ہوگئی ہے۔
بطحا نے تیرے نور کی چمک سے روشنی حاصل کی ہے۔
اور یثرب تیرے پاؤں کی خاک کی وجہ سے بارونق اور خوشحال ہوگیا ہے۔

یہاں ایک اور تفسیر بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ : " میں اس شہرِ مقدس کی قسم نہیں کھاتا، جب کہ انہوں نے تیرے احترام کی ہتک کی ہے، اور تیری جان و مال اور عزت و آبرو کو حلال اور مباح شمار کر لیا ہے۔"

اور یہ کفار قریش کے لیے ایک شدید سرزنش اور توبیخ ہے کیونکہ وہ خود کو حرم مکہ کے خادم اور محافظ سمجھتے تھے اور وہ اس سرزمین کے احترام کے اس قدر قائل تھے کہ اگر ان کے باپ کا قاتل بھی اس میں آجاتا تو وہ بھی امان میں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ جو لوگ مکہ کے درختوں کا چھلکا بھی لے کر اپنے بدن سے باندھ لیتے تھے تو وہ بھی اس کی وجہ سے امان میں ہوتے تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان تمام آداب و سنن کو پاؤں تلے کیوں روند ڈالا !!

اور آپؐ کے اور آپؐ کے اصحاب کے بارے میں ہر قسم کے آزار اور اذیت کو جائز کیوں سمجھ لیا، یہاں تک کہ ان کے خون کو بھی مباح سمجھنے لگے !!

یہ تفسیر ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "قسم ہے باپ اور اس کے بیٹے کی (و والد وما ولد)۔

اس بارے میں کہ اس باپ اور بیٹے سے کون مراد ہے؟ کئی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔

پہلی تفسیر یہ ہے کہ "والد" سے مراد "ابراہیم خلیل" اور "ولد" سے مراد "اسمٰعیل ذبیح" ہیں۔ اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گزشتہ آیت میں شہر مکہ کی قسم کھائی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کعبہ اور شہر مکہ کی بنیاد رکھنے والے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے، یہ تفسیر بہت ہی مناسب نظر آتی ہے، خصوصاً زمانۂ جاہلیت کے عرب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند کی حد سے زیادہ اہمیت کے قائل تھے، اور ان پر فخر کرتے تھے اور اُن میں سے بہت سے اپنا نسب ان دونوں تک پہنچاتے تھے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بیٹے ہیں۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۳

تیسری تفسیر یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذرّیت میں سے جو پیغمبر اور انبیاء مبعوث ہوئے وُہ مراد ہیں۔

چوتھی تفسیر یہ ہے کہ اس سے ہر باپ اور بیٹا مراد ہیں کیونکہ مختلف زمانوں میں توّلد اور نسلِ انسانی کی بقاء کا مسئلہ خلقت کی آفرینش کے حیرت انگیز ترین مسائل میں سے ہے، اور خدا نے خصُوصیت کے ساتھ اس کی قسم کھائی ہے۔

ان چاروں تفسیروں کے درمیان جمع بھی بعید نہیں ہے اگرچہ پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔[1]

اس کے بعد اس چیز کو بیان کرتا ہے جو ان قسموں کا اصل مقصد ہے فرماتا ہے، : "یقیناً ہم نے انسان کو رنج اور تکلیف میں پیدا کیا ہے، (لقد خلقنا الانسان فی کبد)۔

"کبد" مجمع البیان" میں طبرسی کے قول کے مطابق اصل میں شدّت کے معنی میں ہے، اسی لیے جب دُودھ گاڑھا ہو جاتا ہے تو اُسے "تکبد اللبن" کہتے ہیں۔

لیکن "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق "کبد" (بروزن حسد) اس درد کے معنی میں ہے جو انسان کے "کبد" (سیاہ جگر) کو عارض ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہر قسم کی مشقت اور دُکھ تکلیف کے لیے اطلاق ہونے لگا۔

اس لفظ کی اصل چاہے جو کچھ بھی ہو اس کا اس مقام پر مفہوم وہی رنج و تکلیف اور دُکھ درد ہی ہے۔

ہاں! انسان آغازِ زندگی سے ہی، یہاں تک کہ اسی لمحہ سے جب اس کا نطفہ قرارگاہ رحم میں واقع ہوتا ہے، مشکلات اور درد و رنج کے بہت سے مرحلے طے کرتا ہوا متولد ہوتا ہے اور پیدا ہونے کے بعد بچپنے میں، اور اس کے بعد جوانی میں، اور سب سے زیادہ بڑھاپے میں، طرح طرح کی زحمتوں، مشقتوں اور تکلیفات سے رُوبرو ہوتا ہے۔ دُنیا کی زندگی کا مزاج یہی ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور توقع رکھنا غلطی ہی غلطی ہے۔ ایک شاعرِ عرب کے قول کے مطابق:

طبعت علی کدر و انت تریدها
صفوًا عن الاکدار والاقذار ؟
و مکلف الایام ضد طباعها
متطلب فی الماء جذوة نار ؟

جہاں کی طبیعت کدورت اور گندے پن پر ہے اور تو چاہتا ہے کہ
ہر قسم کی کدُورت اور ناپاکی سے صاف ہو،
تو جو شخص دُنیا کے دَور کو اُس کے مزاج کے برخلاف طلب کرے گا،
وُہ اس شخص کی مانند ہے جو پانی کی موجوں کے درمیان آگ کا شعلہ طلب کرے۔

انبیاء اور اولیاء اللہ کی زندگیوں کی طرف نگاہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے آفرینش کے ان سرسبد پھُولوں کی زندگی بھی انواع و اقسام کے غیر مناسب امور اور درد و تکلیف میں گھری ہوئی تھی۔ جب دُنیا ان کے لیے اس طرح ہے تو دُوسروں کے لیے اس کی وضع و کیفیت واضح ہے۔

---

[1] بعض تفاسیر میں والد سے مُراد امیرالمومنینؑ اور اولاد سے مراد ان کے فرزندانِ گرامی ہیں، اور شاید وہ جناب اس کے بہترین مصداق ہوں لہٰذا اس تفسیر کو ذکر کرنا زیادہ مناسب تھا (مترجم)

اور اگر ہمیں کچھ افراد یا معاشرے ایسے نظر آتے ہیں جنہیں بظاہر کوئی دُکھ اور تکلیف نہیں ہوتی تو وہ یا تو ہمارے سطحی مطالعہ کی وجہ سے ایسا دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے جب ہم اور زیادہ نزدیک ہوتے ہیں تو انہیں مرفہ الحال زندگی والوں کے درد و رنج کے عمق اور گہرائی سے آشنا ہو جاتے ہیں، اور یا پھر وہ ایک محدود مدت اور استثنائی زمانہ کے لیے ہوتا ہے، جو عالم کے قانونِ کلی کو نہیں توڑتا۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "کیا یہ انسان یہ گمان کرتا ہے کہ کوئی بھی اس پر دست رسی کی قُدرت نہیں رکھتا" (ایحسب ان لن یقدر علیہ احد)[1]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کی زندگی کی ان تمام درد، دُکھ اور تکالیف کے ساتھ آمیزش اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بالکل کوئی قدرت نہیں رکھتا۔

لیکن غرور و تکبّر کے گھوڑے پر سوار ہے اور ہر قسم کے غلط کام گناہ جُرم اور حد سے بڑھ جانے کا مرتکب ہوتا رہتا ہے، گویا وہ خود کو امن و امان میں سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو سزاؤں کی قلم رَو سے دُور خیال کرتا ہے۔ جب اُسے قدرت حاصل ہو جاتی ہے تو تمام خُدائی احکام کو پاؤں کے نیچے روند ڈالتا ہے، جیسے مطلقاً خدا کا بندہ نہیں ہے۔ کیا واقعاً وہ یہی خیال کرتا ہے کہ پروردگار کے عذاب کے چنگل سے رہائی حاصل کرلے گا؟ کتنا بڑا اشتباہ اور غلط فہمی ہے!

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مُراد وہ دولت مند ہیں جو یہ خیال کرتے تھے کہ کوئی ان کی دولت و ثروت کو ان سے چھین لینے کی قدرت نہیں رکھتا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مُراد وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ یہ تھا کہ ان کے اعمال کی کوئی بھی باز پُرس نہیں کرے گا۔

لیکن آیت ایک جامع مفہوم رکھتی ہے جو ان تمام تفاسیر کو شامل ہو سکتی ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اُوپر والی آیت قبیلہ "جمح" کے ایک شخص کی طرف جس کا نام "ابوالاسد" تھا اشارہ ہے وہ اس قدر طاقت وَر تھا کہ چمڑے کے ایک ٹکڑے پر بیٹھ جاتا تھا اور دس آدمی اُسے اس کے نیچے سے کھینچنا چاہتے تھے تو نہیں کھینچ سکتے تھے وہ چمڑا ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا تھا، لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا تھا[2]

لیکن آیت کا اس قسم کے مغرور شخص یا اشخاص کے بارے میں بیان اس مفہوم کی عمومیت و وسعت سے مانع نہیں ہے۔

اس کے بعد اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے بہت زیادہ مال تباہ کر دیا ہے" (یقول اھلکت مالاً لبدًا)۔

یہ ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہے کہ جب انہیں کارِ خیر میں مال صرف کرنے کو کہتے تھے تو وہ غرور و نخوت کی بنا پر یہ کہتے تھے: ہم نے بہت زیادہ مال ان کاموں میں صَرف کیا ہے، حالانکہ انہوں نے خدا کی راہ میں کوئی چیز خرچ نہیں کی تھی۔ اور اگر انہوں نے کسی کو کچھ مال دیا بھی تھا تو وہ دکھا دے، ریا کاری اور شخصی اغراض کی بنا پر تھا۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] "ان" اس جملہ میں "مشقہ" سے مخففہ ہے "اور تقدیر میں" "انہ لن یقدر علیہ احد" ہے۔

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۳

کی دُشمنی اور اسلام کے برخلاف سازشوں میں صَرف کیا تھا اور وُہ اس پر فخر کرتے تھے، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جنگِ خندق کے دن جب علی علیہ السّلام نے عمر بن عبدود کے سامنے اسلام کو پیش کیا تو اس نے جواب میں کہا :

" فاین ما انفقت فیکم مالا لبدًا "

" پس وُہ سارا مال جو مَیں نے تمہاری مخالفت میں صَرف کیا ہے اس کا کیا بنے گا؟ "[1]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت " حارث بن عامر جیسے بعض سردارانِ قریش کے بارے میں ہے، جو ایک گناہ کا مرتکب ہُوا تھا۔ اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نجات کے بارے میں پُوچھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے کفارہ دینے کا حُکم دیا۔ اُس نے کہا : جب سے مَیں دینِ اسلام میں داخل ہوا ہوں میرا تمام مال و دولت کفاروں اور نفقات میں نابود ہوگیا ہے"[2]

ان تینوں تفاسیر کے درمیان جمع میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے اگرچہ پہلی تفسیر آیت کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

" اھلکت " کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے اموال درحقیقت نابود ہی ہوئے ہیں، اور اُسے ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

" لبد " (بروزن لغت) تہ بہ تہ اور انبوہ کثیر کے معنی میں ہے اور یہاں بہت زیادہ مال کے معنی میں ہے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے : " کیا وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اُسے کسی نے نہیں دیکھا، اور نہ ہی دیکھے گا "؟! (ایحسب ان لم یرہ احد)۔

وہ اس حقیقت سے غافل ہے کہ نہ صرف اس کے ظاہری اعمال کو خلوت و جلوت میں دیکھتا ہے، بلکہ اس کے دل اور رُوح کی گہرائیوں سے بھی آگاہ ہے، اور اس کی نیتوں سے باخبر ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ خدا جس کا غیر متناہی وجود ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے کسی چیز کو نہ دیکھے اور نہ جانے؟ یہ غافل اس بات سے بے خبر ہیں کہ وہ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے خُود کو پروردگار کی دائمی نگرانی سے باہر خیال کر رہے ہیں۔

ہاں! خدا کو علم ہے کہ انہوں نے یہ اموال کہاں سے حاصل کیے ہیں اور انہیں کس راہ میں صَرف کیا ہے؟!

ایک حدیث میں ابن عباسؓ سے نقل ہوا ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

" لا تزول قدما العبد حتی یسأل عن اربعۃ : عن عمرہ فیما افناہ وعن مالہ من این جمعہ، وفیما ذا انفقہ ؛ وعن عملہ ماذا عمل بہ ؛ وعن حبنا اھل البیتؑ "

" قیامت میں کوئی شخص اپنے قدم سے قدم نہیں اُٹھائے گا، مگر یہ کہ چار چیزوں کے بارے میں اس سے سوال ہوگا : اس کی عمر کے بارے میں کہ اُسے کس راہ میں فنا کیا، اس کے مال کے بارے میں کہ اسے کہاں سے جمع کیا، اور کس راہ میں اُسے صَرف کیا، اور اس کے عمل کے بارے

---

[1] " نورالثقلین جلد ۵ ص ۵۸۰ حدیث ۱۰

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۹۳

ہیں کہ اس نے کون کون سا عمل انجام دیا، اور ہم اہل بیتؑ کی محبت و مودت کے بارے ہیں۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کس طرح سے مغرور ہو جاتا ہے اور قدرت و طاقت کا دعویٰ کیسے کرتا ہے، حالانکہ اس کی زندگی درد و رنج اور تکلیفات کے ساتھ خمیر ہوئی ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ مال ہے تو ایک رات کے لیے ہے، اور اگر جان رکھتا ہے تو ایک بخار تک ہے۔ اور پھر وہ یہ دعویٰ کیسے کرتا ہے کہ میں نے بہت زیادہ مال خدا کی راہ میں خرچ کیا ہے جب کہ وہ اس کی نیت سے آگاہ ہے، اور ان اموال کے غیر شرعی حصول کی کیفیت سے بھی آگاہ ہے، اور ریا کاری اور مغرضانہ طور پر صرف کرنے کی کیفیت سے بھی باخبر ہے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۴۔ اسی معنی کے مانند تفسیر "روح البیان" جلد ۱ ص ۴۳۵ میں بھی آیا ہے۔

۸۔ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ

۹۔ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ۙ

۱۰۔ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ

ترجمہ

۸۔ کیا ہم نے اس (انسان) کے لیے دو آنکھیں قرار نہیں دیں ؟

۹۔ اور ایک زبان اور دو ہونٹ (اُسے نہیں دیے) ؟

۱۰۔ اور ہم نے اُسے اس کی بھلائی اور بُرائی کی دونوں راہیں دکھا دیں ۔

تفسیر

آنکھ، زبان اور ہدایت کی نعمت

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں سرکشی کرنے والے انسانوں کے غرور و غفلت کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی، زیرِ بحث آیات میں انسان پر خدا کی اہم ترین مادّی و معنوی نعمتوں کا کچھ حصّہ بیان کرتا ہے تاکہ ایک طرف تو اس کے غرور و غفلت کو توڑے اور دُوسری طرف اُسے ان نعمتوں کو خلق کرنے والے میں تفکّر اور غور و خوض کرنے پر آمادہ کرے اور اس کے دل و جان کے اندر شکر گزاری کے احساس کو بیدار کر کے اُسے خالق کی معرفت کی طرف چلائے ۔

پہلے فرماتا ہے : "کیا ہم نے اس انسان کے لیے دو آنکھیں قرار نہیں دیں" ۔ (الم نجعل له عينين) ۔

"اور ایک زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیے)"؟! (ولسانا و شفتين) ۔

اور ہم نے اُسے اس کی بھلائی اور بُرائی کی دونوں راہیں دکھا دیں" ۔ (وهديناه النجدين) ۔

اس طرح ان چند مختصر جملوں میں تین اہم مادّی نعمتوں اور ایک عظیم معنوی نعمت کی طرف، جو سب کی سب خدا کی عظیم ترین نعمتیں ہیں، اشارہ کیا ہے ۔ ایک طرف تو آنکھوں، زبان اور لبوں کی نعمت ہے اور دُوسری طرف خیر و شر کی معرفت و ہدایت کی نعمت ہے ۔

(اس بات کی طرف توجہ رہے کہ "نجد" اصل میں مرتفع اور بلند مقام کے معنی میں ہے، "تہامہ" کے مقابلہ میں جو پست

زمینوں پر بولا جاتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں "بلند جگہ" اور "پست جگہ" اور یہاں خیر و شر اور سعادت و شقاوت کی راہ سے کنایہ ہے۔[1]

اُوپر والی نعمتوں کی اہمیت کے بارے میں بس اتنا کافی ہے کہ :

"آنکھ" بیرونی دُنیا سے انسان کے رابطہ کے لیے ایک اہم ترین ذریعہ ہے آنکھ کے عجائبات اس قدر ہیں کہ وہ واقعی طور پر انسان کو خالق کے مقابلہ میں خضوع کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں آنکھ کے سات طبقے جو صلبیہ (قرنیہ) مشیمیہ، عنبیہ، جلدیہ، زلالیہ، زجاجیہ اور شبکیہ کے نام سے موسوم ہیں، ان میں سے ہر ایک عجیب و غریب اور عمدہ ساخت رکھتا ہے جن میں نور و روشنی اور آئینوں سے مربوط طبیعاتی اور جسمانی قوانین کا بہت ہی باریک بینی کے ساتھ خیال رکھا گیا ہے۔ اس طرح سے کہ تصویر کشی کی ترقی یافتہ ترین دوربینیں بھی اس کے مقابلہ میں بے قدر و قیمت ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ساری دُنیا میں انسان کے سوا، اور سارے وجودِ انسانی میں آنکھ کے علاوہ اور کوئی چیز نہ ہوتی، تو اس کی عجائبات کا مطالعہ پروردگار کے عظیم علم و قدرت کی شناخت کے لیے کافی تھا۔

باقی رہی "زبان" تو وہ انسان کے لیے دوسرے انسانوں سے ارتباط، اور ایک قوم سے دوسری قوم، اور ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف اطلاعات و معلومات کے نقل ہونے، اور مبادلہ کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے۔ اور اگر یہ ارتباط کا ذریعہ نہ ہوتا تو انسان ہرگز بھی علم و دانش اور مادی تمدن اور معنوی مسائل میں اس حد تک ترقی نہ کر سکتا۔

باقی رہے "لب" تو "اولاً" بول چال میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے کیونکہ بہت سے حروف لبوں ہی کے ذریعے ادا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہونٹ کھانے چبانے، اور منہ کی رطوبت کو محفوظ رکھنے اور پانی کے پینے میں بہت زیادہ مدد کرتے ہیں، اور اگر یہ نہ ہوتے تو انسان کے کھانے پینے کا مسئلہ، یہاں تک کہ اس کے چہرہ کا منظر، اس کے لعاب دہن کے باہر کی طرف بہنے کی وجہ سے، اور بہت سے حروف کی ادائیگی پر قدرت نہ رکھنے کی بنا پر افسوس ناک ہوتا۔

اور چونکہ حقائق کا ادراک پہلے درجہ میں آنکھ اور زبان سے ہوتا ہے۔ ان کے بعد "عقل" اور فطری ہدایت آتی ہے، یہاں تک کہ آیت کی تعبیر "ہدایتِ تشریعی" کو بھی جو انبیاء و اولیاء کے ذریعے ہوتی ہے شامل ہے۔

ہاں! اس نے دیکھنے والی آنکھ اور زبان کو بھی انسان کے اختیار میں رکھا ہے، اور "راہ اور چاہ" کی بھی اسے نشان دہی کرادی ہے "تا آدمی نگاہ کند پیش پائے خویش" تاکہ انسان اپنے سامنے کی ہر چیز کو دیکھ لے۔

لیکن ان روشن چراغوں کے باوجود، جو اس کے راستے میں موجود ہیں، اگر پھر بھی کوئی راستہ سے ہٹ جاتا ہے تو پھر کہنا چاہیئے: "بگذار تا بیفتد و بیند سزای خویش"! اُسے گرنے دو تاکہ وہ اپنی سزا پالے۔

"وھدیناہ النجدین"۔ (ہم نے اُسے بھلائی اور بُرائی کے دونوں راستے دکھا دیے) کا جملہ علاوہ اس کے کہ وہ انسان کے ارادہ کی آزادی اور اختیار کے مسئلہ کو بیان کرتا ہے، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "نجد" اُونچی جگہ کو کہتے ہیں لہٰذا یہ اس بات

---

[1] یہ تفسیر ایک حدیث میں امیر المومنین علیؑ سے نقل ہوئی ہے (مجمع البیان زیر بحث آیات کے ذیل میں) اور یہ جو بعض نے ماں کے دو پستانوں سے جو سینہ پر اُبھرے ہوئے ہوتے ہیں تفسیر کی ہے بہت ہی بعید ہے۔ ضمنی طور پر "نجد" کی تعبیر خیر کے بارے میں اس کی عظمت کی وجہ سے ہے اور شر کے بارے میں باب تغلیب سے ہے۔

کی طرف اشارہ ہے کہ خیر اور بھلائی کی راہ کو طے کرنا مشکلات، زحمت اور رنج سے خالی نہیں ہے، جیسا کہ اُونچی زمینوں کی طرف جانا مشکل ہے یہاں تک کہ شر اور بُرائی کی راہوں کو طے کرنا بھی مشکلات رکھتا ہے لہٰذا کیسی اچھی بات ہے کہ انسان سعی و کوشش سے خیر کی راہ کو اختیار کرے۔

لیکن اس کے باوجود راستہ کا انتخاب کرنا خود انسان کے اختیار میں ہے۔ یہ وہی ہے جو اپنی آنکھ اور زبان کو حلال یا حرام کے راستہ میں گردش دے سکتا ہے اور خیر و شر کی دونوں راہوں میں سے جسے چاہے انتخاب کر سکتا ہے۔

لہٰذا ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مروی ہے خداوند تعالیٰ آدم علیہ السلام کی اولاد سے کہتا ہے:

"یا بن آدم! ان نازعك لسانك فیما حرمت علیك فقد اعنتك علیه بطبقتین فاطبق، وان نازعك بصرك الی بعض ما حرمت علیك فقد اعنتك علیه بطبقتین فاطبق....."

"اے اولادِ آدمؑ! اگر تیری زبان تجھے کسی فعلِ حرام پر اُبھارنا چاہے، تو مَیں نے اُسے روکنے کے لیے دو ہونٹ تیرے اختیار میں دیے ہیں۔ پس تو ہونٹوں کو بند کر لے اور اگر تیری آنکھ تجھے حرام کی طرف لے جانا چاہے تو مَیں نے پلکیں تیرے اختیار میں دے دی ہیں تو انہیں بند کر لے....."[1]

اس طرح سے خدا نے ان عظیم نعمتوں پر کنٹرول کے وسائل و ذرائع بھی انسان کے اختیار میں دیے ہیں اور یہ ایک اور اس کا عظیم لُطف ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اُوپر والی آیات میں زبان کے بارے میں تو لبوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، لیکن آنکھوں کے بارے میں پلکوں کی طرف اشارہ نہیں ہُوا۔ اس کے ظاہراً دو اسباب ہیں، ایک تو یہ ہے کہ لبوں کا کام بات کرنے، کھانا کھانے اور تمام پہلوؤں میں پلکوں کی نسبت آنکھوں کے لیے کام کرنے سے کئی گنا زیادہ ہے، اور دوسرا سبب یہ ہے کہ زبان کا کنٹرول کرنا آنکھ کے کنٹرول سے کئی درجے زیادہ اہم ہے، اور زیادہ بخت ساز ہے۔

چند نکات

۱۔ آنکھ کی حیرت انگیزیاں

آنکھ کو عام طور پر کیمرے کی دُوربین سے تشبیہ دیتے ہیں، جو اپنی بہت ہی چھوٹی سی پُتلی کے ساتھ مختلف مناظر کے فوٹو اتارتی ہے، ایسی تصویریں جو فلم کی بجائے "شبکیہ چشم" (آنکھ کی سکرین) پر منعکس ہوتی ہیں اور وہاں سے بینائی کے اعصاب کے ذریعے دماغ میں منتقل ہوتی ہیں۔

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۵۸۱۔

تصویر کشی کا یہ حد سے زیادہ لطیف و دقیق کارخانہ، شب و روز میں کئی ہزار تصویریں، مختلف مناظر کی اُتار سکتا ہے، لیکن تصویر کشی اور فلمیں بنانے کی ترقی یافتہ ترین مشینوں پر بھی اس کا بہت سے پہلوؤں سے قیاس نہیں ہو سکتا، کیونکہ :

۱۔ اس مشین میں روشنی کو منظم کرنے والا دریچہ وہی آنکھ کی پُتلی ہے جو خود کار طریقہ سے زیادہ قوی روشنی کے مقابلہ میں زیادہ تنگ اور کمزور روشنی کے مقابلہ میں زیادہ کشادہ ہو جاتی ہے حالانکہ کیمرے کی مشین کو اشخاص کے ذریعے منظم کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ آنکھ کا عدسہ، ان تمام شیشوں کے برخلاف، جو دُنیا کے تصویر کشی کے کیمروں میں استعمال ہوتے ہیں، ہمیشہ اپنی شکل بدلتا رہتا ہے، اس طور پر کہ کبھی تو اس کا قطر ۶ ملی میٹر ہو جاتا ہے اور کبھی ۸ ملی میٹر تک پہنچ جاتا ہے تاکہ وہ دور اور نزدیک کے مناظر کی تصویریں بنا سکے۔ اور یہ کام عضلات کے ذریعے، جنہوں نے عدسہ کو گھیرا ہوا ہے، اور وہ کبھی اُسے کھینچ لیتے ہیں اور کبھی چھوڑ دیتے ہیں، انجام پاتا ہے۔ اس طرح سے آنکھ کا ایک عدسہ تنہا سینکڑوں عدسوں کا کام انجام دیتا ہے۔

۳۔ تصویر کشی کی یہ مشین چار مختلف سمتوں کی طرف حرکت کرتی ہے، یعنی آنکھ کے عضلات کی مدد سے جس طرف چاہے حرکت کر سکتی ہے اور تصویر بنا سکتی ہے۔

۴۔ یہاں ایک اور اہم نکتہ بھی ہے کہ تصویر کشی کے کیمروں کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی فلموں کو تبدیل کرتے رہیں، اور جب فلم کی ایک ریل ختم ہو جائے تو اس کی جگہ دُوسری ریل رکھنی پڑتی ہے۔ لیکن انسان کی آنکھیں زندگی بھر تصویریں اُتارتی رہتی ہیں، اور اس میں کوئی چیز تبدیل نہیں کرنی پڑتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ کی سکرین کا وہ حصہ، جس پر تصویریں منعکس ہوتی ہیں، اس میں دو قسم کے سلول ہوتے ہیں :

۱۔ مخروطی سلول، ۲۔ عمودی سلول، جو روشنی کے مقابلہ میں بہت ہی زیادہ حساس مادہ رکھتے ہیں اور روشنی کی تھوڑی سی چمک سے ہی ان کا تجزیہ ہو جاتا ہے اور وہ ایسی لہریں پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ دماغ کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور سکرین دوبارہ نئی تصویر کھینچنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

۵۔ تصویریں کھینچنے والی دُور بینیں بہت ہی محکم اور مضبوط مادّوں سے بنائی گئی ہیں، لیکن آنکھ کی تصویر کھینچنے کی مشین اتنی لطیف ہے کہ جس میں معمولی سی چیز سے بھی خراش آجاتی ہے، اسی وجہ سے اس کو ایک مضبوط ہڈیوں سے بنی ہوئی حفاظت گاہ میں رکھا گیا ہے لیکن اتنی ظرافت و نزاکت کے باوجود یہ لوہے اور فولاد سے بھی زیادہ چلنے والی چیز ہے۔

۶۔ فلمیں بنانے والوں اور تصویریں کھینچنے والوں کے لیے "روشنی کے منظم ہونے" کا مسئلہ ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے، اور اس مسئلہ کے لیے کہ تصویریں صاف ہوں، بعض اوقات کئی کئی گھنٹے روشنی اور اس کے مقدمات کو منظم کرنے میں مشغول رہنا پڑتا ہے، جب کہ آنکھ تمام حالات میں، چاہے روشنی قوی ہو یا درمیانی یا کمزور، یہاں تک کہ تاریکی میں بھی، بشرطیکہ معمولی اور خفیف سی روشنی بھی وہاں پر موجود ہو تصویر لے لیتی ہے۔ اور یہ چیز آنکھ کے عجائبات میں سے ہے۔

۷۔ بعض اوقات ہم روشنی سے تاریکی کی طرف جاتے ہیں، یا بجلی کے بلب اچانک بُجھ جاتے ہیں، تو ہم اس وقت کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتے، لیکن چند ہی لمحے گزر جانے کے بعد ہماری آنکھ خود کار طور پر اپنی کیفیت کو اس کمزور روشنی کے ساتھ منطبق کر لیتی ہے، اس طرح سے کہ جب ہم اپنے اردگرد نظر کرتے ہیں کہ ہماری آنکھ تاریکی کی عادی ہو گئی ہے اور یہ عادت والی تعبیر جو سادہ اور عام زبان

میں ادا ہو جاتی ہے۔ ایک بہت ہی پیچیدہ مکانیم (طرز ساخت) کا نتیجہ ہے جو آنکھ میں رکھی گئی ہے، اور وہ خود کو بہت ہی مختصر سے وقت میں نئے حالات پر منطبق کر سکتی ہے۔

اس کے برخلاف جب ہم تاریکی سے روشنی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یعنی ابتداء میں ہماری آنکھ قوی روشنی کو برداشت نہیں کرتی، لیکن چند لمحات کے بعد وہ اس سے منطبق ہو جاتی ہے اور اصطلاح کے مطابق عادی ہو جاتی ہے لیکن یہ امور تصویر بنانے والے کیمروں میں ہرگز موجود نہیں ہیں۔

۸۔ تصویر بنانے والے کیمرے محدود فضا سے تصویر بنا سکتے ہیں جب کہ انسان کی آنکھ تمام اُفق کا نیم دائرہ جو اس کے سامنے ہوتا ہے دیکھ لیتی ہے، اور دوسرے لفظوں میں ہم اپنے اطراف کے تقریباً ۱۸۰ درجے کے دائرے کو دیکھ لیتے ہیں، جب کہ تصویر کشی کا کوئی کیمرہ ایسا نہیں ہے۔

۹۔ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ انسان کی دونوں آنکھیں، جن میں سے ہر ایک ایک مستقل مشین ہے، اس طرح منظم ہوئی ہیں کہ ان دونوں سے لیے گئے فوٹو ایک ہی نقطہ پر جا کر پڑتے ہیں۔ اس طرح سے اگر یہ تنظیم تھوڑی سی بھی خراب ہو جائے تو انسان اپنی دو آنکھوں سے ایک ہی جسم کو دو جسم دیکھتا ہے، جیسا کہ احول (جسے دو دو نظر آتے ہوں) اشخاص میں یہ معنی مشاہدہ ہوتا ہے۔

۱۰۔ دوسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ وہ تمام مناظر جن کی آنکھ تصویر کشی کرتی ہے آنکھ کی سکرین پر اُلٹے پڑتے ہیں، حالانکہ ہم کسی چیز کو اُلٹا نہیں دیکھتے، آنکھ کے عاد اور چیزوں کی ایک دوسرے سے نسبت کو محفوظ رکھنے کی بناء پر ہے۔

۱۱۔ آنکھ کی سطح ہمیشہ مرطوب ہونی چاہیے، کیونکہ اگر وہ چند ساعت بھی خشک رہ جائے تو اس پر شدید ضرب پڑے: یہ رطوبت ہمیشہ آنسوؤں کے غدودوں سے حاصل ہوتی ہے جو آنکھ میں ایک طرف سے وارد ہوتے ہیں اور بہت ہی باریک اور ظریف رگوں سے، جو آنکھوں کے کناروں پر ہوتی ہیں، باہر نکلتے ہیں، اور ناک کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور اُسے بھی مرطوب رکھتے ہیں۔

اگر آنکھ کے غدود خشک ہو جائیں تو آنکھ خطرے میں پڑ جاتی ہے اور پلکوں کی حرکت غیر ممکن ہو جاتی ہے، اور اگر اس کا فعل حد سے زیادہ بڑھ جائے تو ہمیشہ چہرے پر آنسو بہتے رہیں، یا اگر آنکھ کے فاضل پانی کو خشک کرتے رہیں اور یہ کتنا بڑا درد سر ہے۔

۱۲۔ آنسوؤں کی ترکیب ایک پیچیدہ ترکیب ہے، اور اس میں دس سے زیادہ عناصر ہوتے ہیں، اور وہ مجموعاً آنکھ کی نگہداشت کے لیے ایک بہترین اور مناسب ترین مائع یا مرکب ہوتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ آنکھ کے عجائبات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے بارے میں کئی دن تک بیٹھ کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے، اور ان کے لیے کئی کتابیں لکھنی پڑیں، اور ان تمام چیزوں کے باوجود اگر ہم اس کے اصلی مادہ کو دیکھیں تو وہ تقریباً چربی کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام اپنی ایک قابل قدر گفتگو میں فرماتے ہیں:

"اعجبوا لهذا الانسان ينظر بشحم، ويتكلم بلحم، ويسمع بعظم، ويتنفس من خرم!"

"تعجب ہے اس انسان پر جو چربی کے ایک ٹکڑے سے دیکھتا ہے، اور گوشت کے ایک ٹکڑے

سے بولتا ہے ہڈی سے سُنتا ہے سُوراخ سے سانس لیتا ہے اور وہ ان بزرگ حیاتی کاموں کو ان چھوٹے سے وسائل کے ذریعے انجام دیتا ہے۔[1]

۲۔ زبان کی حیرت انگیزیاں

زبان بھی اپنی جگہ پر انسانی بدن کے بہت ہی حیرت انگیز اعضاء میں سے ہے اور اس کے ذمے بہت ہی سخت ذمہ داریاں ہیں: وہ غذا کو نگلنے میں مدد دینے کے علاوہ اس کو چبانے میں بھی اہم کام انجام دیتی ہے، اور بار بار غذا کے لقمہ کو دانتوں کی ہتھوڑی کے نیچے دھکیلتی رہتی ہے، لیکن اس کام کو اتنے ماہرانہ انداز میں انجام دیتی ہے کہ اپنے آپ کو دانتوں کی ضربوں سے محفوظ رکھتی ہے، حالانکہ ہمیشہ ان کے پاس اور ان سے چمٹی ہوئی رہتی ہے۔

بعض اوقات اتفاقیہ طور پر کھانے کو چباتے وقت ہم اپنی زبان کو بھی چبا لیتے ہیں تو ہماری چیخ نکل جاتی ہے اور ہم یہ بات سمجھ جاتے ہیں کہ اگر زبان میں وہ مہارت نہ ہوتی تو ہم پر کتنی مصیبت آن پڑتی۔

ضمنی طور پر غذا کھانے کے بعد منہ کی فضا اور دانتوں کو پاک و صاف کرتی اور جھاڑ دیتی ہے۔

اور ان سب کاموں سے زیادہ اہم بات کرنے کا مسئلہ ہے، جو زبان کی تیزی کے ساتھ منظم طور پر پے در پے حرکات اور چھ سمتوں میں حرکت کرنے سے انجام پاتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ خدا نے بات کرنے اور تکلم کے لیے ایک ایسا وسیلہ انسانوں کے اختیار میں دیا ہے جو بہت ہی سہل اور آسان، اور سب کی دسترس میں ہے، نہ کچھ تھکان ہوتی ہے اور نہ ہی رنج و ملال حاصل ہوتا ہے، اور نہ ہی کچھ خرچ ہوتا ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات انسان میں گفتگو کرنے کی استعداد کا مسئلہ ہے، جو انسان کی روح میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اور انسان اپنے طرح طرح کے حد سے زیادہ مقاصد کو بیان کرنے کے لیے بے حد مختلف صورتوں میں زیادہ سے زیادہ جملہ بندیاں کر سکتا ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ اہم، مختلف زبانوں کی وضع کی استعداد ہے، اور ان ہزاروں زبانوں کے مطالعہ سے جو دنیا میں موجود ہیں اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے، واقعاً "العظمة لله الواحد القهار!" (عظمت و بزرگی واحد و قہار خدا کے لیے ہی ہے)

۳۔ نجدین کی طرف ہدایت

"نجد" جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، بلندی یا بلند سرزمین کے معنی میں ہے اور یہاں "خیر" و "شر" کی راہ مراد ہے۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"یا ایها الناس! انما نجدان: نجد الخیر و نجد الشر فما جعل نجد الشر اجب الیکم من نجد الخیر"

"اے لوگو! دو بلند سرزمینیں موجود ہیں، خیر کی سرزمین اور شر کی سرزمین، اور شر کی سرزمین

---

[1] نہج البلاغہ۔ "کلمات قصار" حکمت ۸

تمہارے لیے خیر کی سرزمین سے ہرگز زیادہ محبوب قرار نہیں دی گئی۔[1]

اس میں شک نہیں کہ "تکلیف" اور مسئولیت، معرفت و آگاہی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور اُوپر والی آیت کے مطابق خدا نے یہ آگاہی انسانوں کے اختیار میں دے دی ہے۔

یہ آگاہی تین طریقوں سے انجام پاتی ہے:

۱۔ عقلی ادراکات اور استدلال کے طریق سے،

۲۔ فطرت و وجدان کے طریق سے، جس میں استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۳۔ وحی اور انبیاء و اوصیاء کی تعلیمات کے طریق سے۔ اور تکامل کی راہ کو طے کرنے کے لیے انسان کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان کی خدا نے ان تین طریقوں میں سے کسی ایک سے یا بہت سے موارد میں ان تینوں ہی طریقوں سے اسے تعلیم دی ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی تصریح ہوئی ہے کہ ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک کا طے کرنا انسان کی طبیعت اور مزاج کے لیے دوسرے سے زیادہ آسان نہیں ہے۔ اور یہ بات حقیقت میں اس عمومی تصور کی کہ انسان بُرائیوں کی طرف زیادہ میلان رکھتا ہے اور شر کے راستے کو طے کرنا اس کے لیے زیادہ آسان ہے، نفی کرتی ہے۔

اور سچی بات یہ ہے کہ اگر غلط تربیتیں اور فاسد ماحول نہ ہو تو انسان کو نیکیوں کے ساتھ لگاؤ اور محبت زیادہ ہوتی ہے۔ اور شاید "نجد" (بلند سرزمین) کی تعبیر نیکیوں کے بارے میں اسی بنا پر ہے، کیونکہ بلند زمینیں بہتر اور زیادہ عمدہ فضا رکھتی ہیں، اور شرور کے بارے میں تغلیب کی بنا پر ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ تعبیر خیر و شر کے راستہ کے ظاہر، نمایاں اور آشکار ہونے کی طرف اشارہ ہے، جس طرح سے مرتفع اور بلند سرزمین مکمل اور پُورے طور پر نمایاں ہوتی ہے۔[2]

❖ ❖ ❖

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۴ و تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۷۱۵۵۔

[2] جیسا کہ چاند اور سورج کو "قمرین" (دو چاند) کہا جاتا ہے۔

۱۱۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝

۱۲۔ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝

۱۳۔ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝

۱۴۔ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝

۱۵۔ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝

۱۶۔ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝

۱۷۔ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝

۱۸۔ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۝

۱۹۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ۝

۲۰۔ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُؤْصَدَةٌ ۝

ترجمہ

۱۱۔ لیکن وُہ (ناشکرا انسان) اس اہم گھاٹی سے اُوپر نہیں گیا۔

۱۲۔ اور تجھے کیا معلوم کہ وُہ گھاٹی کیا ہے ؟

۱۳۔ غلام کو آزاد کرنا ہے ۔

۱۴۔ یا بھُوک کے دن کھانا کھلانا ہے ۔

۱۵۔ رشتہ داروں میں سے کسی یتیم کو ۔

۱۶۔ یا خاک پر پڑے ہُوئے مسکین کو۔

۱۷۔ پھر اسے ایسے لوگوں میں سے ہونا چاہیئے جو ایمان لائے ہیں اور جو ایک دُوسرے کو صبر و شکیبائی اور رحم کرنے کی وصیّت کرتے ہیں ۔

۱۸۔ وہ اصحابُ المیمنہ ہیں (اور ان کے نامۂ اعمال کو ان کے دائیں ہاتھ میں دیں گے)۔

۱۹۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کردیا ، وُہ شوم اور بدبخت لوگ ہیں اور ان کا نامۂ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

۲۰۔ ان کو آگ نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے ، (جس سے بھاگنے کی کوئی راہ نہیں ہے)

تفسیر

دُشوار گزار گھاٹی

اِن عظیم نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد ، جو گزشتہ آیات میں آئی تھیں ، زیرِ نظر آیات میں ناشکر گزار بندوں کو موردِ ملامت و سرزنش قرار دیتا ہے ، کہ ان تمام وسائل سعادت کے ہوتے ہوئے انہوں نے نجات کی راہ کیوں طے نہیں کی ، پہلے فرماتا ہے :۔

" یہ ناشکرا انسان اس عظیم گھاٹی سے اُوپر نہیں گیا " (فلا اقتحم العقبۃ)[1]

اس بارے میں کہ یہاں عقبہ سے کیا مُراد ہے ، بعد والی آیات اس کی تفسیر کرتی ہیں ۔

---

[1] ظاہر یہ ہے کہ اس جملہ میں "لا" نافیہ " اور "خبریہ" ہے اور یہ جو بعض نے اسے نفرین یا استفہام کے معنی میں سمجھا ہے بہت بعید نظر آتا ہے۔ وہ واحد اعتراض جو یہاں موجود ہے یہ ہے کہ جب فعل ماضی پر "لا" آتا ہے تو عام طور پر اس کا تکرار ہوتا ہے ، جیسا کہ سُورۂ قیامت کی آیہ ۳۱ میں آیا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

فرماتا ہے: "تو نہیں جانتا وہ گھاٹی کیا ہے"؟: (وما ادریك ما العقبة)۔
"غلام کو آزاد کرنا ہے": (فك رقبة)۔
"یا بھوک کے دن کھانا کھلانا ہے": (او اطعام فی یوم ذی مسغبة)۔
"قریبیوں میں سے کسی یتیم کو" (یتیمًا ذا مقربة)۔
"یا خاک پر پڑے ہوئے مسکین کو" (او مسکینًا ذا متربة)۔

اس طرح یہ دُشوار گزار گھاٹی جس سے گزرنے کے لیے ناشکرے انسانوں نے ہرگز خود کو تیار نہیں کیا ہے، اعمالِ خیر کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو ارادی طور پر خدمتِ خلق اور کمزوروں اور ضعیفوں کی مدد کرنے کے گرد گھومتا ہے، اور ان صحیح اور خالص عقائد کا مجموعہ بھی ہے جن کی طرف بعد والی آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

اور سچ تو یہ ہے، کہ اس شدید لگاؤ کو دیکھتے ہوئے، جو عام طور سے لوگ مال و ثروت کے ساتھ رکھتے ہیں، اس دشوار گزار گھاٹی سے گزرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

اسلام اور ایمان صرف دعویٰ اور باتوں سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ ہر مومن مسلمان کے سامنے ایسی دُشوار گزار گھاٹیاں ہیں جن سے یکے بعد دیگرے، حول و قوّہ خدا اور رُوح ایمان و اخلاص سے مدد طلب کرتے ہوئے گزرنا پڑتا ہے۔

بعض نے یہاں "عقبہ" کی تفسیر ہوائے نفس کے معنی میں کی ہے، جس سے جہاد کرنے کو "پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشہور حدیث کے مطابق، "جہادِ اکبر" کا نام دیا ہے۔

البتہ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہاں آیات نے "عقبہ" کی تفسیر کی ہے تو اس تفسیر سے مراد اس طرح ہونا چاہیئے کہ اصلی گھاٹی ہوائے نفس کی گھاٹی ہے، لیکن غلاموں کو آزاد کرنا، اور مسکینوں کو کھانا کھلانا، اس سے مبارزہ کرنے کے واضح مصادیق میں سے ہیں۔

بعض دُوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس "عقبہ" سے مُراد قیامت میں ایک دُشوار گزار گھاٹی ہے، جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث میں آیا ہے:

"ان امامکم عقبة کؤدا لایجوزها المثقلون، وانا اریدان اخفف عنکم لتلك العقبة"۔

"تمہارے سامنے ایک دُشوار گزار گھاٹی ہے، جس سے بھاری بوجھ والے نہیں گزر سکیں گے اور میں چاہتا ہوں کہ اس گھاٹی سے عبور کرنے کے لیے تمہارے بوجھ کو ہلکا کر دوں"۔[1]

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) فلا صدق ولا صلّی۔ (نہ تو اس نے صدقہ دیا اور نہ ہی نماز پڑھی) جبکہ زیرِ بحث آیت میں "لا" کا تکرار نہیں ہوا، لیکن جیسا کہ مرحوم "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں نقل کیا ہے کہ بعض اوقات یہ تکرار کے بغیر بھی استعمال ہوتا ہے۔ "فخر رازی" اور "قرطبی" نے اپنی تفاسیر میں بعض عربی ادب کے بزرگوں سے نقل کیا ہے کہ اگر "لا" "لم" کے معنی میں ہو تو پھر تکرار کی ضرورت نہیں ہے، یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں تقدیر میں تکرار ہوا ہے: فلا اقتحم العقبة ولا فك رقبة ولا اطعم فی یوم ذی مسغبة"

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۹۵

البتہ یہ حدیث جو پیغمبرؐ سے نقل ہوئی ہے زیر بحث آیت کی تفسیر کے عنوان سے نہیں ہے، لیکن مفسرین نے اس سے یہی سمجھا ہے۔ لیکن ایسا سمجھنا اُس تفسیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو صراحت کے ساتھ آیات میں آئی ہے، مناسب دکھائی نہیں دیتا، مگر یہ کہ مراد یہ ہو کہ قیامت کی دشوار گزار گھاٹیاں اس جہان کی سخت اور سنگین اطاعتوں کا تجسم ہیں، اور ان سے عبور کرنا ان اطاعتوں سے عبور کرنے کی فرع ہے۔ (غور کیجئے)۔

یہاں پر "اقتحم" کی تعبیر جو "اقتحام" کے مادّہ سے ہے، قابلِ توجہ ہے، جو اصل میں سخت اور خوفناک کام میں داخل ہونے کے معنی میں ہے۔[1] مفرداتِ راغب) یا کسی چیز میں داخل ہونا یا اس کے پاس سے شدّت و مشقّت سے گزرنا ہے (تفسیر کشاف) اور یہ چیز بتاتی ہے کہ اس گھاٹی سے گزرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور یہ اس بات پر ایک تاکید ہے جو سُورہ کے آغاز میں آئی ہے، جس میں فرمایا ہے: "ہم نے انسان کو دُکھ اور تکلیف میں پیدا کیا ہے، اور اس کی زندگی بھی دُکھ درد اور رنج و تکلیف سے توأم ہے، اور پروردگار کی اطاعت کرنا بھی بہر حال کوئی آسان کام نہیں ہے"۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام کے ایک ارشاد میں آیا ہے:

"ان الجنة حفت بالمكاره وان النار حفت بالشهوات"

"بے شک جنت سختیوں کے درمیان گھری ہوئی ہے، اور دوزخ شہوات کے درمیان گھری ہوئی ہے"۔[1]

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ "فک رقبة" سے مُراد ظاہراً وہی غلاموں کو آزاد کرنا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک اعرابی پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے کوئی ایسا عمل تعلیم کیجئے کہ جو مجھے جنت میں داخل کرے، آپؐ نے فرمایا:

"ان كنت اقصرت الخطبة لقد عرضت المسألة"

"اگرچہ تُو نے بات تو مختصر کی ہے، لیکن ایک بہت بڑے مطلب کا سوال کیا ہے"۔ (یا یہ کہ اگرچہ تُو نے مختصر سی بات کی ہے لیکن تُو نے اپنے مقصُود کو اچھی طرح سے بیان کیا ہے)۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اعتق النسمة وفك رقبة"

"غلاموں کو آزاد کر اور گردنوں کو (طوقِ غلامی سے) رہائی دے۔"

راوی سوال کرتا ہے، کیا یہ دونوں چیزیں ایک ہی نہیں ہیں؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"نہیں! پہلے سے میری مُراد یہ ہے کہ تو غلام کو مُستقل طور پر آزاد کر دے، اور دوسرے سے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶۔

میری مُراد یہ ہے کہ تو اس کی قیمت کی ادائیگی میں امداد کرے تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا :

"والفئ علی ذی الرحم الظالم، فان لم یکن ذالک فاطعم الجائع، واسق الظمأن، وامر بالمعروف وانہ عن المنکر، فان لم تطق ذالک فکف لسانک الامن الخیر"۔

" ان رشتہ داروں کی طرف جنہوں نے تجھ سے قطع رحمی کی ہے اور تجھ پر ظلم کیا ہے، لوٹ جا (اور ان سے نیکی کر) اور اگر اس قسم کا کام ممکن نہ ہو تو پھر بھوکوں کو کھانا کھلا اور پیاسوں کو پانی پلا، اور امر بالمعروف اور نہی از منکر کر اور اگر تجھ میں اس کام کے کرنے کی بھی طاقت نہیں ہے تو کم از کم اپنی زبان نیکی کے علاوہ کسی چیز کے لیے نہ کھول"۔[1]

۲۔ بعض مفسرین نے " فک رقبۃ " کو، اپنی گردن کو گناہوں کے بار سے توبہ کے ذریعے آزاد کرنے، یا خُود کو اطاعتوں کے ذریعے عذاب الٰہی سے آزاد کرنے کے معنی میں سمجھا ہے، لیکن ان آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو اس کے بعد آئی ہیں، اور یتیم و مسکین کے بارے میں وصیت کر رہی ہیں، ظاہراً اس سے مراد وہی غلاموں کو آزاد کرنا ہی ہے۔

۳۔ " مسغبۃ " " سغب " (بروزن غضب) کے مادہ سے بھوک کے معنی میں ہے، اس بنا پر " یوم ذی مسغبۃ " بھوک کے دن کے معنی میں ہے، اگرچہ بھوکے افراد انسانی معاشروں میں رہتے ہیں لیکن یہ تعبیر قحط رسالی اور خشک سالی اور اسی قسم کے دنوں میں کھانا کھلانے کی ایک تاکید ہے، جو اس موضوع کی اہمیت کی بنا پر ہے، ورنہ تو بھوکوں کو کھانا کھلانا ہمیشہ افضل اعمال سے رہا ہے اور ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے :

" من اشبع جائعا فی یوم سغب ادخلہ اللہ یوم القیامۃ من باب من ابواب الجنۃ لا یدخلہا الا من فعل مثل ما فعل "۔

" جو شخص کسی بھوکے کو قحط کے دنوں میں پیٹ بھر کر کھانا کھلائے گا تو خدا اس کو قیامت میں جنت کے دروازوں میں سے اس دروازے سے داخل کرے گا جس سے کوئی دُوسرا داخل نہیں ہوگا سوائے اس شخص کے جس نے اس جیسا عمل انجام دیا ہوگا"۔[2]

۴۔ " مقربۃ " قرابت اور رشتہ داری کے معنی میں ہے اور یتیم رشتہ داروں کے بارے میں تاکید بھی ان کی اولویت کی بنا پر ہے، ورنہ تمام یتیموں کو کھانا کھلانا اور ان پر نوازش کرنا چاہیئے۔ یہ چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ رشتہ دار اپنے خاندان کے یتیموں کے بارے میں زیادہ سخت ذمہ داری رکھتے ہیں۔

اس سے قطع نظر وہ غلط فائدے، جو خاص طور پر اس زمانے میں رشتہ دار یتیموں کے اموال سے اُٹھائے جاتے تھے، تقاضا کرتے ہیں کہ

---

[1] " نور الثقلین " جلد ۵ ص ۵۸۳۔

[2] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۴۹۵

اس دُشوار گزار گھاٹی کے بارے میں ایک خاص قسم کی تنبیہ کی جائے۔ ابوالفتوح رازی کا نظریہ ہے کہ "مقربۃ" "قرابت کے مادّہ سے نہیں ہے بلکہ "قرب" کے مادّہ سے ہے اور ایسے قریبوں کی طرف اشارہ ہے جن کے پہلو بھوک کی شدّت سے ایک دُوسرے سے چمٹے ہوئے ہیں[1] لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے۔

۵۔ "متربۃ" مصدر میمی ہے "ترب" (بروزن طرب) کے مادّہ سے جو اصل میں "تراب" بمعنی "خاک" سے لیا گیا ہے۔ اور اس شخص پر بولا جاتا ہے جو فقر و فاقہ کی شدّت کی بنا پر خاک نشین ہو گیا ہو۔ پھر یہاں یہ تاکید اس قسم کے مساکین کے لیے ان کی اولیت کی بنا پر ہے ورنہ تمام مساکین کو کھانا کھلانا اعمالِ حسنہ میں سے ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

"امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السّلام جب کھانا کھانا چاہتے تھے تو یہ حکم دیتے تھے کہ ایک بہت بڑی سینی دسترخوان کے پاس رکھ دی جائے، اور دسترخوان پر جتنے کھانے ہوتے تھے ان میں سے بہترین کھانا اُٹھا کر اس سینی میں ڈال دیتے تھے، اور پھر یہ حکم دیتے تھے کہ وہ حاجت مندوں کو دے دیں۔ پھر آپ اس آیت کی تلاوت فرماتے: فلا اقتحم العقبۃ ..... اس کے بعد مزید فرماتے: خداوند تعالیٰ جانتا تھا کہ سب لوگ غلاموں کو آزاد کرنے پر قادر نہیں ہیں لہٰذا اپنی بہشت کی طرف ایک اور راستہ بھی قرار دیا ہے۔"[2]

بعد والی آیت میں، اس تفسیر کو جاری رکھتے ہوئے، جو اس دشوار گزار گھاٹی کے لیے یہاں فرمائی ہے، مزید کہتا ہے: "پھر وہ ایسے لوگوں میں سے ہو جو ایمان لائے ہیں، اور ایک دوسرے کو صبر و استقامت اور رحم کرنے کی وصیت کرتے ہیں"۔ (ثم کان من الذین آمنوا وتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمۃ)۔

اس طرح سے وہ لوگ اس دُشوار گزار گھاٹی سے عبور کر لیں گے جو صاحبِ ایمان بھی ہوں اور صبر کی دعوت کرنے اور عواطفِ انسانی جیسے اعلیٰ اخلاق بھی رکھتے ہوں اور انہوں نے غلاموں کو آزاد کرنے اور یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے جیسے اعمالِ صالح بھی انجام دیے ہوں۔ یا دُوسرے لفظوں میں وہ تین میدانوں، ایمان، اخلاق اور عمل میں قدم رکھیں اور اس سے سربلند و سرفراز ہو کر نکلیں۔ یہی ہیں وہ لوگ جو اس قسم کی دُشوار گزار گھاٹی کو عبور کر لیں گے۔

"ثم" (بعد) کی تعبیر ہمیشہ ہی تاخیرِ زمانی کے معنی میں نہیں ہوتی کہ اس کلام کا لازمہ یہ ہو کہ پہلے کھانا کھلائیں اور انفاق کریں اور اس کے بعد ایمان لائیں، بلکہ اس قسم کے موارد میں۔ جیسا کہ مفسّرین کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے۔ مقام کی برتری کے بیان کے لیے کیونکہ مسلّمہ طور پر ایمان کا رُتبہ، اور صبر و مرحمت کی وصیت کرنے کا مرتبہ، حاجت مندوں کی مدد کرنے کے مرتبہ سے بالاتر ہے، بلکہ اعمالِ صالح کا سرچشمہ ایمان اور اخلاق ہی ہیں، اور ان سب کی جڑ بنیاد اعتقادات اور اعلیٰ اخلاق میں ہی تلاش کرنا چاہیئے۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "ثم" یہاں تاخیرِ زمانی کے معنی میں ہے، کیونکہ بعض اوقات اعمالِ صالح ایمان کی طرف جھکاؤ کا سرچشمہ بن جاتے ہیں اور خاص طور پر اخلاق کی بنیادوں کو محکم کرنے میں مؤثر واقع ہوتے ہیں، کیونکہ انسان کا خلق و خو پہلے "فعل" کی صورت میں

---

[1] "تفسیر ابوالفتوح رازی"، جلد ۱۲ ص ۹۶

[2] کافی مطابق نقل تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۴۲۴

ہوتا ہے، اس کے بعد "حالت" کی صورت میں اور پھر "عادت" بن جاتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک "ملکہ" کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

"تواصوا" کی تعبیر جس کا مفہوم ایک دوسرے کو وصیت اور سفارش کرنا ہے، ایک اہم نکتہ اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور وہ یہ ہے کہ پروردگار کی اطاعت کی راہ میں صبر و استقامت اور ہوائے نفس سے مبارزہ و مقابلہ جیسے اہم مسائل، اور اسی طرح اصل محبت و مرحمت کو تقویت دینا معاشرے میں انفرادی صورت میں نہیں ہونے چاہئیں، بلکہ اسے ایک عمومی صورت میں سارے معاشرے میں جاری ہونا چاہیئے، اور سب افراد ہی ایک دوسرے کو اس "اصول" کی رعایت و حفاظت کرنے کی وصیت کریں تاکہ اس طریقہ سے اجتماعی تعلقات اور زیادہ محکم سے محکم ہوں۔

بعض نے کہا ہے کہ "صبر" یہاں فرمانِ خدا کی اطاعت میں استقامت اور اس کے اوامر میں اہتمام کرنے کے معنی میں ہے اور "مرحمت" مخلوقِ خدا کے لیے محبت کی طرف اشارہ ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ خالق و مخلوق سے ارتباط ہی دین کی اساس و بنیاد ہے۔ بہرحال صبر و استقامت ہی ہر قسم کی اطاعت و بندگی اور گناہ و عصیان کے ترک کرنے کی اصل و بنیاد ہے۔

اور ان اوصاف کے آخر میں ان اوصاف کے حاملین کے مقام کو اس طرح بیان فرماتا ہے: "وہ اصحاب یمین ہیں" (اولئک اصحاب المیمنۃ)۔

اور ان کا نامۂ اعمال بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہونے کی نشانی اور علامت کے طور پر ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ "میمنہ" "یمن" کے مادہ سے ہے یعنی وہ صاحبانِ برکت ہیں اور ان کا وجود خود ان کے لیے بھی برکت ہے اور معاشرے کے لیے بھی۔

اس کے بعد اس گروہ کے نقطۂ مقابل یعنی ان لوگوں کا بیان کرتے ہوئے، جو اس دشوار گزار گھاٹی سے نہیں گزرے، فرماتا ہے:

وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کر دیا، ایسے بدبخت اور شوم ہیں کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا" (والذین کفروا بآیاتنا ھم اصحاب المشئمۃ)۔

اور یہ اس بات کی نشانی ہے کہ ان کا ہاتھ حسنات اور نیکیوں سے خالی ہے اور ان کا نامۂ اعمال سیئات اور برائیوں سے سیاہ ہے۔

"مشئمۃ" "شوم" کے مادہ سے "میمنۃ" کا جو "یمن" کے مادہ سے ہے، نقطۂ مقابل ہے۔ یعنی یہ کافر گروہ شوم، بدبخت اور نامبارک افراد ہیں جو اپنی بدبختی کا سبب بھی ہیں اور معاشرے کی بدبختی کا بھی، لیکن چونکہ قیامت میں بدبخت و شوم ہونا اور مبارک ہونا اس چیز سے پہچانا جائے گا کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے بائیں یا دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ لہٰذا بعض نے اس تفسیر کو اسی وجہ سے پسند کیا ہے، خصوصاً جب کہ شوم کا مادہ لغت میں بائیں طرف کے جھکاؤ کے معنی میں بھی آیا ہے[1]۔

اس سورہ کی آخری آیت میں آخری گروہ کی سزا کی طرف ایک مختصر اور پُرمعنی اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ان کے اوپر آگ ہے، جو انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، جس سے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے" (علیھم نار مؤصدۃ)۔

"مؤصدۃ" "ایصاد" کے مادہ سے دروازہ کو بند کرنے اور اسے محکم کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ انسان اس کمرے میں جس کی فضا گرم ہو یہ چاہتا ہے کہ اس کے دروازوں کو کھول دے، تاکہ تازہ ہوا آئے اور فضا کی گرمی کو معتدل کر دے۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۲ ص ۹۷ اور المنجد مادہ "شام"۔

اَب سوچنا چاہیئے کہ دوزخ کی جلانے والی بھٹی میں، جب کہ تمام دروازے بند ہو جائیں، کیا حالت پیدا ہوگی ؛

خداوندا ! ہمیں اس قسم کے جان گداز عذاب سے اپنے لُطف وکرم کی پناہ میں محفوظ رکھنا۔

پروردگارا ! ان گھاٹیوں سے گزرنا جو ہمارے سامنے ہیں، تیری توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔ تو اپنی توفیق کو ہم سے نہ روکنا۔

بارِ الہا ! ہمیں اصحاب میمنہ کی صف میں جگہ دینا اور نیک اور ابرار لوگوں کے ساتھ محشور فرمانا۔

آمین یارب العالمین

سُورۂ "بلد" کا اختتام

❖ ❖ ❖

سُورَۃُ الشَّمسِ

- یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہُوا
- اس کی ۱۵ آیات ہیں

سُورۂ الشمس اور اس کی فضیلت

یہ سُورہ جو حقیقت میں "تہذیب نفس" اور دلوں کو آلائشوں اور ناپاکیوں سے پاک کرنے والا سُورہ ہے، اسی معنی کے محور پر گردش کرتا ہے البتہ اس سُورہ کے آغاز میں اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے کہ فلاح و رست گاری تہذیب نفس کی مرہونِ منت ہے، عالمِ خلقت کے گیارہ اہم موضوعات اور خدا کی ذاتِ پاک کی قسم کھائی گئی ہے۔ اور قرآن مجید کی بیشتر قسموں کو مجموعی طور پر اپنے اندر سمو لیا ہے۔

اور سُورہ کے آخر میں باغی اور سرکش قوموں میں سے ایک کا ذکر، جو تہذیب نفس کو ترک کرنے کی بنا پر ابدی اور دائمی شقاوت و بدبختی میں ڈوب گئی تھی، اور خدا نے اُسے شدید عذاب میں گرفتار کیا تھا، یعنی قوم "ثمود" بطور نمونہ پیش کرتا ہے، اور ایک مختصر سے اشارے کے ساتھ ان لوگوں کی سرنوشت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

حقیقت میں یہ مختصر سا سورہ بشر کی زندگی کے سرنوشت ساز مسائل میں سے ایک اہم ترین مسئلہ کو موضوع بناتا ہے اور انسانوں کے لیے اسلام کے قابلِ قدر نظام کو مشخص کرتا ہے۔

اس سُورہ کی فضیلت کے بارے میں بس اتنا ہی کافی ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من قرأها فكانما تصدق بكل شيء طلعت عليه الشمس والقمر"

"جو شخص اس سُورہ کو پڑھے گا تو گویا اس نے ان تمام چیزوں کی تعداد میں جن پر سُورج اور چاند طلوع کرتے ہیں صدقہ دیا ہے۔"[1]

اور مسلّمہ طور پر یہ عظیم فضیلت اس شخص کے لیے ہے جو اس چھوٹے سے سورہ کے عظیم مطالب پر دل و جان سے عمل کرے اور تہذیب نفس کو اپنا قطعی وظیفہ سمجھے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝
۲۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝
۳۔ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۝
۴۔ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۝
۵۔ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۝
۶۔ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝
۷۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝
۸۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝
۹۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝
۱۰۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ سورج اور اس کی روشنی کے پھیلنے کی قسم۔

۲۔ اور چاند کی جب کہ وُہ اس کے پیچھے آئے۔

۳۔ اور دن کی جب کہ وُہ صفحۂ زمین کو روشن کرے۔

۴۔ اور قَسم ہے رات کی جب کہ وُہ صفحۂ زمین کو ڈھانپ لے۔

۵۔ اور قَسم ہے آسمان کی اور جس نے اُسے بنایا۔

۶۔ اور قَسم ہے زمین کی اور جس نے اسے بچھایا۔

۷۔ اور قَسم ہے انسان کے نفس کی اور جس نے اسے درست کیا۔

۸۔ پھر اُسے فجور و تقویٰ (خیر و شر) کا الہام کیا۔

۹۔ کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا وُہ فلاح پاگیا (اور رست گار ہُوا)۔

۱۰۔ اور جس نے اپنے نفس کو معصیّت اور گناہ سے آلودہ کیا وہ نا اُمید اور محروم ہُوا۔

تفسیر

تہذیبِ نفس کے بغیر نجات ممکن نہیں

وہ پے در پے اور اہم قسمیں جو اس سُورہ کے آغاز میں آئی ہیں ایک حساب سے "گیارہ" قسمیں ہیں اور دوسرے حساب سے "سات" قسمیں ہیں، اور قرآن کی بیشتر قسموں کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ یہ چیز اس بات کی اچھی طرح سے نشان دہی کرتی ہے کہ یہاں کوئی بہت ہی اہم مطلب درپیش ہے، ایسا مطلب جو آسمانوں، زمین، سُورج اور چاند کی عظمت کے برابر ہے اور ایک ایسا مطلب ہے جو سرنوشت ساز اور حیات بخش ہے۔

پہلے ضروری ہے کہ ہم ان قسموں کی تشریح و تفسیر پیش کریں اور اس کے بعد اس نہایت اہم مطلب پر غور کریں جس کے لیے یہ سب قسمیں کھائی گئی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "سُورج اور اس کی روشنی کے پھیلنے کی قسم" (والشمس وضحاھا)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں قرآن کی قسموں کے عام طور پر دو مقصد ہوتے ہیں، پہلا مقصد اس مطلب کی اہمیت جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے اور دُوسرا ان امور کی اہمیّت جن کی قسم کھائی گئی ہے کیونکہ قسم ہمیشہ اہم موضوعات کی کھائی جاتی ہے۔ اسی بنا

پر یہ قسمیں انسان کو غور و فکر کی طرف مائل کر دیتی ہیں تا کہ وہ عالم خلقت کے اُن اہم موضوعات کے بارے میں غور و فکر کریں، اور ان سے خدا کی طرف راستہ نکالیں۔

"سُورج" کا انسان اور تمام زندہ زمینی موجودات کی زندگی میں اہم ترین اور پائندہ ترین نقش و اثر ہے، کیونکہ اس بات کے علاوہ کہ وُہ نُور و روشنی اور حرارت کا منبع ہے، اور یہ دونوں انسانی زندگی کے اصلی عوامل میں سے شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے حیاتی منابع بھی اسی کے سبب سے وجود میں آتے ہیں۔ ہواؤں کا چلنا، بارش کا برسنا، نباتات کی پرورش، دریاؤں اور آبشاروں کا چلنا، یہاں تک کہ قوت پیدا کرنے والے منابع کا ظاہر ہونا، جیسا کہ تیل و پٹرول اور پتھر کا کوئلہ وغیرہ۔ اگر ہم صحیح طور پر غور کریں تو ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی صُورت میں سُورج کی روشنی سے ارتباط رکھتا ہے۔ اس طرح سے کہ اگر کسی دن یہ حیات بخش چراغ خاموش ہو جائے تو تاریکی و سکوت اور خاموشی و موت ہر جگہ کو گھیر لے۔

"ضحٰی" اصل میں سُورج کی روشنی کے پھیلنے کے معنی میں ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب سُورج اُفق سے اُوپر آجائے اور اس کی روشنی ہر جگہ کو گھیر لے۔ اس کے بعد دن کے اس موقع پر بھی "ضحٰی" کا اطلاق ہونے لگا۔

خصوصیت کے ساتھ "ضحٰی" پر تکیہ اس کی اہمیت کی بنا پر ہے کیونکہ وہ زمین پر سُورج کی روشنی کے تسلط کا وقت ہوتا ہے۔

اس کے بعد تیسری قسم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "قسم ہے چاند کی جب کہ وہ سُورج کے پیچھے پیچھے آئے" (والقمر اذا تلاھا)۔

یہ تعبیر۔ جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ حقیقت میں چاند کے بدرِ کامل ہونے یعنی چودھویں رات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ چودھویں رات کا چاند غروب آفتاب کے ساتھ ہی اُفق مشرق سے نمودار ہوتا ہے اور اپنے روشن چہرے کو ظاہر کرتے ہوئے اپنا تسلط آسمان پر جما لیتا ہے۔ اور چونکہ یہ اس وقت ہر زمانہ سے زیادہ عمدہ اور زیادہ پُر شکوہ ہوتا ہے لہٰذا اس کی قسم کھائی ہے۔

مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ اُوپر والی تعبیر چاند کے دائمی طور پر سُورج کے تابع ہونے اور اس منبع نُور سے روشنی حاصل کرنے کی طرف اشارہ ہے، لیکن اس صُورت میں "اذا تلاھا" کا جملہ قید توضیحی ہوگا۔

بعض نے اس آیت کی تفسیر میں کچھ اور احتمال بھی دیے ہیں جو توجہ کے لائق نہیں ہیں، لہٰذا ان کو ذکر نہیں کیا گیا۔

چوتھی قسم میں مزید کہتا ہے: اور دن کی قسم ہے جب کہ وہ صفحۂ زمین کو روشن کر دے۔" (والنھار اذا جلّاھا)۔

"جلّاھا" "تجلیۃ" کے مادہ سے، اظہار و ابراز کے معنی میں ہے۔

اس بارے میں کہ جلاھا کی ضمیر کس طرف لوٹتی ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بہت سے اسے زمین یا دُنیا کی طرف لوٹاتے ہیں (جیسا کہ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے)۔ یہ ٹھیک ہے کہ گزشتہ آیات میں "زمین" کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں تھی، لیکن یہ بات قرینۂ مقام سے واضح ہو جاتی ہے۔

بعض کا یہ بھی نظریہ ہے کہ یہ ضمیر "سُورج" کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی قسم ہے دن کی جب کہ وہ سُورج کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

بہر حال اس اہم آسمانی مخلوق کی قسم اس کی نوع بشر اور تمام زندہ موجودات کی زندگی میں اس کی حد سے زیادہ تاثیر کی بنا پر ہے، کیونکہ دن حرکت، جنبش اور حیات کا مظہر ہے، اور زندگی کی تمام جدوجہد، کشش اور کوشش عام طور پر دن کی روشنی میں ہی صُورت پذیر ہوتی ہے۔

پانچویں قسم میں فرماتا ہے: "رات کی قسم جب کہ وہ صفحۂ زمین (یا سُورج) کو ڈھانپ دیتی ہے" والليل اذا يغشاها)۔[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رات اپنی تمام برکات و آثار کے ساتھ ایک طرف تو سُورج کی دن کی حرارت میں اعتدال پیدا کرتی ہے اور دُوسری طرف تمام زندہ موجودات کے آرام و سکون اور راحت پانے کا سبب بنتی ہے۔ کیونکہ اگر رات کی تاریکی نہ ہوتی، اور مسلسل سُورج ہی چمکتا رہتا تو آرام و سکون کا وجُود ہی نہ ہوتا، کیونکہ سُورج کی جلانے والی حرارت ہر چیز کو نابُود کر دیتی۔ یہاں تک کہ اگر شب و روز کا نظام موجودہ کیفیت کے برخلاف ہوتا تو بھی یہی مشکل پیش آتی، جیسا کہ چاند میں جس کی راتیں کُرۂ زمین کے دو ہفتوں کے برابر ہوتی ہیں اور دن بھی دو ہفتے کے برابر ہوتے ہیں۔ وہاں دوپہر کے وقت حرارت تقریباً تین سو درجہ سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتی ہے، جس میں کوئی بھی زندہ موجود جسے ہم پہچانتے ہیں باقی نہیں رہ سکتا۔ اور آدھی رات کے وقت اس کا درجۂ حرارت صفر سے نیچے چلا جاتا ہے کہ اگر وہاں پر کوئی زندہ موجود ہو تو یقینی طور پر برف ہو کر نابُود ہو جائے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں افعال "ماضی" کی صُورت میں آئے تھے اور اس آیت میں مضارع کی صُورت میں آئے ہیں تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ شب و روز کے ظہور مثلاً حوادث کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتے۔ وہ گزشتہ اور آئندہ سب کو شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے بعض فعل ماضی کی صُورت میں اور بعض مضارع کی صُورت میں آئے ہیں، تاکہ ان حوادث کی عمومیت کو زمانہ کے ضمن میں واضح کریں۔

چھٹی اور ساتویں قسم میں آسمان اور خالقِ آسمان کی طرف توجہ کرتا ہے اور مزید فرماتا ہے: "قسم ہے آسمان کی اور اس ذات کی جس نے آسمان کو بنایا" (والسماء وما بناھا)۔

ایسی خیرہ کرنے والی عظمت کے ساتھ آسمان کی اصل خلقت، عالمِ خلقت کے عظیم عجائبات میں سے ہے، اور ان تمام ستاروں، اجرامِ سماوی اور ان پر حاکم نظام ایک تعجب خیز چیز ہے۔ اور ان سب سے زیادہ اہم اس آسمان کا خالق ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ لفظ "ما" عربی لغت میں عام طور پر "غیر ذوی العقول موجود" کے لیے آتا ہے۔ لہٰذا خداوندِ عالم حکیم پر اس کا اطلاق کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس لیے بعض علماء یہاں "ما" کو مصدریہ" مراد لینے پر مجبُور ہوئے ہیں نہ کہ "موصولہ" اور اس صورت میں آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا: قسم ہے آسمان کی اور اس کی بنا کی"۔

لیکن آیات "ونفس وما سواھا فالھمھا فجورھا وتقواھا" کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جن کی تفسیر عنقریب بیان کی جائے گی، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ "ما" "موصولہ" ہو اور خدا کی ذاتِ پاک کی طرف اشارہ ہو جو تمام آسمانوں کا خالق ہے، اور عربی زبان میں افراد ذوی العقول کے بارے میں بھی "ما" کا استعمال ہوتا رہتا ہے، جیسا کہ سُورۂ نساء کی آیہ ۳ میں آیا ہے: فانکحوا ما طاب لکم من النساء: جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کرو۔

مفسرین کی ایک جماعت کا نظریہ، یہ ہے کہ "ما" (جس چیز) کی تعبیر یہاں اس بنا پر ہے کہ مبدأ جہان کو پہلے مبہم صُورت میں

(بقیہ گزشتہ صفحہ)

لہ اس بارے میں کہ "یغشاھا" کی ضمیر کس چیز کی طرف لوٹتی ہے؟ یہاں بھی دو نظریے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ یہ "زمین" کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ رات ایک پردہ کی مانند ہے جو صفحۂ زمین پر گرتا ہے، اور دوسرا یہ ہے کہ یہ "سُورج" کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ رات ایک پردہ کی مانند ہے جو سُورج کے چہرے پر پڑتا ہے، البتہ اس صُورت میں اس کا مفہوم مجازی ہوگا، کیونکہ رات حقیقت میں سُورج پر پردہ نہیں ڈالتی۔ بلکہ سُورج کے غروب ہونے کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت میں اگر گزشتہ آیت میں ضمیر "ارض" کی طرف لوٹے تو یہاں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے اور اگر "شمس" کی طرف لوٹے تو پھر یہاں بھی اسی طرح ہوگا۔

ذکر کیا گیا ہو، تاکہ بعد میں غور و تحقیق اور مطالعہ کے ساتھ اس کے علم و حکمت سے آشنا ہوں، اور "جس چیز" "اس ذات" کے ساتھ تبدیل ہو جائے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

پھر آٹھویں اور نویں قسم میں "زمین" اور "زمین کے خالق" کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: "قسم ہے زمین کی اور اس کی جس نے زمین کو بچھایا" (والارض وما طحاها)۔

زمین جو انسان اور تمام زندہ موجودات کی زندگی کا گہوارہ ہے۔

زمین جو اپنی تمام حیرت انگیز چیزوں: پہاڑوں، سمندروں، دروں، جنگلوں، چشموں، دریاؤں، معادن اور اس کے گرانبہا منابع کے ساتھ، کہ ان میں سے ہر ایک اکیلا بھی حق تعالےٰ کی آیات میں سے ایک آیت اور اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

اور اس سے برتر و بالاتر اس زمین کا خالق اور وہ ذات ہے کہ جس نے اُسے بچھایا ہے۔

"طحاها" "طحو" (بروزن سمو) کے مادّہ سے بچھانے اور پھیلانے کے معنی میں بھی آیا ہے اور دھکیلنے، اور دُور کرنے اور ختم کرنے کے معنی میں بھی، اور یہاں بچھانے کے معنی میں ہے، کیونکہ اولاً زمین ابتدا میں پانی کے نیچے غرق تھی۔ بتدریج آہستہ آہستہ پانی زمین کے گڑھوں میں قرار پایا اور خشکیوں نے سر نکال لیا اور زمین پھیلتی چلی گئی اور اس کو "دحوالارض" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

ثانیاً زمین مبتدا میں پستیوں اور بلندیوں اور ناقابلِ سکونت گڑھوں کی صورت میں تھی جس پر مسلسل موسلا دھار بارشیں برسیں جنہوں نے زمین کی بلندیوں کو دھو دیا اور گھاٹیوں میں پھیلا دیا۔ اور آہستہ آہستہ انسانی زندگی اور زراعت کے لیے قابلِ استفادہ ہموار زمینیں وجود میں آگئیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اس تعبیر میں زمین کی حرکت کی طرف ایک اجمالی اشارہ موجود ہے، کیونکہ طحو کے معانی میں سے ایک معنی دھکیلنا بھی ہے، جو سورج کے گرد زمین کی انتقالی حرکت کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے، یا اس کی محوری حرکت، یا دونوں قسم کی حرکت بھی ہو سکتی ہے۔

اور آخر میں "دسویں" اور "گیارہویں" قسم کو پیش کرتے ہوئے جو اس سلسلہ کی آخری قسم ہے، فرماتا ہے: "قسم ہے انسان کے نفس کی، اور اس ذات کی، جس نے اُسے مرتب و منظم کیا ہے" (ونفس وما سوّاها)۔

وہی انسان جو عالمِ خلقت کا خلاصہ، جہانِ ملک و ملکوت کا نچوڑ اور عالمِ آفرینش کا کُل سرسبد ہے:

یہ عجیب مخلوق جو عجائبات اور اسرار سے پُر ہے اس قدر اہم ہے کہ خدا نے خود اس کی اور اس کے خالق کی ایک ہی جگہ قسم کھائی ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں "نفس" سے مُراد انسان کی رُوح ہے یا جسم و رُوح دونوں؛ مفسرین نے کئی احتمال دیے ہیں۔

اگر مُراد رُوح ہو تو پھر "سوّاها" سے مُراد (جو تسویہ کے مادّہ سے ہے) انسان کے روحی قویٰ اور استعدادوں کی، حواس ظاہری سے لے کر ادراک، حافظہ، انتقال، تخیل، ابتکار، عشق، ارادہ، تصمیم اور اسی قسم کے قوائے جو "علم النفس" کے مباحث میں بیان ہوتے ہیں، تنظیم و تعدیل ہے۔

اور اگر رُوح و جسم دونوں مُراد ہوں تو پھر بدن کے تمام حیرت انگیز نظاموں اور اس کے مختلف کارخانوں کو۔ جن کے بارے میں علم "تشریح الاعضاء" اور "فزیالوجی" (افعال الاعضاء) میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ شامل ہوگا۔

البتہ قرآن مجید میں نفس کا دونوں معانی پر اطلاق ہوا ہے۔

رُوح کے بارے میں سُورہ زمر کی آیہ ۴۲ میں آیا ہے: اللہ یتوفی الانفس حین موتھا: "خُدا موت کے وقت ارواح کو لے لیتا ہے"۔

اور جسم کے بارے میں سورۂ قصص کی آیہ ۳۳ میں آیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں: قال رب انی قتلت منھم نفسا فاخاف ان یقتلون: موسیٰ علیہ السلام نے کہا، میں نے ان (ظالم فرعونیوں) میں سے ایک کو قتل کر دیا ہے، مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

لیکن یہاں مناسب یہ ہے کہ دونوں کو شامل ہو، کیونکہ خدا کی قدرت کی حیرت انگیزیاں جسم میں بھی موجود ہیں اور رُوح میں بھی، اور ان میں سے کسی ایک کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں "نفس" نکرہ کی صُورت میں بیان ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات نفسِ انسانی کی اہمیت و عظمت کی طرف اشارہ ہو، ایسی عظمت جو تصور سے مافوق اور ابہام سے ملی ہوئی ہو، جو اس کے انجانے موجود کی صُورت میں تعارف کراتی ہے جیسا کہ موجودہ زمانہ کے ایک عظیم ترین عالم نے انسان کو اسی عنوان سے تعبیر کیا ہے، اور انسان کا موجودِ ناشناختہ" نام رکھا ہے۔

بعد والی آیت میں انسان کی خلقت سے مربوط ایک اہم ترین مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "انسان کے قوی اور جسم و رُوح کی تنظیم کرنے کے بعد اُسے "فجور" و "تقویٰ" کا الہام کیا" (فالھمھا فجورھا وتقواھا)۔

ہاں! جب اس کی خلقت کی تکمیل ہوگئی اور اس کی "ہستی" وجود میں آگئی تو خدا نے اُسے "بایدھا و نبایدھا" (جو کام کرنے چاہئیں اور جو کام نہیں کرنے چاہئیں) کی تعلیم دی۔ اور اس طرح سے وہ ایک ایسا وجود بن گیا جو خلقت کے لحاظ سے "سڑی ہوئی گیلی مٹی اور رُوحِ الٰہی" کا مجموعہ ہے، تعلیمات کے لحاظ سے "فجور و تقویٰ سے آگاہ ہے" اور نتیجہ کے لحاظ سے وہ ایک ایسا وجود ہے جو قوسِ صعودی میں فرشتوں سے برتر ہو سکتا ہے، فرشتوں سے بھی آگے پرواز کر سکتا ہے، اور جو بات وہم میں بھی نہ آئے وہ بن سکتا ہے جبکہ قوسِ نزولی میں درندہ جانوروں سے بھی پست تر ہو جائے اور "بل ھم اضل" کے مرحلہ تک جا پہنچے، اور یہ چیز اس بات پر موقوف ہے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ کون سی راہ اختیار کرتا ہے۔

"الھمھا" "الھام" کے مادہ سے اصل میں تو کسی چیز کے نگلنے یا پینے کے معنی میں ہے، اور اس کے بعد پروردگار کی طرف سے انسان کی رُوح میں کسی مطلب کے القا کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ گویا انسان کی رُوح اس مطلب کو اس کے سارے وجود کے ساتھ پی لیتی ہے اور نگل جاتی ہے۔ اور کبھی وحی کے معنی میں بھی آیا ہے لیکن بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "الہام" اور "وحی" میں فرق یہ ہے کہ وہ شخص جسے الہام ہوتا ہے وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ مطلب اُسے کہاں سے حاصل ہوا ہے، جب کہ وحی کے وقت وہ جانتا ہوتا ہے کہ یہ اُسے کہاں سے اور کس ذریعے سے پہنچتی ہے۔

"فجور" "فجر" کے مادہ سے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ وسیع شگاف کرنے کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ صبح کی سفیدی رات کے پردہ کو چاک کر دیتی ہے، لہٰذا اسے "فجر" کہا گیا ہے۔ اور چونکہ گناہوں کا ارتکاب بھی دیانت کے پردہ کو چاک کر دیتا ہے لہٰذا اس پر "فجور" کا اطلاق ہوا ہے۔

البتہ زیرِ بحث آیت میں "فجور" سے مُراد وہی اس کے اسباب، عوامل اور طریقے ہیں۔

اور " تقوٰی " سے مراد ، جو " وقایہ " کے مادّہ سے نگہداری کے معنی میں ہے ، یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو قباحتوں ، برائیوں ، آلودگیوں اور گناہوں سے محفوظ اور دُور رکھے ۔

یہ بات بھی یاد دلانا ضروری ہے کہ اس آیہ (فالهمها فجورها و تقوا ها) کے معنی یہ نہیں ہیں ، کہ خدا نے فجور و تقوٰی کے عوامل انسان کی رُوح کے اندر ایجاد کر دیے ہیں ، ایسے عوامل جو اُسے فجور و آلودگی اور حیا کے پردوں کو چاک کرنے کی دعوت دیتے ہیں ، اور ایسے عوامل جو اُسے خیرات اور نیکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں ، جیسا کہ بعض نے خیال کیا ہے اور آیت کو انسان کے وجود میں تضاد کے موجود ہونے کی دلیل سمجھا ہے ۔

بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ اس نے ان دو حقیقتوں کا اُسے الہام کیا اور تعلیم دی ، یا زیادہ سادہ اور آسان زبان میں اُس کو راہ اور چاہ کی نشان دہی کر دی ، جیسا کہ سُورۂ بلد کی آیہ ۱۰ میں آیا ہے : وهديناه النجدين : " ہم نے انسان کو خیر و شر کی ہدایت کر دی ہے "

اور دُوسرے لفظوں میں خدا نے اسے تشخیص کی ایسی قدرت اور بیدار عقل و وجدان عطا کیا ہے کہ وہ " فجور " و " تقوٰی " کو " عقل " و " فطرت " کے طریق سے معلوم کر لیتا ہے ۔

اسی لیے بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت حقیقت میں " حسن و قبح عقلی " کے مسئلہ کی طرف ایک اشارہ ہے کہ خدا نے ادراک کی توانائی انسانوں کی عطا کی ہے ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ خدا نے انسان کو بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں ، لیکن ان تمام نعمتوں میں سے یہاں مسئلہ فجور و تقوٰی اور حُسن و قبح کے ادراک پر تکیہ کیا ہے کیونکہ یہ مسئلہ انسان کی زندگی کے مسائل میں سے زیادہ قسمت کو بنانے یا بگاڑنے والا مسئلہ ہے ۔

انجام کار ان تمام اہم اور پے دَر پے قسموں کے بعد ان کے نتیجہ کو پیش کرتے ہُوئے فرماتا ہے : " ان چیزوں کی قسم ہے کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا وہ نجات پائے گا " (قد افلح من زكّٰها) ۔

" زكّٰها " " تزكية " کے مادّہ سے اصل میں ، جیسا کہ راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے ، رشد و نمو کے معنی میں ہے اور زکات بھی اصل میں نشو و نما اور رشد کے معنی میں ہے ۔ اسی لیے ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام سے آیا ہے :

" المال تنقصه النفقة والعلم يزكوا على الانفاق "

" مال تو خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے لیکن علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے اور نشو و نما پاتا ہے "[1]

اس کے بعد یہ لفظ طہارت اور پاک کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے ، شاید اس مناسبت سے کہ آلودگیوں سے پاک کرنا رشد و نمو کا سبب ہوتا ہے ، اور زیر بحث آیت میں دونوں معانی کا امکان ہے ۔

ہاں ! رست گاری اور نجات اس شخص کے لیے ہے جو اپنے نفس کی تربیت اور نشو و نما کرے اور اسے شیطانی اخلاق و عادات ، گناہ و عصیان اور کفر سے پاک رکھے ۔

حقیقت میں انسان کی زندگی کا اصلی مسئلہ بھی یہی " تزکیہ " ہی ہے کہ اگر یہ ہو تو وہ سعادت مند ہے ورنہ بدبخت و بے نوا ہے ۔

اس کے بعد گروہ مخالف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے ، : نا اُمید و بدبخت ہوا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو معصیت و گناہ سے

---

[1] نہج البلاغہ کلماتِ قصار کلمہ ۱۴۷ ۔

آلودہ کیا" (وقد خاب من دساھا)۔

"خاب" "خیبۃ" کے مادہ سے، مطلوب تک نہ پہنچنے، محروم ہونے، اور نقصان اُٹھانے کے معنی میں ہے [1]

"دساھا" "دس" کے مادہ سے، اصل میں کسی چیز کو کراہت و ناپسندیدگی کے ساتھ داخل کرنے کے معنی میں ہے، جیسا کہ قرآن مجید عرب جاہلوں کے اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے بارے میں فرماتا ہے: ام یدسہ فی التراب: "اسے کراہت و نفرت سے مٹی میں پنہاں کر دیتا ہے"۔ (نحل - ۵۹) اور "دسیسۃ" نقصان دہ مخفی کاموں کے لیے بولا جاتا ہے۔

زیر بحث آیت کے ساتھ اس معنی کی مناسبت کے بارے میں مفسرین نے مختلف بیان دیے ہیں۔

کبھی تو یہ کہا گیا کہ یہ تعبیر گناہ اور فسق سے کنایہ ہے، کیونکہ اہل تقویٰ و صلاح خود کو آشکار کرتے ہیں، جب کہ آلودہ اور گنہگار لوگ خود کو چھپاتے ہیں، جیسا کہ نقل ہوا ہے کہ عربوں میں جو لوگ زیادہ سخی ہوتے تھے وہ اپنے خیمے اُونچی جگہ پر نصب کرتے تھے اور رات کو آگ جلا دیا کرتے تھے تاکہ حاجت مند دن رات میں جب چاہیں ان کے پاس آسکیں اور ان سے مانوس ہو سکیں، لیکن بخیل اور کنجوس لوگ نشیبی زمینوں میں خیمے لگاتے تھے تاکہ کوئی شخص ان کے پاس نہ آسکے۔

اور کبھی یہ کہا ہے کہ اس سے مُراد یہ ہے کہ گنہگار خود کو صالح لوگوں میں پنہاں کر لیتے ہیں۔

یا اپنے نفس یا اپنی ہیئتِ انسانی کو معاصی و گناہ میں چھپا لیتے ہیں۔

یا معاصی و گناہ کو اپنے نفس کے اندر چھپا لیتے ہیں۔

بہرحال یہ گناہ و معصیت اور شیطانی عادات سے آلودگی سے ایک کنایہ ہے، اور یہ ٹھیک تزکیہ کا نقطۂ مقابل ہے۔

اِس آیت کے وسیع مفہوم میں ان تمام معانی کو جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

اِس طرح سے دُنیاوی زندگی کے میدان میں کامیاب ہونے والے اور شکست کھانے والے مشخص ہو جاتے ہیں اور ان دونوں گروہوں کی قدر و قیمت کا معیار "تزکیہ نفس اور رُوحِ تقویٰ و اطاعتِ خداوندی نمو و رشد" یا "انواع و اقسام کے معاصی اور گناہوں سے آلودگی" کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اور اس سے وہ بات واضح ہو جاتی ہے، جو امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہے، کہ آپ نے فرمایا:

"قد افلح من اطاع وخاب من عصی"

"جس نے اطاعت کی وہ نجات پا گیا اور جس نے نافرمانی کی وہ نا اُمید اور محروم ہو گیا"۔ [2]

یہ حقیقت میں نتیجہ کا بیان اور مقصود کا ماحصل ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس وقت آیہ "قد افلح من زکّاھا" کی تلاوت کی تو توقف فرمایا اور اس طرح دُعا کی:

---

[1] "مفردات" راغب و "قاموس اللغۃ"

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۸

" اللھم ات نفسی تقواھا ۔ انت ولیھا و مولاھا ، وزکھا انت خیر من زکاھا ؛

" خداوندا ! میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا فرما ، تو اس کا ولی و مولا ہے ، اور اس کا تزکیہ فرما کیونکہ تو بہترین تزکیہ کرنے والا ہے " [1]

یہ گفتگو اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ اس پر پیچ و خم راہ کو عبور کرنا اور اس دشوار گزار گھاٹی سے گزرنا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کے لیے بھی توفیق الٰہی کے بغیر ممکن نہیں ہے ، یعنی بندوں کی طرف سے قدم اٹھانے اور خدا کی طرف سے تائیدات کے ذریعے ۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دو آیات کی تفسیر میں فرمایا :

" افلحت نفس زکاھا اللہ ، وخابت نفس خیبھا اللہ من کل خیر ! " :

" جس نفس کا خدا نے تزکیہ کیا وہ نجات پا گیا ، اور جس نفس کو خدا نے خیر سے محروم کر دیا وہ ناامید و محروم ہو گیا " [2]

چند نکات

۱۔ قرآنی قسموں کا ان کے نتائج کے ساتھ ربط

ان گیارہ انتہائی اہم قسموں کا ، اس حقیقت کے ساتھ جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے ، کیا رابطہ ہے ؟

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس حقیقت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ میں نے تم انسانوں کی سعادت و خوش بختی کے لیے تمام مادی و معنوی وسائل فراہم کیے ہیں ۔

ایک طرف تو سورج اور چاند کے نور اور روشنی سے تمہاری زندگی کے میدان کو روشن کر دیا ہے اور تمہارے رات دن کے حرکت و سکون کے نظام کو منظم کر کے زمین کو تمہاری زندگی کے لیے ہر جہت سے آمادہ کیا ہے ۔

دوسری طرف تمہاری روح کو تمام صلاحیتوں کے ساتھ خلق کیا ہے ۔ بیدار وجدان تمہیں عطا کیا ہے ، اور اشیا کے حسن و قبح کا تمہیں الہام کیا ہے ۔ اس بنا پر سعادت کی راہ کو طے کرنے کے لیے تمہارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے ۔ اس حال میں تم اپنے نفس کا تزکیہ کیوں نہیں کرتے ؟ اور شیطان کے بہکائے میں کیوں آتے ہو ؟

۲۔ سورج کا عالم حیات میں نقش و اثر

سورج کے بارے میں جو نظام شمسی کا مرکز ہے اور اس کے کواکب کا رہبر و سالار ہے ، دو مباحث ہیں ، ایک تو اس کے عظیم

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۸

[2] درالمنثور جلد ۶ ص ۳۵۷

ہونے کی بحث جس کے بارے میں ہم پہلے بحث کر چکے ہیں' اور دُوسری بحث اس کی برکتوں اور آثار کے بارے میں ہے، جس کے لیے خلاصہ کے طور پر اس طرح کہا جا سکتا ہے ۔

۱۔ انسان اور دوسرے تمام زندہ موجودات کی زندگی کے لیے پہلے مرحلہ میں حرارت اور روشنی کی ضرورت ہے، زندگی کے یہ دونوں امور اس آتشیں کُرہ کے ذریعے کامل طور پر اعتدال کے ساتھ مہیا ہوئے ہیں۔

۲۔ تمام غذائی اشیاء سُورج کی روشنی کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ موجودات جو سمندروں کی گہرائیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں ایسی نباتات سے استفادہ کرتے ہیں' جو سمندروں کی سطح پر نورِ آفتاب کے سایہ میں اور پانی کی موجوں کے درمیان پرورش پاتے ہیں اور نیچے بیٹھ جاتے ہیں۔ یا اگر زندہ موجودات ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں تو پھر بھی ان میں سے ایک گروہ کی غذا نباتات ہی ہے، جو سُورج کی روشنی کے بغیر پرورش نہیں پاتی۔

۳۔ وہ تمام رنگ' زیبائیاں اور جلوے' جنہیں ہم عالم طبیعات میں دیکھتے ہیں، ایک طرح سے سُورج کی چمک کے ساتھ ارتباط رکھتے ہیں اور یہ معنی مختلف علوم کے ذریعے خصوصاً فزکس میں ثابت ہو چکے ہیں۔

۴۔ حیات بخش بارشیں بادلوں سے برستی ہیں' اور بادل وہی بُخارات ہیں جو سمندروں کی سطح پر سُورج کے چمکنے سے وجود میں آتے ہیں' اس بنا پر پانی کے تمام منابع جو بارش سے غذا حاصل کرتے ہیں' چاہے وہ دریا ہوں یا چشمے، نہریں ہوں یا کھال' یا گھر کے کنویں' سب سُورج کی روشنی کی برکات سے ہیں۔

۵۔ وُہ ہوائیں جن کا کام فضا کو معتدل کرنا، بادلوں کو مختلف جگہوں تک پہنچانا، نباتات کی تلقیح اور پیوند لگانا، اور گرمی اور سردی کو گرم علاقوں سے سرد علاقوں کی طرف، اور سرد علاقوں سے گرم علاقوں کی طرف منتقل کرنا ہے۔ آفتاب کے نور اور روشنی کے زیرِ اثر رُوئے زمین کے مختلف منطقوں کے درجہ حرارت کے بدلنے سے وجُود میں آتی ہیں۔ اور اس طرح سے وُہ بھی سُورج سے سرمایہ حاصل کرتی ہیں۔

۶۔ انرجی پیدا کرنے والے مادّے اور منابع، چاہے وہ آبشاریں ہوں' یا وہ بڑے بڑے بند ہوں' جنہیں کوہستانی علاقوں میں بنایا جاتا ہے، پٹرول اور تیل کے منابع، اور پتھر کے کوئلے کی کانیں، یہ سب کے سب ایک طرح سے سُورج کے ساتھ پیوند رکھتے ہیں، کہ اگر وہ نہ ہوتا تو ان منابع میں سے کوئی بھی موجود نہ ہوتا اور صفحۂ زمین میں تمام حرکتیں سکوت میں بدل جاتیں۔

۷۔ نظامِ شمسی کی بقاء جاذبہ و دافعہ کے اعتدال کی بنا پر ہے، جو ایک طرف تو کُرۂ آفتاب کے درمیان اور دوسرے ان سیاروں کے درمیان' جو اس کے گرد گردش کرتے ہیں' وجود رکھتا ہے۔ اس طرح سے سُورج ان سیاروں کے اپنے مداروں میں محفوظ رہنے میں بہت ہی مؤثر نقش و اثر رکھتا ہے۔

اِس ساری گفتگو سے معلوم ہو جاتا ہے، کہ اگر خدا نے پہلی قسم کی ابتداء سُورج سے کی ہے، تو اس کی کیا وجہ تھی ؟

اسی طرح سے چاند اور دن کی روشنی، اور رات کی تاریکی کُرۂ زمین میں سے ہر ایک انسان اور غیر انسان کی زندگی میں ایک اہم نقش و اثر رکھتے ہیں اسی بنا پر ان کی قسم کھائی گئی ہے اور ان سب سے بڑھ کر انسان کی رُوح اور اس کا جسم ہے، جو ان سب سے زیادہ اسرار آمیز اور حیرت انگیز ہے۔ تہذیبِ نفس کے بارے میں ہم اس سُورہ کے آخر میں ایک بحث کریں گے۔

١١۔ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ۝

١٢۔ إِذِ انبَعَثَ أَشْقَاهَا ۝

١٣۔ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ۝

١٤۔ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا ۖ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا ۝

١٥۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ۝

ترجمہ

١١۔ قوم ثمود نے سرکشی کی وجہ سے (اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی۔

١٢۔ جب ان میں سے کسی ایک کا شقی ترین اُٹھ کھڑا ہوا۔

١٣۔ اور خدا کے بھیجے ہوئے رسُول (صالح) نے ان سے کہا: اللہ کے ناقے کو اس کے پانی پینے کے لیے چھوڑ دو (اور اس کی مزاحمت نہ کرو)۔

١٤۔ لیکن اُنہوں نے اس کی تکذیب کی، اور ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں، اور اُسے ہلاک کر دیا، لہٰذا ان کے خُدا نے انہیں اس گناہ کی بنا پر جس کے وُہ مرتکب ہوئے تھے تباہ کر دیا، اور ان کی زمین کو ہموار کر دیا۔

١٥۔ اور وُہ ہرگز اس کام کے انجام دینے سے نہیں ڈرتا۔

تفسیر

سرکشوں کا ہلاکت خیز انجام

اس تنبیہ کے بعد، جو گزشتہ آیات میں ان لوگوں کے انجام کے بارے میں آئی تھی، جو اپنے نفس کو آلودہ کرتے ہیں، ان آیات میں نمونہ کے طور پر اس مطلب کی ایک واضح تاریخی مثال کو پیش کیا ہے اور سرکش قوم (ثمود) کی سرنوشت کو قاطع اور پُرمعنی عبارتوں کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "قوم ثمود نے سرکشی کی وجہ سے (اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی"۔ (کذبت ثمود بطغواها)۔

"طغوٰی" اور "طغیان" دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، اور وہ حد اور سرحد سے تجاوز کرنا ہے اور یہاں حدودِ الٰہی سے تجاوز کرنا اور اس کے فرامین کے مقابلہ میں سرکشی کرنا مراد ہے۔[1]

قوم ثمود، جن کے پیغمبر کا نام "صالح" تھا قدیم ترین اقوام میں سے ہے، جو "حجاز" اور "شام" کے درمیان ایک کوہستانی علاقے میں رہتی تھی۔ ان کی زندگی مرفہ الحال تھی، زمینیں آباد، ہموار میدان اور زراعت کے لیے عمدہ مٹی، شان و شوکت والے محلات اور مضبوط و مستحکم گھر رکھتے تھے۔ لیکن نہ صرف یہ کہ ان سب نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے تھے، بلکہ سرکشی کرتے ہوئے اپنے پیغمبر صالح علیہ السلام کی تکذیب کے لیے کھڑے ہوگئے، آیاتِ الٰہی کا مذاق اُڑایا اور آخر کار خدا نے انہیں ایک آسمانی بجلی کے ذریعے نابود کردیا۔

اس کے بعد اس قوم کی ایک ظاہری سرکشی کا نمونہ پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: جب کہ ان کا ایک شقی ترین آدمی اُٹھ کھڑا ہوا: (اذ انبعث اشقاها)۔

"اشقٰی" اس قوم کے شقی ترین اور سنگ دل ترین آدمی کے معنی میں ہے جو اس شخص کی طرف اشارہ ہے جس نے ناقۂ صالحؑ کو ہلاک کیا تھا، وہی اونٹنی (ناقہ) جو ایک معجزہ کے طور پر اس قوم کے درمیان ظاہر ہوئی تھی اور اس کو ہلاک کرنا اس پیغمبرِ الٰہی کے ساتھ اعلانِ جنگ تھا۔

مفسرین اور مؤرخین کے قول کے مطابق اس شخص کا نام "قدار بن سالف" تھا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ اکرم نے علیؑ سے فرمایا: "من اشقی الاولین"؟

"پہلی قوموں میں سب سے زیادہ شقی اور سنگ دل کون تھا"؟

علی علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا:

"عاقر الناقة"

"وہ شخص جس نے ناقۂ ثمود کی کونچیں کاٹ کر ہلاک کردیا تھا"۔

پیغمبرؐ نے فرمایا:

---

[1] بعض علماء لغت کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ "طغیان" ناقص واوی کی صورت میں بھی آیا ہے اور اور ناقص پائی کی صورت میں بھی۔ "طغوی" ناقص واوی کے مادہ سے لیا گیا ہے، اور "طغیان" ناقص پائی سے (غور کیجئے)

"صدقت، فمن اشقی الاٰخرین"؟:

"تم نے سچ کہا۔ آخری اقوام کا شقی ترین آدمی کون ہے؟

علی علیہ السلام کہتے ہیں: میں نے کہا اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے معلوم نہیں ہے، تو پیغمبرؐ نے فرمایا:

"الذی یضربك علی هذه، و اشار الی یافوخه"

"جو شخص تیرے سر کے اس مقام پر تلوار کی ضرب لگائے گا" اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کی پیشانی کے اُوپر والے حصہ کی طرف اشارہ کیا۔[1][2]

بعد والی آیت میں قوم ثمود کی سرکشی کے بارے میں مزید تشریح پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اللہ کے رسول (حضرت صالحؑ) نے ان سے کہا: خدا کے ناقہ کو اس کا پانی پینے کے لیے آزاد چھوڑ دو اور اس کی مزاحمت نہ کرو"۔ (فقال لهم رسول الله ناقة الله وسقیاها)[3]

یہاں "رسول اللہ" سے مُراد قوم ثمود کے پیغمبر، حضرت صالحؑ ہیں، اور ناقة الله (وہ اونٹنی جو خدا کی طرف منسوب ہے) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اُونٹنی کوئی معمولی اُونٹنی نہیں تھی۔ بلکہ صالح علیہ السلام کے دعویٰ کی صداقت کی ایک گویا و ناطق سند اور معجزہ کے عنوان سے بھیجی گئی تھی۔ مشہور روایت کے مطابق اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مذکورہ اونٹنی پہاڑ کے ایک پتھر کے اندر سے نکلی تھی تاکہ وہ ہٹ دھرم منکرین کے لیے ایک گویا و ناطق معجزہ ہو۔

قرآن مجید کی دوسری آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں یہ خبر دی تھی کہ بستی کے پینے کا پانی ان کے اور ناقہ کے درمیان تقسیم ہو۔ ایک دن تو ناقہ کے لیے ہوگا اور ایک دن بستی والوں کے لیے ہوگا، اور ان میں سے ہر ایک اپنی باری پر پانی سے فائدہ اُٹھائے گا، اور ایک دوسرے کے لیے مزاحم نہیں ہوگا:

"ونبئهم ان الماء قسمة بینهم کل شرب محتضر" (قمر۔ ۲۸)

اور انہیں خصوصیت کے ساتھ بتلا دیا گیا: اگر تم نے اس ناقہ کو بلا وجہ لگایا تو عذابِ الٰہی تمہارے دامن گیر ہو جائے گا:

ولا تمسوها بسوء فیأخذکم عذاب یوم عظیم" (شعرا۔ ۱۵۶)

اور بعد والی آیت میں فرماتا ہے: اس سرکش قوم نے اس عظیم پیغمبر کے کلمات اور اس کی تنبیہات کی کوئی پرواہ نہ کی، اس کی تکذیب کی اور ناقہ کو ہلاک کر دیا" (فکذبوه فعقروها)۔

"عقروها" "عقر" کے مادہ سے (جو ظلم کے وزن پر ہے) کسی چیز کی اصل اور جڑ، بنیاد کے معنی میں ہے، اور عقر ناقہ کا

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۹۹، یہی معنی کچھ مختصر صورت میں تفسیر قرطبی میں بھی آیا ہے، جلد ۶ ص ۷۱۶۸

[2] "یافوخ" سر کے اس اگلے حصہ کو کہا جاتا ہے، جو بچوں میں بالکل نرم ہوتا ہے، اور آہستہ آہستہ ہڈی کی صورت اختیار کرتا ہے اور مضبوط ہوتا ہے، اور وہ سر کا حساس ترین مقام ہے۔

[3] "ناقة الله" منصوب ہے، ایک فعل محذوف سے اور تقدیر میں اس طرح ہے، ذروا ناقة الله وسقیاها، اس کے مشابہ کہ جو سورۂ اعراف کی آیہ ۷۳ اور سورۂ ھود کی آیہ ۶۴ میں آیا ہے۔

معنی اس کی جڑ کاٹنے اور ہلاک کرنے کے معنی میں ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد اس کی کونچیں یعنی اس جانور کے پاؤں کے نچلے حصہ کو کاٹنا اور اُسے زمین پر پھینکنا ہے کہ اس کا نتیجہ بھی اس حیوان کی موت ہی ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جس شخص نے ناقہ کو ہلاک کیا تھا وہ صرف ایک ہی تھا جسے قرآن نے "اشقی" سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اُوپر والی آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس عمل کی قوم ثمود کے تمام سرکشوں اور طغیان گروں کی طرف نسبت دی گئی ہے، اور "عقروھا" جمع کے صیغہ کی صُورت میں آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس طرح سے اس کام میں حصہ دار تھے، کیونکہ اولاً اس قسم کی سازشیں عموماً گروہ اور جمعیت کے توسط سے پیش ہوتی ہیں۔ اس کے بعد معین آدمی یا چند افراد کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ ثانیاً چونکہ دوسروں کی رضا اور خوشنودی سے انجام پاتی ہیں تو وہ ان کی اس کام میں شرکت کا سبب بن جاتا ہے، یعنی رضامندی نتیجہ میں شرکت کا سبب بنتی ہے۔

اسی لیے امیرالمومنین علی علیہ السلام کے فصیح و بلیغ کلام میں آیا ہے:

"انما عقر ناقة ثمود رجل واحد فعمهم الله بالعذاب، لما عموه بالرضى، فقال سبحانه:

فعقروها فاصبحوا نادمين:

"ناقہ ثمود کو صرف ایک ہی شخص نے ہلاک کیا تھا، لیکن خدا نے عذاب میں سب کو شامل کیا ہے کیونکہ وہ سب اس امر پر راضی تھے، اسی لیے فرماتا ہے:

"ان (سب نے) ناقہ کو ہلاک کیا، اور اس کے بعد وہ سب سے سب اپنے کیے پر نادم ہوئے"۔ (لیکن اس وقت جب پشیمانی کا کوئی فائدہ نہیں تھا)[1]

اس تکذیب اور شدید مخالفت کے بعد خدا نے انہیں ایسی سزا دی کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا، جیسا کہ اسی آیت کو جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے: "ان کے پروردگار نے ان کے اس گناہ کی بنا پر جس کے وہ مرتکب ہوئے تھے سب کو نابود کر دیا، اور ان کی سرزمین کو صاف اور ہموار بنا دیا"۔ (فدمدم عليهم ربهم بذنبهم فسواها)۔

صاعقہ یعنی اسی عظیم آسمانی چیخ نے چند ہی لمحہ کے اندر اندر ان کی سرزمین کو ہلا کر رکھ دیا اور ایسا زلزلہ پیدا کیا کہ ان کے سارے کے سارے مکانات زمیں بوس ہوگئے، اور ان کے گھروں کو ان کی قبروں میں بدل کر رکھ دیا۔

"دمدم" "دمدمة" کے مادہ سے، کبھی تو ہلاک کرنے کے معنی میں آیا ہے، اور کبھی عذاب اور مکمل سزا کے معنی میں، بعض اوقات کوٹنے اور نرم کرنے کے معنی میں آیا ہے، اور کبھی جڑ سے اُکھاڑنے کے معنی میں، اور کبھی غضب ناک ہونے کے معنی میں یا احاطہ کرنے اور گھیر لینے کے معنی میں[2] اور زیر بحث آیت میں یہ سب معانی صادق آتے ہیں کیونکہ اس وسیع عذاب کا سرچشمہ

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۰۱۔

[2] مفرداتِ راغب، لسان العرب، مجمع البیان اور تفسیر کی دوسری کتابیں۔

غضب الٰہی ہے، اور ان سب کی اس نے سرکوبی کی، انہیں کمزور کیا اور انہیں جڑ سے اُکھاڑ پھینکا۔

"سوّاھا" "تسویہ" کے مادہ سے، ممکن ہے کہ صیحہ عظیم اور صاعقہ و زلزلہ کی وجہ سے ان کے گھروں کا صفایا کرنے اور ان کی زمینوں کو صاف کرنے کے معنی میں ہو، یا اس گروہ کو ایک طرف ٹھکانے لگانے کے معنی میں ہو، یا ان سب کی سزا و عذاب میں مساوات کے لیے ہو اس طرح سے کہ ان میں سے کوئی بھی اس ماجرے سے صحیح و سالم نہ بچا۔

ان معانی کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

"سوّاھا" میں ضمیر "قبیلہ" ثمود کی طرف لوٹتی ہے، یا ان کے شہروں اور آبادیوں کی طرف، جنہیں خدا نے مٹی میں ملا کر یکساں کر دیا۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ "دمدم" کی طرف لوٹتی ہے جو بعد والے جملہ سے معلوم ہوتی ہے، یعنی خدا نے اس خشم و غضب و ہلاکت کو ان کے درمیان یکساں قرار دیا، اس طرح سے کہ تمام کو اس نے گھیر لیا۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سزا اور عذاب ان کے گناہ کا نتیجہ، اور اس کے ساتھ مناسبت رکھتا تھا اور یہ عین عدالت و حکمت ہے۔

بہت سی اقوام کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ وہ آثارِ عذاب کے ظہور کے وقت پشیمان ہوگئیں، اور توبہ کی راہ اختیار کرلی، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ جس وقت صالح علیہ السلام کی قوم نے عذاب کی نشانیاں دیکھیں تو وہ صالح علیہ السلام کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے کہ جہاں کہیں بھی وہ مل جائیں انہیں ہلاک کر دیں[1] اور یہ خدا و پیغمبر کے مقابلہ میں ان کے عصیان و سرکشی کے شدید ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن خدا نے صالح علیہ السلام کو نجات دی اور اس قوم کو ہلاک کر دیا، اور ان کی زندگی کے دفتر کو کلی طور پر لپیٹ دیا۔

انجام کار آخری آیت میں ان تمام لوگوں کو جو اسی راستہ پر چلتے ہیں، سخت تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور خدا کو اس کام کے انجام کا کوئی خوف نہیں ہے" (ولا یخاف عقباھا)۔

بہت سے ایسے حاکم ہیں جو سزا دینے پر قدرت رکھتے ہیں، لیکن وہ ہمیشہ اس کے نتیجہ اور انجام سے ڈرتے رہتے ہیں، ان کے ردِ عمل اور عکس العمل سے خوف زدہ رہتے ہیں اور اسی بنا پر اپنی قدرت سے فائدہ نہیں اُٹھاتے، اور زیادہ صحیح تعبیر میں ان کی قدرت ضعف و ناتوانی کے ساتھ اور ان کا علم جہالت کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے کیونکہ وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ان میں اس کے بُرے نتائج کے مقابلہ کی طاقت نہ ہو۔

لیکن خداوند قادر و متعال جس کا علم ان تمام امور اور ان کے عواقب و آثار پر احاطہ رکھتا ہے، اور اس کی قدرت میں حوادث کے بُرے نتائج کے مقابلہ میں کسی قسم کے ضعف و ناتوانی کی آمیزش نہیں ہوتی۔ اور اسی بنا پر انتہائی قدرت اور قاطعیت کے ساتھ جس چیز کا اِرادہ کرتا ہے اُسے انجام دے دیتا ہے۔

سرکشوں کو بھی اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی، لہٰذا انہیں اپنے اعمال کی وجہ سے خدا کے خشم و غضب کا مشمول ہونے سے

---

[1] رُوح البیان جلد ۱۰ ص ۴۴۶

خود کو بچانا چاہیئے۔

"عقبیٰ" اختتام، انتہا اور انجام کار کے معنی میں ہے اور "عقباھا" کی ضمیر "دمدمہ" اور ہلاکت کی طرف لوٹتی ہے۔

چند نکات

۱۔ قوم ثمود کی سرگزشت کا خلاصہ

قوم "ثمود" جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، مدینہ اور شام کی درمیانی سرزمین میں (جس کا نام وادی القریٰ ہے) زندگی بسر کرتی تھی۔ ان کا دین و مذہب بت پرستی تھا اور وہ انواع و اقسام کے گناہوں میں ملوث تھے۔ خدا کے عظیم پیغمبر صالح ان میں مبعوث ہوئے اور ان کی ہدایت اور نجات کے لیے کمر ہمت باندھی، لیکن نہ تو یہ لوگ بت پرستی سے دست بردار ہوئے اور نہ ہی انہوں نے سرکشی اور گناہ کے بارے میں اپنا نظریہ بدلا۔

جب انہوں نے معجزہ کا تقاضا کیا تو خدا نے ایک ناقہ (اونٹنی) اعجاز آمیز اور خارق العادۃ طریقے سے پہاڑ کے اندر سے نکالی لیکن اس بنا پر کہ اس بارے میں ان کی آزمائش کرے یہ حکم دیا کہ اس بستی کا ایک دن کا سارا پانی اس اونٹنی کے لیے رہے گا اور دوسرے دن کا پانی وہ خود استعمال کریں گے، یہاں تک کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ جس دن وہ پانی سے محروم ہوتے تھے تو اس اونٹنی کے دودھ سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ لیکن یہ عظیم معجزہ بھی ان کی ہٹ دھرمی اور فسق و فجور میں کمی نہ کر سکا۔ لہٰذا انہوں نے ناقہ کو نابود کرنے کا منصوبہ بنایا اور حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کا بھی، کیونکہ وہ انہیں اپنی خواہشات اور ہوا و ہوس میں مزاحم سمجھتے تھے۔

ناقہ کی نابودی کا منصوبہ ایک بہت ہی بے رحم اور شقی آدمی "قدار بن سالف" کے ذریعے عمل میں آیا اور اس نے کئی ضربوں کے ساتھ ناقہ کو زمین پر ڈھیر کر دیا۔

یہ بات حقیقت میں خدا کے ساتھ اعلانِ جنگ تھی، کیونکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ناقہ کو ختم کر دینے سے، جو صالح علیہ السلام کا معجزہ تھی، نورِ ہدایت کو خاموش کر دیں گے۔ اس موقع پر حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ تین دن تک اپنے گھروں میں جس نعمت سے لذت حاصل کرنا چاہیں کر لیں، لیکن وہ اچھی طرح جان لیں کہ تین دن کے بعد عذاب الٰہی سب کو گھیر لے گا۔ (سورہ ھود)

یہ تین دن آخری غور و فکر کے لیے ایک مہلت تھی اور توبہ و بازگشت کے لیے ایک آخری فرصت۔ لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ تجدید نظر نہیں کی، بلکہ ان کے طغیان و سرکشی میں اضافہ ہو گیا۔ اس موقع پر عذاب الٰہی ان پر نازل ہوا اور "صیحہ آسمانی"[1] نے ان کی سرزمین کو درہم و برہم کر کے رکھ دیا اور وہ سب کے سب اپنے گھروں میں زمین پر اوندھے گر پڑے اور مر گئے" "و اخذ الذین ظلموا الصیحۃ فاصبحوا فی دیارھم جاثمین" (ھود - ۶۷)۔

---

[1] صیحہ آسمانی جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے "صاعقہ" کے معنی میں ہے جو ایک عظیم آواز بھی رکھتی ہے اور سخت قسم کا زلزلہ بھی پیدا کرتی ہے، اور آگ اور جلانے کے ساتھ توام ہوتی ہے اور علمی نظریہ کے مطابق ایک عظیم برقی شعلہ ہے، جو بادلوں کے درمیان جو مثبت برقی بار کے حامل ہوتے ہیں اور زمین جو منفی بار رکھتی ہے، وجود میں آتا ہے۔

وُہ ایسے نابُود ہوئے ، اور ان کی سرزمین اس طرح خاموش ہوئی کہ گویا ہرگز اِن گھروں میں کوئی رہتا ہی نہیں تھا۔ لیکن خدا نے صالحؑ اور ان کے مومن اصحاب کو اس مہلکہ سے نجات بخشی "۔ (ھود - ۶۶)۔

قوم ثمود کی سرگزشت کی مزید تفصیل کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۹ ص ۱۶۱ سے آگے مطالعہ کریں۔

۲۔ "اشقی الاولین" و "اشقی الآخرین"

شیعہ وسُنی بزرگ علماء کی ایک جماعت منجملہ ثعلبی ، واحدی ، ابن مردویہ ، خطیب بغدادی ، طبری موصلی اور احمد حنبلؒ وغیرہ نے اپنی اپنی اسناد کے ساتھ عمار یاسرؓ ، جابرؓ بن سمرہ اور عثمانؓ بن صہیب کی وساطت سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح نقل کیا ہے کہ آپؐ نے علی علیہ السّلام سے فرمایا :

" یا علی ! اشقی الاولین عاقر الناقۃ ، واشقی الآخرین قاتلک ، وفی روایۃ من یخضب ھذہ من ھذا :

" اے علی ! پہلے لوگوں میں سے بدبخت ترین شخص وہ تھا جس نے ناقۂ صالح کو قتل کیا، اور پچھلے لوگوں میں سے بدبخت ترین آدمی تیرا قاتل ہے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ جو اس کو اس سے رنگین کرے گا ، (جو اس طرف اشارہ ہے کہ تیری داڑھی کو تیرے سر کے خُون سے خضاب کرے گا)"۔[1]

حقیقت میں ناقۂ صالحؑ کی کونچیں کاٹنے والے " قدار بن یوسف " اور امیر المومنین کے قاتل " عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی " کے درمیان ایک شباہت موجود تھی ، ان دونوں میں سے کسی کو بھی ذاتی رنجش نہیں تھی۔ بلکہ دونوں ہی یہ چاہتے تھے کہ نورِ حق کو خاموش کردیں۔ اور جس طرح ناقہ صالحؑ کے ماجرے کے بعد اس طاغی اور سرکش قوم کو عذابِ الٰہی نے گھیر لیا تھا ، مسلمان بھی امیر المومنین علیؑ کی مظلومانہ شہادت کے بعد جابر اور بیدادگر بنی اُمیہ کی حکومت کے زیر تسلط دردناک ترین عذابوں کے شاہد ہوئے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ " حاکم حسکانی " نے " شواھد التنزیل " میں اس سلسلے میں بہت زیادہ روایات نقل کی ہیں ، جو مضمون و مطالب کے لحاظ سے اُوپر والی روایت کے مشابہ ہیں[2]

۳۔ تہذیب نفس ایک عظیم خُدائی وظیفہ ہے

جس قدر قرآنی قسمیں کسی چیز کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں اور زیادہ محکم ہوں وہ اس موضوع کی اہمیت کی دلیل ہیں ، اور ہم جانتے ہیں کہ زیادہ طولانی اور زیادہ تاکیدی قسمیں اسی سُورہ میں ہیں ، خصوصاً خدا کی ذاتِ پاک کی قسم کا اس میں تین مرتبہ تکرار ہوا ہے۔ اور انجام کار اس مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے کہ فلاح و رستگاری تزکیہ نفس میں ہے۔ اور محرومیت اور شکست و بدبختی تزکیہ کے ترک کردینے میں ہے۔

حقیقت میں انسانی زندگی کا اہم ترین مسئلہ بھی یہی مسئلہ ہے۔ اور حقیقتاً قرآن نے اُوپر والے معنی کے ساتھ مفہوم کو واضح کردیا ہے کہ

---

[1] " تفسیر نور الثقلین " جلد ۵ ص ۵۸۷

[2] " شواہد التنزیل " جلد ۲ ص ۲۳۵ تا ۲۴۲

انسان کی نجات و رست گاری تصورات اور خیالوں کی مرہونِ منت نہیں ہے، نہ ہی مال و ثروت اور مقام و منصب کے سایہ میں اور نہ ہی دوسرے اشخاص کے اعمال کے ساتھ وابستہ ہے۔ (جیسا کہ عیسائی خیال کرتے ہیں کہ ہر شخص کی نجات عیسیٰ مسیح کی فداکاری کی مرہونِ منت ہے) اور نہ ہی اس قسم کی دُوسری باتوں میں۔

بلکہ نجاتِ انسانی ایمان و عملِ صالح کے سایہ میں رُوح و جان کی پاکیزگی اور بلندی کی مرہونِ منت ہے۔

انسان کی بدبختی اور شکست بھی نہ تو اجباری قضا و قدر میں ہے، اور نہ ہی الزامی سرنوشتوں میں، اور نہ ہی دوسروں کے کیے ہوئے کاموں میں، بلکہ وہ صرف اور صرف گناہ کی آلودگی سے بچے رہنے میں ہے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرنے میں ہے۔

تاریخوں میں آیا ہے کہ عزیزِ مصر کی بیوی (زلیخا) نے، جب یوسفؑ خزانوں کے مالک اور سرزمینِ مصر کے حاکم بن گئے، ان سے ملاقات کی اور کہا:

"ان الحرص والشهوة تصير الملوك عبيدًا، وان الصبر والتقوى يصير العبيد ملوكًا، فقال يوسف قال الله تعالى: انه من يتق ويصبر فان الله لا يضيع اجر المحسنين"۔

"حرص و شہوت بادشاہوں کو غلام بنا دیتے ہیں اور صبر و تقویٰ غلاموں کو بادشاہ بنا دیتے ہیں" یوسف نے اس کی بات کی تصدیق کی، اور یہ کلام الٰہی اُسے یاد دلایا: "جو شخص تقویٰ اور صبر و شکیبائی اختیار کرے گا تو خدا نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا"۔[1]

یہی مطلب ایک دوسری عبارت میں نقل ہوا ہے کہ عزیزِ مصر کی بیوی ایک راہ گزر میں بیٹھی ہوئی تھی کہ یوسفؑ کی سواری وہاں سے گزری، تو زلیخا نے کہا:

"الحمد لله الذى جعل الملوك بمعصيتهم عبيدًا، وجعل العبيد بطاعتهم ملوكًا":

"سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں کہ جس نے بادشاہوں کو معصیت اور نافرمانی کی بنا پر غلام بنا دیا، اور غلاموں کو اطاعت و فرماں برداری کی وجہ سے بادشاہ"۔[2]

ہاں نفس کی بندگی انسان کی غلامی کا سبب ہے، اور تقویٰ و تہذیبِ نفس عالمِ ہستی پر حکومت کرنے کا سبب ہے۔

ایسے افراد کتنے زیادہ ہیں جو خدا کی بندگی اور اطاعت کی وجہ سے ایسے بلند مقام تک پہنچے ہیں کہ ولایتِ تکوینی کے مالک بن گئے، خدا کے اذن سے اس عالم کے حوادث میں اثر انداز ہو سکتے ہیں اور کرامات و خوارق عادات پر دسترس رکھ سکتے ہیں۔

خداوندا! ہوائے نفس کے ساتھ مبارزہ کرنے میں تو ہماری مدد اور نصرت فرما۔

پروردگارا! تُو نے ہمیں "فجور" و "تقویٰ" کا الہام کیا ہے۔ ہمیں اس الہام سے فائدہ اُٹھانے کی توفیق عنایت فرما۔

---

[1] "محجة البيضاء" جلد ۵ ص ۱۱۶

[2] گزشتہ ماخذ ص ۱۱۷

بارِ الٰہا ! شیطان کے مکر و فریب انسان کے نفس میں مخفی و پوشیدہ ہیں، ہمیں ان مکروں کی شناخت سے آشنا کردے!

آمین یا ربّ العالمین

سورہ "الشمس" کا اختتام

اختتام ترجمہ قم منزل خود

۸ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ ۸ بجے صبح

سُورَۃُ اللَّیل

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہُوا۔
❖ اِس کی ۲۱ آیات ہیں۔

سُورۂ "اللیل" کے مضامین اور اس کی فضیلت

یہ سُورہ جو مکی سُورتوں میں سے ہے اور مکی سُورتوں کی خصوصیات کا حامل ہے، مختصر آیات کے ٹکڑوں میں ہے، لیکن ان کے مضامین گرما گرم اور تیز ہیں، اور زیادہ تر قیامت، خدائی جزا و سزا اور اس کے عوامل و اسباب کے بارے میں ہیں۔

ابتدا میں تین قسموں کو ذکر کرنے کے بعد لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے،

۱۔ تقویٰ کے ساتھ انفاق کرنے والے۔

۲۔ وہ بخیل جو قیامت کے اُجر و پاداش کے منکر ہیں۔ پہلے گروہ کا انجام کار خوش بختی اور راحت و آرام ہے جب کہ دُوسرے گروہ کا انجام کار سختی، تنگی اور بدبختی ہے۔

اس سُورہ کے دوسرے حصّہ میں اس معنی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہ بندوں کو ہدایت کرنا خدا کا کام ہے، سب لوگوں کو دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرایا ہے۔

اور آخری حصّہ میں، ان لوگوں کے، جو اس آگ میں جلیں گے، اور اس گروہ کے، جو اس سے نجات پائیں گے، اوصاف بیان کرتے ہُوئے تعارف کرایا ہے۔

اِس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"من قرأها اعطاه الله حتی یرضی، وعافاه من العسر ویسر له الیسر"[1]:

"جو شخص اس سُورہ کی تلاوت کرے گا خدا اُسے اس قدر عطا کرے گا کہ وہ راضی اور خوش ہو جائے گا، اور اُسے سختیوں سے نجات دے گا اور زندگی کی راہوں کو اس کے لیے آسان کر دے گا۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

١۔ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۙ
٢۔ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ
٣۔ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ۙ
٤۔ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ؕ
٥۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۙ
٦۔ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ
٧۔ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ؕ
٨۔ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ
٩۔ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ
١٠۔ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ؕ
١١۔ وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ؕ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خُدا کے نام سے

۱۔ قسم ہے رات کی جب کہ وُہ عالم کو ڈھانپ لے ۔
۲۔ اور قسم ہے دن کی جب کہ وہ تجلّی کرے ۔
۳۔ اور قسم ہے اس کی جس نے مذکّر و مؤنث پیدا کیے ۔
۴۔ کہ تمہاری سعی و کوشش مختلف ہے ۔
۵۔ پس وُہ شخص کہ جو (راہِ خُدا میں انفاق کرے اور پرہیزگاری) اختیار کرے ۔
۶۔ اور (خدا کی) نیک جزا کی تصدیق کرے ۔
۷۔ ہم اس کی راہوں کو آسان بنا دیں گے ۔
۸۔ لیکن جو شخص بُخل کرے، اور اس طریقہ سے بے نیاز ہونا چاہے ۔
۹۔ اور (خُدا کی) اچھی جزاؤں کی تکذیب کرے ۔
۱۰۔ ہم عنقریب اس کی راہوں کو دُشوار بنا دیں گے ۔
۱۱۔ اور جس وقت وہ (جہنّم یا قبر میں) گرے گا تو اس کے اموال اس کی حالت کے لیے مُفید نہیں ہوں گے ۔

سُورۂ "اللیل" کا شانِ نزول

مفسّرین نے اس سالم سُورہ کے لیے ابنِ عباسؓ سے ایک شانِ نزول نقل کی ہے۔ ہم اس شانِ نزول کو مرحوم طبرسی کی "مجمع البیان" سے نقل کرتے ہیں :

مُسلمانوں میں سے ایک شخص کے کھجور کے درخت کی ایک شاخ ایک فقیر عیال دار کے گھر کے اُوپر پہنچی ہوئی تھی۔ کھجور والا جب

خرمے اتارنے کے لیے درخت پر چڑھتا تو بعض اوقات خرمے کے کچھ دانے اس فقیر آدمی کے گھر میں جا گرتے، اور اس کے بچے انہیں اُٹھا لیتے. وہ شخص کھجور کے درخت سے اُتر کر خرمے ان سے چھین لیتا، (اور وہ اتنا بخیل اور سنگدل تھا کہ) اگر ان میں سے کسی کے مُنہ میں بھی خرمہ کا دانہ دیکھتا تو اس کے منہ میں اُنگلی ڈال کر نکال لیتا۔ اس مرد فقیر نے پیغمبرؐ کی خدمت میں شکایت کی۔ حضور نے فرمایا: تم جاؤ میں تمہارا یہ کام کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے کھجور والے سے ملاقات کی اور فرمایا یہ درخت جس کی شاخیں فلاں گھر کے اُوپر پہنچی ہوئی ہیں، مجھے دے دے تاکہ اس کے مقابلہ میں جنت میں ایک درخت ہو۔ اس نے کہا میرے پاس کھجور کے بہت سے درخت ہیں لیکن کسی کے خرمے اس درخت جیسے اچھے نہیں ہیں۔ (لہٰذا میں یہ سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں)۔

اصحاب پیغمبر میں سے کسی نے یہ گفتگو سُن لی۔ اس نے عرض کیا: اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر میں جا کر یہ درخت اس شخص سے خرید لوں اور آپ کو دے دوں تو آپؐ وہی چیز جو اس کو دے رہے تھے مجھے عطا فرمائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں!

اس شخص نے جا کر درخت والے سے ملاقات کی اور اس سے اس سلسلہ میں بات کی۔ کھجور کے مالک نے کہا کیا تجھے معلوم ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے بدلے میں جنت میں کھجور کا ایک درخت مجھے دینے کے لیے تیار تھے۔ (لیکن میں نے قبول نہیں کیا) اور میں نے انہیں یہ کہہ دیا کہ میں اس کے خرموں سے بہت لذت اندوز ہوتا ہوں، میرے پاس بہت سے کھجور کے درخت ہیں لیکن کسی کے خرمے اتنے اچھے نہیں ہیں۔

خریدار نے کہا: کیا تو اسے بیچنا چاہتا ہے یا نہیں؟ اس نے کہا: میں اسے نہیں بیچوں گا، مگر صرف اس صورت میں کہ تو اتنی رقم مجھے دے کر کوئی بھی اتنی رقم نہیں دے گا۔ اس نے کہا: تو کتنی رقم لینا چاہتا ہے؟ اس نے کہا چالیس درخت۔

خریدار نے تعجب کرتے ہوئے کہا: تو ایسے کھجور کے درخت کی جو بیڑھا ہو چکا ہے بہت ہی بھاری قیمت مانگتا ہے۔ چالیس کھجور کے درخت!

پھر تھوڑے سے سکوت کے بعد اس نے کہا: بہت اچھا، میں خرمے کے چالیس درخت تجھے دیتا ہوں۔

بیچنے والے (لالچی) نے کہا: اگر تو سچ کہتا ہے تو کچھ آدمیوں کو گواہی کے لیے بُلا لے! اتفاقاً کچھ لوگ وہاں سے گزر رہے تھے اس نے انہیں آواز دی اور انہیں اس معاملہ پر گواہ بنایا۔

اس کے بعد وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: "اے رسولِ خداؐ! وہ کھجور کا درخت میری ملکیت میں آگیا ہے اور میں اُسے (آپؐ کی بارگاہِ مُبارک میں) پیش کرتا ہوں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقیر کے گھر والوں کے پاس گئے اور صاحب خانہ سے کہا: "یہ کھجور کا درخت تیرا اور تیرے بچوں کا ہے۔"

اس موقع پر سورہ "واللیل" نازل ہوئی۔ (اور بخیلوں اور سخیوں کے بارے میں ان کے لائق باتیں کہیں)۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس خریدار کا نام "ابوالاحداح" تھا۔[1]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۱۔

تفسیر

تقویٰ اور خدائی امدادیں

اِس سُورہ کے آغاز میں ہم پھر تین فکر انگیز (مخلوقات اور خالقِ عالم کی) قسموں کا سامنا کر رہے ہیں، فرماتا ہے:
"قسم ہے رات کی جب کہ وہ سارے جہان کو ڈھانپ لے": (واللیل اذا یغشٰی)۔
"یغشٰی" کی تعبیر ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ رات کی تاریکی پردہ کی طرح آدھے کُرّۂ زمین پر پڑتی ہے، اور اُسے اپنے نیچے ڈھانپ لیتی ہے۔ یا اس بنا پر ہے کہ دن کا چہرہ یا آفتابِ عالمتاب کا چہرہ اس کے پہنچ جانے سے ڈھک جاتا ہے۔ بہرحال یہ رات کی اہمیت اور انسانوں کی زندگی میں اس کے اثرات کی طرف سُورج کے اعتدال سے لے کر، اس کے سائے میں تمام زندہ موجودات کے آرام و سکون اور شب زندہ دار، بیدار دل اور آگاہ افراد کے مسئلہ تک ایک اشارہ ہے۔
اس کے بعد دُوسری قسم کو بیان کرتا ہے اور مزید کہتا ہے: "اور قسم ہے دن کی جب کہ وہ آشکار و ظاہر ہو": (والنہار اذا تجلّٰی)[1]
اور یہ اس لمحہ کی بات ہے جب سپیدۂ صبح رات کے ظلماتی پردہ کو چیر دیتا ہے اور تاریکیوں کو پیچھے دھکیل کر سارے صفحۂ آسمانی پر حاکم بن جاتا ہے۔ اور ہر چیز کو نُور اور روشنی میں نہلا دیتا ہے۔ وہی نور و روشنی جو حرکت و حیات کی رمز اور تمام زندہ موجودات کی پرورش کا سبب ہے
قرآن مجید میں "نور" و "ظلمت" کے نظام کے مسئلہ اور ان کی انسانی زندگی پر تاثیر کی طرف بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے، کیونکہ یہ دو عظیم دائمی نعمتیں پروردگار کی اہم آیات میں سے دو آیتیں ہیں۔
اس کے بعد آخری قسم کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور قسم ہے اس ذات کی جس نے مذکر و مؤنث کی جنس کو پیدا کیا": (وما خلق الذکر والانثٰی)۔
کیونکہ عالمِ "انسان" و "حیوان" اور "نبات" میں ان دونوں جنسوں کا وجُود، اور وہ تغیرات جو انعقاد نطفہ سے لے کر تولد تک رُونما ہوتی ہیں، اور وہ خصوصیات و صفات جو دونوں جنسوں میں ان کی فعالیتوں اور پروگراموں کی نسبت سے پائی جاتی ہیں اور وہ بہت سے اسرار جو جنسیت کے مفہوم میں چھپے ہوئے ہیں، یہ سب عظیم عالمِ آفرینش کی نشانیاں اور آیات ہیں جن کے ذریعے ان کے پیدا کرنے والے سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔

---

[1] قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "یغشٰی" فعل مضارع کی صُورت میں ذکر ہوا ہے، لیکن "تجلّٰی" فعل ماضی کی صُورت میں ہے۔ بعض نے کہا ہے: یہ اس بنا پر ہے کہ اس زمانہ میں جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا آغاز تھا تو جاہلیت کی تاریکی نے ہر جگہ کو گھیر رکھا تھا۔ لیکن اس صُورت میں ایسی ظلمت و تاریکی کی قسم کھانا کچھ اچھا دکھائی نہیں دیتا۔ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ فعل ماضی چونکہ "اذا" شرطیہ کے بعد واقع ہوا ہے، لہٰذا فعل مضارع کا معنی دیتا ہے، یا یہ کہ اصل میں "تتجلی" تھا اور اس کی ایک "تا" حذف ہو گئی ہے، لیکن اس صُورت میں فعل مؤنث ہو جائے گا، اور پھر "نھار" (دن) اس کا فاعل نہیں ہو سکتا بلکہ پھر تقدیر میں اس طرح ہونا چاہیئے۔ "اذا تتجلی الشمس فیہ" (جب اس میں سُورج آشکار و ظاہر ہو)۔

"ما" (وہ چیز) کی تعبیر یہاں خدا کے بارے میں اس کی ذاتِ پاک کی حد سے زیادہ عظمت سے کنایہ ہے، اور یہ وُہ ابہام ہے جو اس لحاظ سے یہاں اس طرح حکم فرما ہے کہ وُہ اُسے خیال و قیاس و گمان و وہم سے برتر کر دیتا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "ما" یہاں مصدریہ ہے، تو اس بنا پر اس جملہ کا معنی یہ ہوگا: قسم ہے مذکر و مؤنث کی خلقت کی لیکن یہ احتمال بہت ضعیف نظر آتا ہے۔

حقیقت میں پہلی اور دُوسری دو قسمیں آیاتِ آفاقی کی طرف اشارہ ہیں، اور تیسری قسم آیات انفسی کی طرف اشارہ ہے۔

آخر کار ان قسموں کے ہدف کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "زندگی کے لیے تمہاری سعی و کوشش مختلف اور گوناں گوں ہے۔" (ان سعیکم لشتّٰی)۔

ان کوششوں کی سمت، اور ان کے نتائج بھی مکمل طور پر مختلف اور متفاوت ہیں، جو اس طرف اشارہ ہے کہ تم بہر حال زندگی میں سکون و آرام سے نہیں رہو گے، اور یقینی طور پر سعی و کوشش کے لیے ہاتھ پاؤں مارو گے، اور خداداد قوتوں اور توانائیوں کو، جو تمہارے وجود کا سرمایہ ہیں، کسی نہ کسی راستے میں خرچ کرو گے۔ لہٰذا اب تم خود دیکھو گے کہ تمہاری سعی و کوشش کس راستے، کس سمت اور کس نتیجہ کی حامل ہے؛ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے تمام سرمایوں اور صلاحیتوں کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ ڈالو، یا فضول محنت میں ضائع کر بیٹھو۔

"مشتی" "شتیت" کی جمع ہے جو "شت" (بروزن شط) کے مادہ سے جمعیت کو پراگندہ کرنے کے معنی میں ہے۔ اور یہاں کیفیت، مقصد کے حصول اور ان کے نتیجہ کے لحاظ سے لوگوں کی کوششوں کے اختلاف کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کی خصوصیات کو شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے: "پس وہ شخص جو راہِ خدا میں بخشش کرے اور پرہیزگاری اختیار کرے"۔ (فاما من اعطٰی واتقٰی)۔

"اور خدا کی اچھی جزا پر ایمان رکھتا ہو" (وصدق بالحسنٰی)۔

"ہم اس کے لیے راستے کو آسان بنا دیں گے اور بہشتِ جاوداں کی طرف ہدایت کریں گے"۔ (فسنیسرہ للیسرٰی)۔

"اعطٰی" سے مُراد وہی راہِ خدا میں خرچ کرنا اور حاجت مندوں کی مدد کرنا ہے۔

اور اس کے بعد تقویٰ کے لیے تاکید ممکن ہے کہ پاک نیت، اور خرچ کرتے وقت قصدِ خالص، اور مشروع طریقہ سے اموال کا حصول اور انہیں مشروع و جائز طریقہ سے خرچ کرنا، اور ہر قسم کا احسان جتانے اور اذیت و آزار پہنچانے سے خالی ہونے کے لزوم کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان اوصاف کا مجموعہ تقویٰ کے عنوان میں جمع ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "اعطٰی" مالی عبادتوں کی طرف اشارہ ہے، اور "اتقٰی" باقی تمام عبادتوں کی طرف، اور واجبات کو انجام دینے اور محرمات کو چھوڑنے کی طرف، لیکن پہلی تفسیر ظاہر آیت کے ساتھ بھی سازگار ہے، اور اس شانِ نزول کے ساتھ بھی جو ہم نے اُوپر بیان کی ہے۔

"حسنٰی" کی تصدیق کرنا۔ ("حسنٰی" "احسن" کی مؤنث ہے" جو زیادہ اچھے کے معنی میں ہے)۔

یہ خُدا کی اچھی جزاؤں پر ایمان رکھنے کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ شانِ نزول میں بیان ہوا ہے کہ "ابوالدحداح" نے خدا کی جزاؤں پر ایمان رکھتے ہوئے اپنے اموال خرچ کیے۔ سُورۂ نساء کی آیہ ۹۵ میں آیا ہے: وکلًّا وعداللہ الحسنٰی: "خدا نے ان میں سے

ہر ایک کو اچھے اجر اور جزاؤں کا وعدہ دیا ہے۔ (اس آیت میں بھی حسنیٰ اچھی جزا کے معنی میں ہے)۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد "شریعت حسنیٰ" یعنی دینِ اسلام پر ایمان ہے، جو بہترین دین ہے۔

اور بعض نے اس کی کلمہ لا الٰہ الا اللہ یا شہادتین کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

لیکن سیاقِ آیات، شانِ نزول، اور بہت سی آیاتِ قرآنی میں حسنیٰ کا اچھی جزا کے معنی میں ہونے کے ذکر کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

"فسنیسرہ للیسری" کا جملہ ممکن ہے توفیقِ الٰہی، اور ایسے اشخاص پر امرِ اطاعت کے آسان کرنے کی طرف اشارہ ہو، یا ان کی طرف جنت کی راہ کھولنے اور تحیت و سلام کے ساتھ ملائکہ اور فرشتوں کے استقبال کرنے، یا ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ ہو۔

یہ بات یقینی ہے کہ جو لوگ انفاق و تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں اور عظیم خدائی جزاؤں پر گرم جوشی کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں، ان کے لیے مشکلات آسان ہو جاتی ہیں اور وہ دنیا و آخرت میں ایک خاص قسم کے سکون و آرام کے حامل ہوتے ہیں۔

ان سب سے قطع نظر ممکن ہے کہ مالی انفاق ابتداء میں انسان کی طبیعت و مزاج کے لیے شاق اور مشکل ہو، لیکن تکرار کرنے اور مسلسل جاری رکھنے سے اس پر راستہ اس طرح آسان ہو جاتا ہے کہ وہ اس سے لذت اُٹھاتا ہے۔

کتنے ہی سخی لوگ ایسے ہیں جو اپنے دسترخوان پر مہمان کی موجودگی سے خوش ہوتے ہیں، لیکن اس کے برعکس اگر کسی دن ان کے پاس مہمان نہ آئے تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں اور یہ بھی مشکلات کے ان کے لیے آسان کرنے کی ایک قسم ہے۔

اور اس نکتہ سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیئے کہ اصولی طور پر خدائی عظیم جزاؤں پر ایمان، انسان کے لیے انواع و اقسام کی مشکلات کی برداشت کو آسان اور سہل بنا دیتا ہے، نہ صرف مال بلکہ وہ اپنی جان کو بھی اخلاص کے مطابق گزارتا ہے اور عشقِ شہادت میں میدانِ جہاد میں شرکت کرتا ہے، اور اپنی اس قربانی اور ایثار سے لذت حاصل کرتا ہے۔

"یسریٰ" "یسر" کے مادہ سے اصل میں گھوڑے پر زین کسنے، اُسے لگام دینے اور سواری کے لیے آمادہ و تیار کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد اس کا ہر سہل اور آسان کام کے لیے اطلاق ہوا ہے[1]۔

بعد والی آیات میں اس گروہ کے نقطۂ مقابل کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "لیکن وہ شخص جو بخل کرے اور اس طریقے سے بے نیازی چاہے" (واما من بخل واستغنیٰ)۔

"اور خدا کی اچھی جزاؤں کی تکذیب کرے" (وکذب بالحسنیٰ)۔

"ہم عنقریب راستوں کو اس پر دشوار اور مشکل بنا دیں گے" (فسنیسرہ للعسریٰ)۔

"بخل" یہاں "اعطاء" کا نقطۂ مقابل ہے، جو پہلے گروہ (سعادت مند سخیوں کے گروہ) میں بیان ہوا ہے۔ "واستغنیٰ" (بے نیازی چاہے) یا تو بخل کرنے کے لیے ایک بہانہ ہے، یا مال جمع کرنے کے لیے ایک وسیلہ ہے، اور یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خدائی جزاؤں سے اپنے آپ کو بے نیاز شمار کرتا ہے، پہلے گروہ کے برعکس، جن کی آنکھ ہمیشہ لطفِ خدا پر لگی رہتی ہے یا وہ اپنے آپ کو خدا کی اطاعت سے بے نیاز سمجھتا ہے، اور ہمیشہ گناہ میں آلودہ رہتا ہے۔

---

[1] "تفسیر کشاف" جلد ۴ ص ۷۶۲۔

ان تینوں تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ اگرچہ تینوں تفاسیر کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

"حسنیٰ" کی تکذیب سے مُراد وہی قیامت کی جزاؤں کا انکار ہے، یا پیغمبروں کے دین و آئین اور نیک روش کا انکار ہے۔

"فسنیسرہ للعسری" کی تعبیر جو واقعی طور پر دو ظاہراً متضاد تعبیریں ہیں (ہم ان کی راہ کو مشکلات کی طرف آسان کر دیں گے)۔

"فسنیسرہ للیسریٰ" کا نقطۂ مقابل ہے، اس طرح سے کہ خدا پہلے گروہ کو تو اپنی توفیقات کا مشمول قرار دے گا اور ان کے لیے اطاعت و انفاق کی راہ کو طے کرنا آسان بنا دے گا تاکہ وہ زندگی کی مشکلات سے رہائی حاصل کر لیں۔ لیکن دوسرے گروہ کی توفیقات سلب ہو گئی ہیں، لہٰذا ان کے لیے راستہ کو طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اور انہیں دنیا و آخرت میں سختیوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اصولی طور پر ان بے ایمان بخیلوں کے لیے نیک اعمال کو انجام دینا، خصوصاً راہِ خدا میں انفاق کرنا سخت اور دُشوار کام ہے، جب کہ پہلے گروہ کے لیے نشاط آور اور رُوح افزا ہے[1]

اور آخری زیرِ بحث آیت میں ان دل کے اندھے بخیلوں کو خبردار کرتے ہوئے فرماتا ہے: "جب وہ قبر یا جہنم میں جا گرے گا، تو اس کے اموال اس کے کچھ کام نہ آئیں گے": (وما یغنی عنہ مالہ اذا تردّٰی)۔

نہ تو وہ ان اموال کو دنیا سے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے اور اگر وہ لے بھی جائے تو وُہ اس کے جہنم کی آگ میں جانے سے مانع نہیں ہوں گے۔

"ما" اس آیت کے آغاز میں ممکن ہے "نافیہ" ہو (جیسا کہ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے) یا استفہام انکاری کے لیے ہو، یعنی اس کے اموال قبر یا دوزخ میں جانے یا گرنے کے وقت اس کو کیا فائدہ دیں گے؟

"تردّٰی" "ردائت" اور "ردٰی" کے مادّہ سے ہلاکت کے معنی میں ہے اور بلندی سے گرنے کے معنی میں بھی آیا ہے جو ہلاکت کا سبب ہو۔ بلکہ بعض تو اس کی اصل ہی سقوط کے معنی میں سمجھتے ہیں، اور چونکہ بلند جگہ سے گرنا ہلاکت کا سبب ہوتا ہے، لہٰذا ہلاکت کے معنی میں بھی آیا ہے اور زیرِ بحث آیت میں ممکن ہے کہ قبر یا دوزخ میں گرنے کے معنی میں ہو یا ہلاکت عذاب کے معنی میں ہو۔

اس طرح قرآن ان آیات میں دو گروہوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، ایک گروہ مومن، متقی اور سخی، اور دوسرا گروہ بے ایمان، بے تقویٰ اور بخیل، اور ان دونوں گروہوں کا نمونہ شانِ نزول میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

پہلا گروہ توفیقاتِ الٰہی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، اپنی راہ کو سہولت کے ساتھ طے کرتا ہے، اور جنت اور اس کی نعمتوں کی طرف بڑھا چلا جاتا ہے۔ جب کہ دوسرا گروہ زندگی میں بے شمار مشکلات میں گھرا ہوا ہوتا ہے، بہت سا مال جمع کرتا ہے اور یہیں پر چھوڑ کر آگے چلا جاتا ہے، اور سوائے حسرت، اندوہ و ملال اور خدائی عذاب کے انہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، اور وہ اس سے کوئی چیز نہیں خریدتے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] "یسریٰ" و "عسریٰ" دونوں مؤنث کے صیغہ ہیں (ان کا مذکر "الیسر" و "العسر" ہے) اور ان دونوں کا مؤنث کے صیغہ کی صورت میں ذکر کرنا یا تو اس بنا پر ہے کہ ان کا موصوف (افعال کا مجموعہ) ہے اور تقدیر میں اس طرح ہوگا۔ فسنیسرہ الاعمال لیسری - او - لاعمال عسری یا تمام مسائل اور زندگی میں پیش آنے والے واقعات ہیں اور اگر اس کا موصوف مفرد ہو تو ممکن ہے کہ "طریقۃ" یا "خلّۃ" یا اس قسم کا کوئی لفظ ہو۔

۱۲۔ اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡهُدٰی ۖ

۱۳۔ وَاِنَّ لَنَا لَلۡاٰخِرَةَ وَالۡاُوۡلٰی ۝

۱۴۔ فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ نَارًا تَلَظّٰی ۚ

۱۵۔ لَا یَصۡلٰىهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَی ۙ

۱۶۔ الَّذِیۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۘ

۱۷۔ وَسَیُجَنَّبُهَا الۡاَتۡقَی ۙ

۱۸۔ الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی ۚ

۱۹۔ وَمَا لِاَحَدٍ عِنۡدَهٗ مِنۡ نِّعۡمَةٍ تُجۡزٰۤی ۙ

۲۰۔ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِ الۡاَعۡلٰی ۚ

۲۱۔ وَلَسَوۡفَ یَرۡضٰی ۧ

ترجمہ

۱۲۔ یقیناً ہدایت کرنا ہمارے ذمہ ہے۔

۱۳۔ اور دُنیا و آخرت ہمارے لیے ہے۔

۱۴۔ اور مَیں تمہیں شعلہ نکالنے والی آگ سے ڈراتا ہوں۔

۱۵۔ بد بخت ترین لوگوں کے سوا کوئی شخص اس میں داخل نہیں ہوگا۔

۱۶۔ وہی شخص جس نے آیاتِ (خدا کی) تکذیب کی اور پیٹھ پھیر لی۔

۱۷۔ اور زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والے عنقریب اس سے دُور رہیں گے۔

۱۸۔ وہی شخص جو اپنے مال کو (خدا کی راہ میں) بخش دیتا ہے تاکہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے۔

۱۹۔ اور کسی شخص کا اس کے پاس کوئی حقِ نعمت نہیں ہے تاکہ وُہ (اس انفاق کے ذریعے) اس کا بدلہ دے۔ ۲۰: سوائے اپنے بلند و برتر پروردگار کی رضامندی چاہنے کے۔

۲۱۔ اور وُہ عنقریب راضی و خوشنود ہو جائے گا۔

تفسیر

انفاق اور جہنّم کی آگ سے دُوری

گزشتہ آیات میں لوگوں کی دو گروہوں: مومنِ سخاوت مند اور بے ایمان بخیل، میں تقسیم کرنے، اور ان میں سے ہر ایک کی سرنوشت بیان کرنے کے بعد زیرِ بحث آیات میں پہلے اس بات کو بیان کرتا ہے کہ ہمارا کام ہدایت کرنا ہے کسی کو مجبور کرنا نہیں ہے۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ مردانہ وار راستہ پر گامزن ہو جاؤ۔ علاوہ ازیں اس راستہ کو طے کرنا خود تمہارے ہی نفع میں ہے اور ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

فرماتا ہے: "یقیناً ہدایت کرنا ہمارے ہی ذمہ ہے"۔ (ان علینا للھدٰی)۔

چاہے تکوین (فطرت و عقل) کے طریق سے ہدایت ہو، اور چاہے تشریع (کتاب و سُنّت) کے طریق سے ہو۔ اس سلسلہ میں جو کچھ ضروری تھا وہ ہم نے بیان کر دیا ہے اور اس کا حق ادا کر دیا ہے۔

"اور یقینی طور پر آخرت اور دنیا ہماری ہی ملکیت ہے"۔ (وان لنا للاٰخرۃ والاولٰی)۔[1]

---

[1] "للاٰخرۃ" کا "لام" اور اسی طرح (گزشتہ آیت میں) "للھدٰی" کا "لام" ظاہراً لامِ تاکید ہے جو یہاں "اسم ان" کے اُوپر آئی ہے، اگرچہ عام طور پر خبر کے اُوپر داخل ہوا کرتی ہے، یہ اس بنا پر ہے کہ بعض ادب کی کتابوں کی تصریح کے مطابق جب "ان" کی خبر مقدم ہو تو اس کے اسم پر لام داخل ہوتی ہے۔

ہمیں تمہارے ایمان و اطاعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ نہ تمہاری اطاعت ہمیں کوئی فائدہ پہنچاتی ہے اور نہ ہی تمہاری نافرمانی سے ہمیں کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ یہ تمام پروگرام تمہارے فائدے کے لیے ہیں اور خود تمہارے لیے ہیں ۔

اس تفسیر کے مطابق یہاں ہدایت " ارائہ طریق " کے معنی میں ہے ۔ یہ احتمال بھی ہے کہ ان دو آیات کا ہدف سخاوت کرنے والے مومنین کو شوق دلانا اور اس معنی پر تاکید ہو کہ ہم انہیں مزید ہدایت کا مشمول قرار دیں گے ، اور اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی راستہ کو ان پر آسان کر دیں گے ، اور چونکہ دنیا و آخرت ہماری ہی ملکیت ہے لہٰذا ہم اس کام کو انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں

یہ ٹھیک ہے کہ زمانہ کے لحاظ سے دُنیا آخرت پر مقدم ہے ، لیکن اہمیت اور ہدف اصلی کے لحاظ سے مقصودِ اصلی آخرت ہے اور اسی بنا پر اُسے مقدم رکھا گیا ہے۔

اور چونکہ ہدایت کے شعبوں میں سے ایک خبردار کرنا اور ڈرانا ہے ، لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے : اَب جب کہ یہ بات ہے تو میں تمہیں اس آگ سے ڈراتا ہوں جو شعلہ ور ہوگی " (فانذرتکم نارًا تلظّٰی) ۔

" تلظّٰی " " لظٰی " (بروزن قضا) کے مادّہ سے ، خالص شعلہ کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خالص شعلوں میں جو ہر قسم کے دُھوئیں سے خالی ہوں زیادہ گرمی اور حرارت ہوتی ہے ۔ اور بعض اوقات لفظ " لظٰی " کا خود جہنم پر بھی اطلاق ہوتا ہے [1]

اس کے بعد اس گروہ کی طرف ، جو اس بھڑکتی ہوئی اور جلانے والی آگ میں داخل ہوں گے ، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : " بدبخت ترین آدمی کے سوا اس میں کوئی بھی داخل نہیں ہوگا ۔ (لا یصلاھا الّا الاشقی) ۔

اور اشقی کی توصیف میں فرماتا ہے : " وہی شخص جو آیاتِ خدا کی تکذیب کرتا ہے اور ان سے پیٹھ پھیر لیتا ہے " (الّذی کذّب وتولّٰی) ۔

اس بنا پر خوش بختی اور بدبختی کا معیار وہی کفر و ایمان ہے یا وہ عملی نتائج جو ان دونوں کے ہوتے ہیں ، اور وہ واقعاً جو شخص ہدایت کی ان تمام نشانیوں ، اور ایمان و تقویٰ کے امکانات و وسائل کو نظر انداز کر دے ، تو وہ " اشقی " کا مصداق ، اور بدبخت ترین شخص ہے ۔

" الذی کذّب وتولّٰی " کے جملہ میں ممکن ہے کہ " تکذیب " تو کفر کی طرف اشارہ ہو ، اور " تولّٰی " اعمالِ صالح کے ترک کرنے کی طرف اشارہ ہو ، کیونکہ کفر کا لازمہ یہی ہے ۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں ہی ترکِ ایمان کی طرف اشارہ ہوں ۔ اس طرح سے کہ پہلے تو پیغمبرؐ خدا کی تکذیب کرتے ہیں ، اور اس کے بعد پیٹھ پھیر کر ہمیشہ کے لیے اس سے دُور ہو جاتے ہیں ۔

بہت سے مفسرین نے یہاں ایک اعتراض پیش کیا ہے اور اس کا جواب دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُوپر والی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ جہنم کی آگ کفار کے ساتھ مخصوص ہے ۔ یہ بات اس چیز کے مخالف ہے جو قرآن کی دُوسری آیات اور مجموعہ روایات اسلامی سے معلوم ہوتی ہے کہ گنہگار مومن بھی جہنم کی آگ میں حصہ دار بنیں گے ، لہٰذا منحرف گروہوں میں سے بعض نے ، جو یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ ضرر نہیں پہنچاتا اُنہوں نے اپنے مقصود پر ان آیات سے استدلال کیا ہے ۔ (اس گروہ کا نام " مرجئہ " ہے)

اس کے جواب میں دو نکتوں کی طرف توجہ کرنا چاہیئے : پہلا یہ کہ یہاں جہنم میں ورود سے مُراد وہی " خلود " یعنی ہمیشہ رہنا ہے ۔

---

[1] " تلظّٰی " اصل میں " تتلظّٰی " تھا ، دو " تا " میں سے ایک " تا " تخفیف کے لیے گر گئی ہے ۔

اور ہم جانتے ہیں کہ خلود کفار کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ اِس بات کا قرینہ وہ آیات ہیں جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ غیر کفار بھی جہنم میں وارد ہوں گے۔

دوسرا یہ کہ اُوپر والی آیات اور بعد والی آیات یہ کہتی ہیں کہ جہنم کی آگ سے دُوری "اتقی" (زیادہ متقی افراد) سے مخصوص ہے، یعنی مجموعی طور پر وہ یہ چاہتا ہے کہ صرف دو گروہوں کی حالت بیان کرے: (۱) بے ایمان بخیل گروہ اور (۲) زیادہ تقویٰ رکھنے والے سخاوت مند مومن۔ ان دونوں گروہوں میں سے صرف پہلا گروہ جہنم میں وارد ہوگا، اور دُوسرا گروہ بہشت میں داخل ہوگا، اور اس طرح سے تیسرے گروہ یعنی گنہگار مومنین کے بارے میں تو اصلاً کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہے۔

دُوسرے لفظوں میں یہاں "حصر" "حصر اضافی" ہے۔ گویا جنت صرف دوسرے گروہ کے لیے، اور جہنم صرف پہلے گروہ کے لیے پیدا کی گئی ہے، اس بیان سے ایک دوسرے اعتراض کا جواب بھی، جو زیر بحث آیات اور ان آیندہ آنے والی آیات کے رابطہ سے ہوا ہے، جو نجات کو "اتقی" سے مخصوص کرتی ہیں، واضح ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اس گروہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو اس جلانے والی شعلہ بار آگ سے دُور ہے، فرماتا ہے: "عنقریب سب سے زیادہ تقویٰ کرنے والا آدمی اس بھڑکتی ہوئی آگ سے دُور رکھا جائے گا" (وسیجنبھا الاتقی)۔

وہی آدمی جو اپنے مال کو راہ خدا میں انفاق کرتا ہے اور اس کا مقصد رضائے خدا کا حصول، تزکیہ نفس، اور اموال کو پاک کرنا ہوتا ہے، (الذی یؤتی مالہ یتزکّٰی)۔

"یتزکّٰی" کی تعبیر حقیقت میں قصدِ قربت اور نیتِ خالص کی طرف اشارہ ہے، چاہے یہ جملہ معنوی و رُوحانی رشد و نمو کے حصول کے معنی میں ہو یا اموال کی پاکیزگی کے حاصل کرنے کے معنی میں، کیونکہ "تزکیہ" "نمو دینے" کے معنی میں بھی آیا ہے، اور "پاک کرنے" کے معنی میں بھی سُورہ توبہ کی آیہ ۱۰۳ میں آیا ہے: خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا وصل علیھم ان صلاتک سکن لھم: "ان کے اموال میں سے زکوٰۃ وصول کرلے تاکہ اس کے ذریعے تو انہیں پاک کرے اور ان کی پرورش کرے، اور (زکوٰۃ لیتے وقت) ان کے لیے دُعا کر کیونکہ تیری دعا ان کے سکون و آرام کا باعث ہے"۔

اس کے بعد ان کے خلوص نیت کے مسئلہ پر، جو وہ خرچ کرنے میں رکھتے ہیں، تاکید کے لیے مزید فرماتا ہے: "کسی شخص کا اس کے اُوپر حق نعمت نہیں ہے کہ اس انفاق کے ذریعے اس کی جزا دی جائے" (وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزٰی)۔

بلکہ اس کا مقصد تو اپنے بزرگ و برتر پروردگار کی رضا حاصل کرنا ہے۔ (الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلٰی)۔

دُوسرے لفظوں میں لوگوں کے درمیان بہت سے انفاق ایسے ہوتے ہیں جو ویسے ہی انفاقوں کا جواب ہوتے ہیں جو طرف مقابل کی طرف سے پہلے سے کیے ہوئے ہوتے ہیں البتہ حق شناسی اور احسان کا احسان کے ساتھ جواب دینا ایک اچھا کام ہے، لیکن اس کا حساب پرہیزگاروں کے مخلصانہ انفاق سے جُدا ہے۔ اُوپر والی آیات کہتی ہیں کہ پرہیزگار مومنوں کا دُوسروں پر خرچ کرنا نہ تو ریاکاری کی وجہ سے ہوتا ہے، اور نہ ہی ان کی سابقہ خدمات کے جواب کے طور پر، بلکہ اس کا سبب صرف اور صرف خدا کی رضا کا حاصل کرنا ہوتا ہے اور یہی چیز ان انفاقوں کو حد سے زیادہ قدر و منزلت عطا کرتی ہے۔

"وجہ" کی تعبیر یہاں "ذات" کے معنی میں ہے اور اس سے مُراد اس کی پاک ذات کی رضا و خوشنودی ہے۔

" ربہ الاعلیٰ " کی تعبیر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہ انفاق پوری معرفت کے ساتھ صورت پذیر ہوتا ہے، اور اس حالت میں ہوتا ہے کہ وہ پروردگار کی ربوبیت سے بھی آشنا ہوتا ہے، اور اس کے مقام اعلیٰ سے بھی باخبر ہوتا ہے۔

ضمنی طور پر یہ استثنا ہر قسم کی انحرافی نیتوں کی بھی نفی کرتا ہے، مثلاً نیک نامی، لوگوں کی توجہ مبذول کرنے، اور معاشرے میں مقام و حیثیت وغیرہ حاصل کرنے کے لیے خرچ کرنا، کیونکہ اس کا مفہوم ان اموال کے انفاق کا محرک، پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے میں ہے[1]

انجام کار اس سورہ کی آخری آیت میں اس گروہ کی عظیم و بے نظیر جزاؤں کو پیش کرتے ہوئے ایک مختصر سے جملہ میں فرماتا ہے:

" اور ایسا آدمی عنقریب راضی و خوشنود ہو جائے گا"۔ (ولسوف یرضیٰ)۔

ہاں! جس طرح سے وہ رضائے خدا کے لیے کام کرتا ہے، خدا بھی اس کو راضی کرے گا، ایسی رضا جو مطلق اور بے قید و شرط ہوگی، ایسی رضا جو وسیع و غیر محدود ہوگی، ایسی پُر معنی رضا جس میں تمام نعمتیں جمع ہوں گی، ایسی رضا جس کا تصور کرنا بھی آج ہمارے لیے غیر ممکن ہے اور وہ کون سی نعمت ہوگی جو اس سے برتر و بالاتر ہوگی۔

بعض مفسرین نے بھی یہی احتمال دیا ہے کہ "یرضیٰ" میں ضمیر خدا کی طرف لوٹتی ہے، یعنی عنقریب خدا اس گروہ سے راضی ہو جائے گا کہ وہ بھی ایک عظیم و بے نظیر انعام ہے کہ خدائے بزرگ اور پروردگارِ برتر اس قسم کے بندے سے راضی و خوشنود ہو جائے۔ وہ بھی ایسی رضا جو مطلق اور بے قید و شرط ہو، اور یقینی طور پر اس رضائے الٰہی کے پیچھے اس باایمان اور باتقویٰ بندہ کی رضایت ہے، کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں جیسا کہ سورہ بینہ کی آیہ ۸ میں آیا ہے، رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ، یا سورہ فجر کی آیہ ۲۸ میں آیا ہے راضیۃ مرضیۃ، لیکن تفسیر اول زیادہ مناسب ہے۔

ایک نکتہ

سورۂ واللیل کے شانِ نزول کے بارے میں ایک بات

فخر رازی کہتا ہے: "مفسرینِ اہلِ سنت عموماً یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ" سیجنبہا الاتقی " میں " اتقی " سے مراد حضرت ابوبکرؓ ہیں، اور شیعہ عام طور پر اس بات کا انکار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ حضرت علی بن ابی طالبؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے"[2]

اس کے بعد وہ اپنے مخصوص انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: اُمتِ اسلامی (عام اس سے کہ اہلِ سنت ہوں یا شیعہ) اس چیز پر اتفاق رکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد افضل ترین شخص یا ابوبکرؓ ہے یا علیؑ، اور اس آیت کو علیؑ پر منطبق

---

[1] " الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ " کے جملہ میں استثنا، استثنا منقطع ہے، البتہ پہلی آیت میں ایک تقدیر ہے جو اس طرح ہے۔ وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزیٰ فلا ینفق مالہ لنعمۃ الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ، کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے لہٰذا وہ اپنا مال کسی احسان کے بدلے میں خرچ نہیں کرتا مگر اپنے بزرگ و برتر پروردگار کی خوشنودی کے لیے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ استثنا متصل ہو، ایک محذوف کو نظر میں رکھتے ہوئے اور تقدیر میں اس طرح ہو: لا ینفق لنعمۃ عندہ ولا لغیر ذالک الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ (غور کیجئے)۔

[2] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۱ صفحہ ۲۰۴۔

نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ قرآن اس فرد اتقیٰ کے بارے میں کہتا ہے: وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزٰی کوئی شخص اس پر کوئی حق اور احسان نہیں رکھتا، کہ جس کی جزا دی جائے اور یہ صفت علی علیہ السلام پر تطبیق نہیں کرتی کیونکہ پیغمبرؐ ان پر حق نعمت رکھتے تھے لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف یہ کہ ابوبکرؓ پر کوئی مادی حق نعمت نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انفاق کرتے تھے اور حق نعمت رکھتے تھے!

اس کا نتیجہ یہ بنتا ہے کہ "اتقیٰ" کا مصداق ابوبکرؓ ہے، اور چونکہ اتقی کا معنی سب لوگوں سے زیادہ پرہیزگار ہے، لہٰذا اس کی افضلیت ثابت ہے۔[1]

اگرچہ ہم اس تفسیر کے مباحث میں، اس قسم کے مسائل میں، وارد ہونے کی طرف زیادہ مائل نہیں ہیں لیکن بعض مفسرین کا اپنے پہلے سے کیے ہوئے فیصلہ کو قرآن کی آیات کے ذریعے ثابت کرنے پر اصرار اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ وہ ایسی تعبیریں کرنے لگے ہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبہ اور بلند مقام کے لائق نہیں ہے۔ لہٰذا اسی سبب سے ہم بھی یہاں چند نکات کا ذکر کرتے ہیں۔

اولاً: یہ جو فخر رازی کہتا ہے کہ اہل سنت کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ یہ آیت ابوبکرؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس چیز کے برخلاف ہے جسے اہل سنت کے مشہور و معروف مفسرین نے صراحت کے ساتھ نقل کیا ہے، منجملہ "قرطبی" اپنی تفسیر میں ابن عباسؓ سے ایک روایت میں نقل کرتا ہے کہ یہ سارا سورہ (سورۃ اللیل) "ابوالدحداح" کی شان میں نازل ہوا ہے۔ (جس کی داستان ہم نے سورہ کے آغاز میں بیان کر دی ہے)[2]

خاص طور پر جب وہ آیہ وسیجنبھا الاتقی پر پہنچتا ہے تو پھر دوبارہ کہتا ہے کہ اس سے مراد "ابوالدحداح" ہے۔

اگرچہ اکثر مفسرین سے اس نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ (ان کے نزدیک) یہ ابوبکرؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن خود اس نے اس نظریہ کو قبول نہیں کیا۔

ثانیاً: یہ جو اس نے کہا ہے کہ شیعوں کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ بہت سے مفسرین نے وہی ابوالدحداح کی داستان ہی بیان کی ہے اور اسے قبول کیا ہے۔ البتہ بعض روایات میں امام جعفر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ "اتقی" سے مراد ان کے پیروکار اور شیعہ ہیں اور الذی یؤتی مالہ یتزکّٰی سے مراد امیر المومنین علیؑ ہیں، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ باتیں شان نزول کا پہلو نہیں رکھتیں، بلکہ یہ واضح اور روشن مصداق کی تطبیق کی قبیل سے ہیں۔

ثالثاً: اس میں شک نہیں کہ اوپر والی آیت میں لفظ "اتقی" لوگوں میں سے زیادہ تقویٰ رکھنے والے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم وہی متقی ہونا ہے، اور اس بات کا واضح گواہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں "اشقی" لوگوں میں سے بدبخت ترین کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ کافر ہیں جو انفاق سے بخل کرتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ تھے، تو کیا ابوبکرؓ کو پیغمبرؐ سے بھی مقدم رکھا جا سکتا ہے؟ ہم پہلے سے کیے ہوئے فیصلوں اور ذہنیتوں کی بنا پر ایسی تعبیریں کیوں کریں جو پیغمبرؐ تک کے مقام بلند کو بھی ضرب لگائیں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ پیغمبرؐ کا معاملہ الگ ہے، تو پھر ہم کہتے ہیں کہ آیہ وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزٰی میں ان کے معاملے

---

[1] "تفسیر قرطبی" جلد ۱۰ ص ۷۱۸۰

کو کیوں الگ نہیں رکھا گیا اور علی علیہ السلام کو آیت کے مورد سے خارج کرنے کے لیے کیوں کہا گیا کہ چونکہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مادی نعمتوں کے مشمول ہیں لہٰذا وہ اس آیت میں داخل نہیں ہیں۔

رابعاً : ایسا کون سا آدمی ہے جس سے اس کی زندگی میں کسی نے محبت کی ہی نہ ہو اور کسی نے بھی اُسے نہ ہدیہ دیا ہو نہ کبھی دعوت کی ہو۔ کیا واقعاً ایسا ہوا ہے کہ ابوبکرؓ اپنی ساری عمر میں نہ تو کسی کی مہمانی پر گئے اور نہ ہی کبھی کسی کا کوئی ہدیہ قبول کیا اور نہ ہی کوئی اور دُوسری مادی خدمت کس سے قبول کی کیا یہ چیز باور کرنے کے لائق ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ آیہ وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزیٰ سے مُراد یہ نہیں ہے کہ کسی بھی شخص کا اس پر کوئی حق نعمت ہے ہی نہیں، بلکہ اس سے مُراد یہ ہے کہ ان کا انفاق کرنا کسی حق نعمت کی بنا پر نہیں ہے۔

یعنی اگر وہ کسی پر انفاق کرتے ہیں تو وہ صرف خدا کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ وہ کسی خدمت کی بنا پر اسے اجر و پاداش دینا چاہتے ہیں۔

خامساً : اس سُورہ کی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ یہ سُورہ ایک ایسے ماجرے کے بارے میں، جس کے دو قطب ہیں، نازل ہوا ہے، ایک "اتقی" کے قطب میں تھا اور دُوسرا "اشقی" کے قطب میں۔ اگر ہم "ابوالدحداح" کی داستان کو شانِ نزول سمجھیں تو مسئلہ حل شدہ ہے۔ لیکن اگر ہم کہیں کہ مُراد ابوبکرؓ تھے تو "اشقی" کی مشکل باقی رہ جاتی ہے کہ اس سے مُراد کون شخص ہے؟

شیعوں کو اس بات پر کوئی اصرار نہیں ہے کہ یہ آیت خصوصیت کے ساتھ علیؑ ہی کے بارے میں ہے۔ ان کی شان میں آیات بہت زیادہ ہیں، لیکن اگر اس کی تطبیق علیؑ پر کی جائے تو "اشقی" کی مشکل حل ہے، کیونکہ سُورۂ شمس کی آیہ ۱۲ (اذ انبعث اشقاھا) کے ذیل میں اہلِ سُنّت کے طرق سے کافی روایات نقل ہوئی ہیں کہ "اشقی" سے مراد علی بن ابی طالبؑ کا قاتل ہے۔ (ان روایات کو، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل میں جمع کیا ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ فخر رازی کی گفتگو اور اس آیت کے بارے میں اس کی تحلیل بہت ہی کمزور اور بہت سے اشتباہات پر مشتمل ہے۔ اسی لیے اہلِ سُنّت کے بعض مشہور مفسرین مثلاً آلوسی تک نے بھی رُوح المعانی میں اس تجزیہ کو پسند نہیں کیا، اور اس پر اعتراض کیا ہے، جیسا کہ وہ کہتا ہے:

"واستدل بذالك الامام على انه (ابوبكر) افضل الامة وذكر ان فى الآيات ما يأبى قول الشيعة انها فى على وأطال الكلام فى ذالك وأتى بما لا يخلو عن قبيل و قال:

"امام فخر رازی نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ ابوبکرؓ افضل اُمت ہیں، اور مزید کہا ہے کہ آیات میں بعض قرائن ایسے ہیں جو شیعوں کے قول کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔ اور یہاں گفتگو کو طول دیا ہے اور ایسے مطالب بیان کیے ہیں جو قیل و قال (اور اشکال) سے خالی نہیں ہیں[1]

۲۔ انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت

راہِ خدا میں انفاق اور بخشش کرنا، اور محروم، خصوصاً آبرو مند لوگوں کی مالی امداد کرنا، جو خلوص نیت سے ملی ہوئی ہو، ایسے امور میں سے ہے

---

[1] روح المعانی جلد ۳۰ ص ۱۵۳

جس کا قرآن مجید کی آیات میں بار بار ذکر ہوا ہے، اور اس کو ایمان کی نشانیوں میں سے کہا گیا ہے۔

اس بارے میں اسلامی روایات بھی تاکید سے بھری ہوئی ہیں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ اسلامی معاشرے اور تمدن میں مالی انفاق کرنا، بشرطیکہ اس کا محرک پروردگار کی رضا کے علاوہ اور کچھ نہ ہو، اور وہ ہر قسم کی ریاکاری، احسان جتانے اور آزار سے خالی ہو، تو بہترین اعمال میں سے ہے۔

ہم اس بحث کو چند معنی خیز احادیث کے ذکر کے ساتھ مکمل کرتے ہیں۔

۱۔ ایک روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

"ان احب الاعمال الی اللہ ادخال السرور علی المؤمن، شبعة مسلم او قضاء دینه"

"خدا کے نزدیک محبوب ترین عمل ضرورت مند مومن کے دل کو خوش کرنا ہے، اس طرح سے کہ اُسے سیر کیا جائے یا اس کا قرض ادا کیا جائے۔"[1]

۲۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من الایمان حسن الخلق، واطعام الطعام، و اراقة الدماء":

"حسنِ خلق، کھانا کھلانا، اور خون بہانا (راہِ خدا میں قربانی دینا) ایمان کے اجزاء میں سے ہیں۔"[2]

۳۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ سے آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ما اری شیئاً یعدل زیارة المؤمن الا اطعامه، وحق علی اللہ ان یطعم من اطعم مؤمناً من طعام الجنة":

"میرے نزدیک کوئی چیز مومن کے دیدار اور زیارت کے برابر نہیں ہے سوائے اس کو کھانا کھلانے کے۔ اور جو شخص کسی مومن کو کھانا کھلائے خدا پر لازم ہے کہ وہ اُسے جنت کے کھانوں میں سے کھانا کھلائے۔"[3]

۴۔ ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری کی مہار پکڑ لی اور عرض کیا، اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ای الاعمال افضل؟ تمام اعمال میں کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اطعام الطعام، واطیاب الکلام":

"لوگوں کو کھانا کھلانا اور خوش کلام ہونا۔"[4]

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۷۴، حدیث ۳۵ ص ۳۶۵

[2] "وہی مدرک" حدیث ۳۸

[3] "اصول کافی" جلد ۲ باب اطعام المؤمن حدیث ۱۷

[4] "بحار الانوار" جلد ۷۴ ص ۳۸۸ حدیث ۱۱۳

۵۔ اور آخر میں ایک حدیث میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

" من عال اھل بیت من المسلمین یومھم ولیلتھم غفر اللہ ذنوبہ "۔

" جو شخص مُسلمانوں کے کسی گھرانے کی ایک رات دن پذیرائی کرے تو خدا اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے "۔ [1]

خداوندا ! ہم سب کو توفیق دے تاکہ ہم اس عظیم کارِ خیر میں قدم رکھیں ۔

پروردگارا ! تمام اعمال میں ہمارے خلوص نیت میں اضافہ فرما ۔

بارالٰہا ! ہم تجھ سے دُعا کرتے ہیں کہ تو ہمیں اپنی نعمت و رحمت کا اس طرح سے مشمول قرار دے کہ تو بھی ہم سے خوش ہو اور ہم بھی خوش اور راضی ہوں۔

آمین یا ربّ العالمین

اختتام سُورۂ اللیل

❖ ❖ ❖

[1] " بحارالانوار " جلد ۷۴ ص ۳۸۹ حدیث ۲

سورۂ ضحیٰ

❖ یہ سورہ مکّہ میں نازل ہُوا۔

❖ اس میں ۱۱ آیات ہیں۔

سُورۂ "الضحیٰ" کے مضامین اور اس کی فضیلت

یہ سُورہ جو مکی سُورتوں میں سے ہے، اور بعض روایات کے مطابق اس وقت نازل ہوا جب پیغمبرؐ وحی کے وقتی طور پر منقطع ہوجانے اور تاخیر سے پریشان تھے، اور دُشمنوں کی زبان کھلی ہوئی تھی، تو یہ سُورہ نازل ہوا، اور بارانِ رحمت کی طرح پیغمبرؐ کے قلبِ پاک پر اُترا، اور انہیں نئی تاب و توان بخشی اور بدزبانوں کی زبان کو بند کر دیا۔

اِس سُورہ کی دو قسموں کے ساتھ ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد پیغمبرؐ کو بشارت دیتا ہے کہ خدا نے آپ کو ہرگز نہیں چھوڑا۔

اِس کے بعد آپ کو یہ خوش خبری دیتا ہے کہ خدا آپ کو اس قدر عطا کرے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔

اور آخری مرحلہ میں، پیغمبرؐ کی گزشتہ زندگی کو آپ کی نظر میں مجسم کرتا ہے کہ خدا نے ہمیشہ آپ کو کس طرح سے اپنی انواع و اقسام کی رحمت کا مشمول قرار دیا ہے، اور زندگی کے سخت ترین لمحات میں اُس نے آپ کی حمایت کی ہے۔

اور اسی لیے آخری آیات میں آپ کو حکم دیتا ہے کہ (خدا کی ان عظیم نعمتوں کے شکرانہ کے طور پر) یتیموں اور حاجت مندوں پر مہربانی کریں اور خدا کی نعمت کو یاد کرتے رہیں۔

اِس سُورہ کی فضیلت میں یہی بات کافی ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے:

"من قرأها كان ممن يرضاه الله، ولمحمد (ص) ان يشفع له وله عشر حسنات لعدد كل يتيم وسائل!

"جو شخص اس کی تلاوت کرے گا وہ ایسے لوگوں میں سے ہو گا جن سے خدا راضی ہو گا، اور وہ اس لائق ہو گا کہ محمدؐ اس کی شفاعت کریں اور ہر یتیم اور سوال کرنے والے مسکین کے برابر دس دس حسنات اس کے لیے ہوں گے[1]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۳

اور یہ سب فضائل اس کے لیے ہیں جو اُسے پڑھے اور اس پر عمل کرے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ متعدد روایات کے مطابق یہ سُورہ اور اس کے بعد والا سُورہ (سورۃ الم نشرح) ایک ہی سورہ ہیں۔ اور چونکہ ہر رکعت میں الحمد کے بعد ایک مکمل سُورہ پڑھنا چاہیئے، لہٰذا ان دونوں سُورتوں کو اکٹھا ملا کر پڑھنا چاہیئے، (یہی بات سورۂ "فیل" اور "لایلاف" کے بارے میں بھی کہی گئی ہے)۔

اور اگر ہم صحیح طور پر ان دونوں سُورتوں کے مطالب میں غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان دونوں کے مطالب ایک دوسرے سے اتنے مِلتے جُلتے ہیں کہ یقینی طور پر ایک کا دُوسرے کے ساتھ تسلسل قائم ہے، اگرچہ ان دونوں کے درمیان "بسم اللہ" کا فاصلہ ہے۔

اس بارے میں کہ کیا یہ دونوں سُورتیں ہر لحاظ سے ایک ہی ہیں؟ یا انہیں خصوصیت کے ساتھ نماز میں ایک سُورہ کے حکم میں شمار کرنا چاہیئے؟ اس میں اختلاف ہے، جس کی تفصیل کا فقہ کی کتابوں میں (قراءتِ نماز کی بحث میں) مطالعہ کرنا چاہیئے، لیکن بہرحال علماء کا اجماع اس بات پر ہے کہ قراءتِ نماز میں ان میں سے ایک سُورہ پر قناعت نہیں کرنا چاہیئے۔

❖ ❖ ❖

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ وَالضُّحٰی ۙ
۲۔ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ۙ
۳۔ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ؕ
۴۔ وَلَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی ؕ
۵۔ وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی ؕ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ قسم ہے دن کی جب کہ سورج نکل آئے (اور ہر جگہ کو گھیر لے)۔
۲۔ اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ ساکن ہو جائے۔
۳۔ کہ ہرگز نہ تو خدا نے تجھے چھوڑا ہے اور نہ ہی تجھ سے غصّہ ہوا ہے۔
۴۔ اور یقینی طور پر تیرے لیے آخرت دنیا سے بہتر ہے۔
۵۔ اور عنقریب تیرا رب تجھے اس قدر دے گا کہ تو راضی ہو جائے گا۔

شانِ نزول

اِس سورہ کے شانِ نزول کے بارے میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں، جن میں سب سے زیادہ واضح ذیل کی روایت ہے۔

"ابن عباسؓ" کہتے ہیں: پندرہ دن گزر گئے اور پیغمبرؐ پر وحی نازل نہ ہوئی۔ مشرکین نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پروردگار نے اُسے چھوڑ دیا ہے اور اس کا دشمن ہو گیا ہے۔ اگر اُس کی یہ بات سچ ہے کہ اس کی ماموریت خدا کی جانب سے ہے تو پھر اس پر مسلسل وحی نازل ہوتی۔ اس موقع پر اُوپر والی سُورت نازل ہوئی (اور ان کی باتوں کا جواب دیا)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث کے مطابق جب یہ سُورہ نازل ہوا تو پیغمبرؐ نے جبرئیل سے فرمایا:

"تُو نے دیر لگا دی حالانکہ مَیں شدت سے تیرا مشتاق تھا"، تو جبرئیل نے کہا:

وانا کنت اشد الیک شوقا: "مَیں تو خُود آپؐ کا بہت زیادہ مشتاق تھا، لیکن مَیں بندۂ مامور ہوں اور پروردگار کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہوتا"۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں آئی اور "ذی القرنین" و "اصحابِ کہف" اور "رُوح" کی خلقت کے بارے میں سوال کیا: پیغمبرؐ نے فرمایا:

"مَیں کل تمہیں بتاؤں گا"، اور اِنشاءَ اللہ نہ کہا۔ لہٰذا اسی وجہ سے وحیٔ الٰہی کئی دن تک منقطع رہی اور دُشمنوں کی زبانِ شماتت سے کھل گئی، اور اسی بنا پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غمگین ہو گئے۔ تو یہ سُورہ نازل ہوا تا کہ پیغمبرؐ کے دل کی تسلی کا باعث ہو (لیکن یہ شانِ نزول بعید نظر آتی ہے، کیونکہ یہودیوں کا پیغمبرؐ سے آکر ملنا اور اس قسم کے سوالات کرنا عام طور پر مدینہ میں تھا نہ کہ مکہ میں)۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ مُسلمانوں کی ایک جماعت نے عرض کیا، اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ پر وحی کیوں نازل نہیں ہوتی؟ آپؐ نے فرمایا:

"کیف ینزل علیّ الوحی وانتم لا تنقون براجمکم ولا تقلمون اظفارکم"

"مُجھ پر وحی کیسے نازل ہو جب کہ تم اپنی اُنگلیوں کے جوڑوں کو پاک و صاف نہیں رکھتے اور ناخن نہیں کتراتے!"[1]

اِس بارے میں کہ انقطاعِ وحی کی مدت کس قدر تھی؟ مختلف روایات ہیں۔ بعض نے بارہ دن، بعض نے پندرہ دن، بعض نے پچیس دن اور بعض نے چالیس دن[2] نقل کیے ہیں، اور ایک روایت میں صرف دو تین شب و روز بھی نقل ہوئے ہیں۔

تفسیر

تجھے اس قدر عطا کرے گا کہ تو خوش ہو جائے گا

اِس سُورہ کے آغاز میں بھی دو قسمیں کھائی گئی ہیں:

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۴، (تھوڑی سی تلخیص اور اقتباس کے ساتھ)۔

۱۔ " نور " (روشنی) کی قسم
۲۔ " ظلمت " (تاریکی) کی قسم ، فرماتا ہے :
" قسم ہے دن کی جب کہ سُورج نکل آئے اور ہر جگہ کو گھیر لے " (والضحیٰ) ۔
" اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ ساکن ہو جائے اور ہر جگہ کو سکون و آرام میں غرق کر دے " (واللیل اذا سجیٰ) ۔
" ضحیٰ " دن کے پہلے حصّہ کے معنی میں ہے جب کہ سُورج آسمان پر اُونچا ہو جائے ، اور اس کی روشنی ہر جگہ مسلط ہو جائے ، اور یہ درحقیقت دن کا بہترین وقت ہوتا ہے ۔
اور بعض کی تعبیر کے مطابق یہ فصل جوانی کے حکم میں ہے ، جب کہ گرمیوں کی ہوا ابھی گرم نہیں ہوتی ، اور سردیوں میں ہوا کی سردی ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے اور انسان کی رُوح و جان اِس موقع پر ہر قسم کی فعالیت کے لیے آمادہ ہوتی ہے ۔
" سجیٰ " " سجو " (بروزن سرد ، اور بروزن غلو) کے مادّہ سے اصل میں سکون و آرام کے معنی میں ہے ، اور " چھپانے " اور " تاریک ہونے " کے معنی میں بھی آیا ہے ، اسی لیے جب " میّت " کو کفن میں لپیٹ دیتے ہیں تو اُسے " مسجی " کہا جاتا ہے ۔ لیکن یہاں یہ وہی اصلی معنی دیتا ہے جو سکون و آرام ہے ۔ اسی وجہ سے ان راتوں کو جن میں ہوا نہ چلے " لیلۃ ساجیۃ " (آرام و سکون کی رات) کہتے ہیں ، اور طوفان اور امواجِ خروشاں سے خالی سمندر کو " بحر ساج " (پُر سکون سمندر) کہا جاتا ہے ۔
بہرحال جو چیز رات کے سلسلہ میں اہم ہے وہی سکون و آرام ہے جو اس پر حکم فرما ہے ، اور طبعاً انسان کے اعصاب اور رُوح کو سکون و آرام میں ڈبو دیتی ہے اور کل اور آئندہ آنے والے دنوں میں سعی اور کوشش کے لیے آمادہ و تیار کرتی ہے ۔ اس لحاظ سے یہ بہت ہی اہم نعمت ہے اور اس لائق ہے کہ اس کی قسم کھائی جائے ۔
اِن دونوں قسموں اور آیت کے مضمون کے درمیان شباہت اور ایک قریبی ربط موجود ہے ۔ دن تو پیغمبرؐ کے پاک دل پر وحی کے نُور کے نزول کی مانند ہے اور رات وقتی طور پر وحی کے انقطاع کے مانند ہے جو بعض مقاطع اور اوقات میں ضروری ہے ۔
اِن دونوں عظیم قسموں کے بعد نتیجہ اور جوابِ قسم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے : " تیرے پروردگار نے ہرگز تجھے چھوڑا نہیں ہے اور نہ ہی تجھ سے غصّہ ہوا ہے " (ماودعك ربك وما قلیٰ) ۔
" ودع " " توديع " کے مادّہ سے ، چھوڑنے اور وداع کر دینے کے معنی میں ہے ۔
" قلیٰ " " قلا " (بروزن صدا) کے مادّہ سے شدّتِ بُغض و عداوت کے معنی میں ہے ، اور مادّہ " قلو " (بروزن سرد) پھینکنے اور دھکا دینے کے معنی میں بھی آیا ہے ۔
راغب کا نظریہ یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں ، کیونکہ جو شخص کسی سے دُشمنی کرتا ہے تو گویا دل اسے دھکا دے دیتا ہے ، اور اُسے قبول نہیں کرتا ۔[1]
بہرحال یہ تعبیر پیغمبرؐ کی ذات کے لیے ایک دلداری اور تسلی کے طور پر ہے کہ وہ اچھی طرح یہ جان لیں کہ اگر کبھی نزولِ وحی میں تاخیر

---

[1] یہ مادّہ " ناقص یائی " کی صُورت میں بھی آیا ہے اور " ناقص واوی " کی صُورت میں بھی ، پہلی صورت میں بُغض و عداوت کے معنی میں ہے ، اور دُوسری صُورت میں پھینکنے اور دھکا دینے کے معنی میں ہے ، اور جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے دونوں معنی ایک ہی جڑ اور ریشہ کی طرف لوٹتے ہیں ۔

ہو جائے تو وہ کچھ مصالح کی بنا پر ہوتی ہے جسے خدا ہی جانتا ہے، اور ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ دشمنوں کے قول کے مطابق خدا اس سے خشمگیں اور غصہ ہوگیا ہے، یا اس کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہمیشہ ہی خدا کے خاص لطف وکرم اور عنایات کے شمول ہوتے ہیں اور ہمیشہ اس کی خاص حمایت کے زیر سایہ رہتے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "بے شک عالم آخرت تیرے لیے اس دنیا سے بہتر ہے" (وللآخرة خير لك من الاولى)۔ اور تو اس دنیا میں بھی اس کے الطاف کا مشمول ہے، اور آخرت میں اس سے بیشتر و بہتر ہوگا۔ نہ تو تجھ پر یہاں کی مختصر مدت میں پروردگار کا غضب ہوگا اور نہ ہی آخرت کی دراز مدت میں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تُو دنیا میں بھی محترم ہے اور آخرت میں بھی محترم ہے، البتہ دُنیا میں عزیز و محترم ہے اور آخرت میں عزیز تر و محترم تر ہے۔

بعض مفسرین نے "آخرت" اور "اولیٰ" کو پیغمبرؐ کی عمر کے آغاز و انجام کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تو اپنی آخری عمر میں زیادہ موافق اور زیادہ کامیاب ہوگا۔ اور یہ اسلام کی وسعت اور پھیلاؤ اور مسلمانوں کی دشمنوں پر بار بار کی کامیابیوں اور جنگوں میں ان کی فتوحات اور اسلام کے پودے بارور ہونے اور شرک و بُت پرستی کے آثار کے مٹ جانے کی طرف اشارہ ہے۔

ان دونوں تفاسیر کے درمیان جمع میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

اور آخری زیر بحث آیت میں پیغمبرؐ کو افضل و برتر خوش خبری دیتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "عنقریب تیرا پروردگار تجھے اس قدر عطا کرے گا کہ تو خوش ہو جائے گا" (ولسوف يعطيك ربك فترضى)۔

یہ خدا کا اپنے بندۂ خاص محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بالاترین احترام و اکرام ہے کہ فرماتا ہے: اس قدر تجھے بخشوں گا کہ تو راضی ہو جائے گا۔ دنیا میں تو دُشمنوں پر کامیاب ہو جائے گا اور تیرا دین عالمگیر ہو جائے گا، اور آخرت میں بھی تو عظیم ترین نعمتوں کا مشمول ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، خاتم انبیاء اور عالم بشریت کا رہبر ہونے کی حیثیت سے صرف اپنی ہی نجات پر خوش نہیں ہو سکتے، بلکہ آپ اس وقت راضی اور خوش ہوں گے جب آپ کی شفاعت آپ کی اُمت کے بارے میں بھی قبول ہو جائے گی۔ اس بنا پر روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت اُمید بخش ترین آیت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے قبول ہونے کی دلیل ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے کہ اُنہوں نے اپنے باپ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے، انہوں نے اپنے چچا "محمد بن حنفیہ" سے، انہوں نے اپنے باپ امیرالمومنین علیہ السلام سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"قیامت کے دن میں موقف شفاعت میں کھڑا ہو جاؤں گا اور گناہ گاروں کی اس قدر شفاعت کروں گا، کہ خدا فرمائے گا:

ارضيت يا محمد؟! "اے محمد کیا تم راضی ہوگئے"؟!

تو مَیں کہوں گا، رضیت، رضیت : "مَیں راضی ہوگیا، مَیں راضی ہوگیا"!

اس کے بعد امیرالمومنین علیہ السلام نے اہلِ کُوفہ کی ایک جماعت کی طرف رُخ کیا اور مزید فرمایا : تمہارا یہ نظریہ ہے کہ قرآنی آیات میں سب سے زیادہ اُمید بخش آیت "قل یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ" ہے (یعنی اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے اُوپر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو)۔

اس جماعت نے کہا : جی ہاں! ہم اِسی طرح کہتے ہیں :

آپ نے فرمایا : "لیکن ہم اہلِ بیت یہ کہتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی میں سب سے زیادہ اُمید بخش آیت "ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ" ہے[1]

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ پیغمبرؐ کی شفاعت کے لیے کچھ شرائط ہیں، نہ تو آپ ہر شخص کے لیے شفاعت کریں گے اور نہ ہی ہر گنہگار اس کی توقع رکھ سکتا ہے۔ (اس بحث کی تفصیل جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۴۸ میں مطالعہ فرمائیے)۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے :

> "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاطمہؑ کے گھر میں داخل ہوئے، جب کہ آپؑ کی بیٹی اُونٹ کی اُون کا سخت لباس پہنے ہوئے تھیں، ایک ہاتھ سے چکی پیس رہی تھیں، اور دوسرے ہاتھ سے اپنے فرزند کو دُودھ پلا رہی تھیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فرمایا، بیٹی! دنیا کی تلخی کو آخرت کی شیرینی کے مقابلہ میں برداشت کر، کیونکہ خدا نے مجھ پر یہ نازل کیا ہے کہ تیرا پروردگار اس قدر تجھے دے گا کہ تو راضی ہوجائے گا" (ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ)[2]

ایک نکتہ

انقطاعِ وحی کا فلسفہ

اُوپر والی آیات کے مجموعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ پیغمبرؐ کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی جانب سے ہے، یہاں تک کہ نزولِ وحی میں بھی آپ اپنی طرف سے کوئی اختیار نہیں رکھتے، جس وقت خدا چاہے وحی کو منقطع کردے، اور جس وقت چاہے برقرار کردے اور شاید انقطاعِ وحی بھی اسی مقصد کے لیے تھا، تاکہ ان لوگوں کا جواب ہو جو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے من مانے اور اپنے میلان کے مطابق معجزوں کا تقاضا کرتے تھے، یا آپ سے فرمائش کرتے تھے کہ فلاں حکم یا فلاں آیت کو بدل دیجئے، اور آپ ان سے یہ فرماتے کہ مَیں ان امور میں اپنی طرف سے کوئی اختیار نہیں رکھتا، (جیسا کہ سُورہ یونس کی آیہ ۱۵ میں آیا ہے)۔

❖ ❖ ❖

---

[1] "ابوالفتوح رازی" جلد ۱۲، صفحہ ۱۱۰

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰، ص ۵۰۵

۶۔ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۪
۷۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۪
۸۔ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ؕ
۹۔ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ؕ
۱۰۔ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ؕ
۱۱۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۧ

ترجمہ

۶۔ کیا تجھے یتیم نہیں پایا تو پھر پناہ دی ؟
۷۔ اور تجھے گمشدہ پایا تو رہنمائی کی ۔
۸۔ اور تجھے فقیر پایا تو بے نیاز کیا ۔
۹۔ اَب جب کہ یہ بات ہے تو یتیم کو حقیر نہ سمجھ ۔
۱۰۔ اور سوال کرنے والے کو نہ دھتکار ۔
۱۱۔ اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کو یاد کر ۔

تفسیر

اِن تمام نعمتوں کے شکرانے ہیں جو خُدا نے تجھے دی ہیں .. .. ..

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس سُورہ میں ہدف اور مقصد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلّی و دلداری اور آنحضرتؐ کے لیے الطافِ الٰہی کا بیان ہے۔ لہٰذا گزشتہ آیات کو جاری رکھتے ہوئے، جن میں اس مطلب کو بیان کیا گیا تھا، زیرِ بحث آیات میں پہلے تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خدا کی تین خاص نعمتوں کا ذکر کرتا ہے، اور اس کے بعد انہی سے مربوط تین اہم حکم انہیں دیتا ہے۔

فرماتا ہے: کیا خُدا نے تجھے یتیم نہیں پایا تو تجھے اس نے پناہ دی؟ (الم یجدك یتیماً فاٰوی)۔

تو ابھی شکمِ مادر میں ہی تھا کہ تیرا باپ عبداللہ اس دنیا سے چل بسا، تو ہم نے تجھے تیرے جد عبدالمطلبؑ (سردارِ مکہ) کی آغوش میں پرورش کرائی۔

تو چھ سال کا تھا کہ تیری ماں دُنیا سے چل بسی اور اس لحاظ سے بھی تو اکیلا رہ گیا، لیکن ہم نے تیرے عشق و محبت کو "عبدالمطلبؑ" کے دل میں زیادہ کر دیا۔

تو آٹھ سال کا ہوا تو تیرا دادا "عبدالمطلب بھی دُنیا سے رُخصت ہو گیا"، تو ہم نے تیرے چچا "ابوطالبؑ" کو تیری خدمت و حمایت کے لیے مقرر کر دیا، تاکہ تجھے جانِ شیریں کی طرح رکھے اور تیری حفاظت کرے۔

ہاں! تو یتیم تھا اور مَیں نے تجھے پناہ دی۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے کچھ اور دوسرے معنی بیان کیے ہیں جو اس کے ظاہر کے ساتھ سازگار نہیں ہیں، منجملہ ان کے یہ ہے کہ یتیم سے مُراد وہ شخص ہے جو شرافت و فضیلت میں اپنا مثل و نظیر نہ رکھتا ہو، جیسا کہ بے نظیر موتی کو "دُرِ یتیم" کہتے ہیں، لہٰذا اس جملہ کا معنی یہ ہو گا کہ خدا نے تجھے شرافت و فضیلت میں بے نظیر پایا۔ اس لیے تجھے انتخاب کیا اور مقامِ نبوت بخشا۔

دُوسرا یہ ہے کہ تو خُود ایک دن یتیم تھا لیکن آخرکار تو یتیموں کی پناہ گاہ اور انسانوں کا رہبر ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ پہلا معنی ہر لحاظ سے زیادہ مناسب ہے اور ظاہرِ آیت کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

اس کے بعد دُوسری نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور تجھے گُم شدہ پایا تو تیری رہنمائی کی"۔ (ووجدك ضالاً فھدیٰ)

ہاں! تُو ہرگز نبوت و رسالت سے آگاہ نہیں تھا، اور ہم نے یہ نُور تیرے دل میں ڈالا، تاکہ تو اس کے ذریعہ انسانوں کو ہدایت کرے، جیسا کہ ایک دُوسری جگہ فرماتا ہے: ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان ولٰکن جعلناہ نوراً نھدی بہ من نشاء من عبادنا: "نہ تو تو کتاب ہی کو جانتا تھا اور نہ ہی ایمان کو" (یعنی نزولِ وحی سے پہلے تو اسلام و قرآن کے مطالب سے آگاہ نہیں تھا) لیکن ہم نے اس کو ایک ایسا نور قرار دیا ہے کہ جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں ہدایت کرتے ہیں" (شوریٰ - ۵۲)

یہ بات واضح ہے کہ پیغمبرؐ کے پاس مقامِ نبوت و رسالت تک پہنچنے سے پہلے یہ الٰہی فیض نہیں تھا۔ خدا نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر ہدایت فرمائی اور اس مقام تک پہنچا دیا، جیسا کہ سُورۂ یوسف کی آیہ ۳ میں آیا ہے: نحن نقص علیك احسن القصص بما اوحینا

الیك هٰذا القرآن وان كنت من قبله لمن الغافلین : " ہم نے قرآن کی وحی کے ذریعے ایک بہترین داستان تیرے لیے بیان کی ہے ، اگرچہ تُو اس سے پہلے اس سے آگاہ نہیں تھا ۔

یقیناً اگر ہدایت الٰہی اور غیبی امدادیں پیغمبرؐ کے ہاتھ کو نہ پکڑتیں تو وہ ہرگز منزلِ مقصود کا راستہ نہ پاتے ۔

اِس بنا پر یہاں " ضلالت " سے مُراد ایمان ، توحید ، پاکیزگی اور تقویٰ کی نفی نہیں ہے ، بلکہ ان آیات کے قرینہ سے جن کی طرف اُوپر اشارہ ہوا ہے ، اسرارِ نبوت اور قوانینِ اسلام سے آگاہی کی نفی ، اور اِن حقائق سے عدم آشنائی تھی ، جیسا کہ بہت سے مفسّرین نے کہا ہے لیکن بعثت کے بعد پروردگار کی مدد سے ان تمام امور سے واقف ہوگئے اور ہدایت پائی ، (غور کیجیے) ۔

سُورہ بقرہ کی آیہ ۲۸۲ میں قرضوں کی سند لکھنے کے مسئلہ میں متعدد گواہوں کے فلسفہ کو ذکر کرتے وقت فرماتا ہے : ان تضل احداهما فتذكر احداهما الاخرٰی : " یہ اس بنا پر ہے کہ اگر ان دونوں میں سے ایک گمراہ ہو جائے اور بھول جائے تو دُوسری اسے یاد دلا دے " ۔

اس آیت میں " ضلالت " صرف بھول جانے کے معنی میں آیا ہے " فتذکر " کے جملہ کے قرینہ سے ۔

یہاں اس آیت کے لیے اور کئی دوسری تفاسیر بھی بیان ہوئی ہیں ، منجملہ ان کے یہ ہے کہ اس سے مُراد یہ ہے کہ تو بے نام و نشان تھا ، خدا نے تجھے اس قدر بے نظیر نعمتیں عطا کیں کہ تو ہر جگہ پہچانا جانے لگا ۔

یا اس سے مُراد یہ ہے کہ تو اپنے بچپنے میں کئی مرتبہ گم ہوا ۔ (ایک دفعہ مکّہ کے دروں میں جب کہ تو عبدالمطلب کی پناہ میں تھا ، اور دوسری مرتبہ اس وقت جب تیری رضاعی ماں " حلیمہ سعدیہ " دُودھ پلانے کی مدّت کے اختتام پر تجھے مکّہ کی طرف لا رہی تھی تاکہ تجھے عبدالمطلب کے سپرد کرے تو تو راستہ میں گم ہوگیا ، اور تیسری مرتبہ اس وقت جب تو اپنے چچا ابوطالبؑ کے ساتھ اس قافلہ میں جو شام کی طرف جا رہا تھا ، ایک تاریک اور اندھیری رات میں گم ہوگیا تھا) اور خدا نے ان تمام موارد میں تیری رہنمائی کی ، اور تجھے تیرے جد یا چچا کی محبت بھری آغوش تک پہنچا دیا ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ " ضال " لغت کے لحاظ سے دو معانی کے لیے آیا ہے ، ۱ ۔ " گم شدہ " اور ۲ " گم راہ " مثلاً کہا جاتا ہے کہ : الحكمة ضالة المؤمن : " حکمت و دانش مومن کی گم شدہ چیز ہے " ۔

اور اسی مناسبت سے مخفی اور غائب کے معنی میں بھی آیا ہے جیسا کہ سُورہ سجدہ کی آیہ ۱۰ میں آیا ہے : منکرانِ معاد کہا کرتے تھے ءاذا ضللنا فی الارض ءانا لفی خلق جدید : کہ جب ہم زمین میں پنہاں اور غائب ہو جائیں گے تو پھر ایک نئی خلقت اختیار کریں گے " ؟ ۔

اگر زیرِ بحث آیت میں " ضال " " گم شدہ کے معنی میں ہو تو پھر کوئی مشکل پیش نہیں آتی ، (یعنی تو گم شدہ تھا لوگ تیری عظمت و شرافت سے ناواقف تھے ، پس ہم نے انہیں تیری طرف ہدایت کی ، ۔ مترجم)

اور اگر یہ " گمراہ کے معنی میں ہو تو اس سے مراد بعثت سے پہلے راہِ نبوت و رسالت تک دسترس نہ رکھنا ہوگی ، یا دوسرے لفظوں میں پیغمبر اپنی ذات میں کوئی چیز نہیں رکھتے تھے ، جو کچھ تھا وہ خدا کی طرف سے تھا ، اِس بنا پر دونوں ہی صورتوں میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی ۔

اس کے بعد تیسری نعمت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے : خدا نے تجھے فقیر پایا تو غنی و بے نیاز کر دیا " (ووجدك عائلاً فاغنیٰ)۔[1]

جناب " خدیجہؑ " جیسی مخلص و باوفا خاتون کی توجہ تیری طرف مبذول کی ، تاکہ وہ اپنی عظیم ثروت و دولت کو تیرے اختیار میں دے دے اور تیرے عظیم اہداف و مقاصد کے لیے وقف کر دے ۔ اور اسلام کے غلبہ کے بعد جنگوں میں بکثرت مال ہائے غنیمت تجھے عطا کیے ، اس طرح سے کہ تو اپنے عظیم مقاصد تک پہنچنے کے لیے بے نیاز ہو گیا ۔

ایک روایت میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے ان آیات کی تفسیر میں اس طرح فرمایا ،

" الم یجدك یتیماً فاٰوی قال : فردًا لا مثل لك فی المخلوقین ، فاٰوی الناس الیك ،
ووجدك ضالاً ای ضالة فی قوم لا یعرفون فضلك فھداھم الیك ،
ووجدك عائلاً تعول اقواماً بالعلم فاغناھم بك "

" کیا ہم نے تجھے اپنی مخلوق کے اندر یتیم یعنی بے نظیر فرد نہیں پایا تو ہم نے لوگوں کو تیری پناہ میں دے دیا ، اور تجھے اپنی قوم کے درمیان گمشدہ اور ناپہچانا ہوا پایا ، جو تیرے مقام فضل کو نہیں پہچانتے تھے ، تو خدا نے انہیں تیری طرف ہدایت کی اور تجھے علم و دانش میں اقوام عالم کا سرپرست قرار دیا اور انہیں تیرے ذریعے بے نیاز کر دیا ۔[2]

البتہ یہ حدیث آیت کے بطون کو بیان کرتی ہے ورنہ آیت کا ظاہر وہی ہے ، جو اوپر بیان کیا گیا ۔

لیکن یہ تصور نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ امور جو آیت کے ظاہر میں بیان ہوئے ہیں پیغمبرؐ کے مقام بلند میں کمی اور نقص کا سبب ہیں یا آپ کے بارے میں پروردگار کی طرف سے منفی توصیف ہے ۔ بلکہ یہ تو حقیقت میں الطاف الٰہی اور اس عظیم پیغمبرؐ کے بارے میں اس کے اکرام و احترام کا بیان ہے ، جب محبوب دلباختہ عاشق کے بارے میں اپنے لطف و کرم کی بات کرتا ہے تو یہ خود ایک لطف و محبت ہے اور اس کے لطف خاص کی دلیل ہے اور اسی بنا پر محبوب کی طرف سے ان الفاظ کے سننے سے اس کی روح تازہ ہو جاتی ہے ، اور اس کی جان میں صفا پیدا ہوتی ہے ، اور اس کے دل کو آرام و سکون حاصل ہوتا ہے ۔

بعد والی آیات میں گزشتہ آیات سے نتیجہ نکالتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تین احکام دیتا ہے ، اگرچہ ان میں مخاطب رسول اللہؐ کی ذات گرامی ہے ، لیکن یقیناً وہ سب کو شامل ہیں ، پہلے فرماتا ہے : " جب معاملہ یہ ہے تو پھر یتیم کی تحقیر و تذلیل نہ کر " (فاما الیتیم فلا تقھر) ۔

" تقھر " " قھر " کے مادہ سے " مفردات " میں " راغب " کے قول کے مطابق ، اس غلبہ کے معنی میں ہے جس کے ساتھ

---

[1] " عائل " اصل میں عیال دار شخص کے معنی میں ہے ، چاہے وہ غنی و تونگر ہو ، لیکن یہ لفظ فقیر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ اور زیر بحث آیت میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے ۔ " راغب " کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر " عال " اجوف یائی ہو تو فقیر کے معنی میں ہے ، اور اجوف واوی ہو تو کثیر العیال کے معنی میں ہوتا ہے ، (لیکن ان دونوں کا لازم و ملزوم ہونا بعید نہیں ہے) ۔

[2] مجمع البیان ، جلد ۱۰ ص ۵۰۶

تحقیر ہو، لیکن ان دو معانی میں سے ہر ایک کے لیے علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے، اور یہاں مناسب وہی "تحقیر" ہی ہے۔

یہ چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ یتیموں کے بارے میں اگرچہ اطعام و انفاق کا مسئلہ بھی اہم ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم دل جوئی و نوازش اور شفقت کی کمی کو رفع کرنا ہے۔ اسی لیے ایک مشہور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من مسح علی رأس یتیم کان لہ بکل شعرۃ تمر علی یدہ نور یوم القیامۃ"

"جو شخص نوازش و مہربانی کے ساتھ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرے تو ہر بال کی تعداد کے مطابق جس پر اس کا ہاتھ پھرے گا قیامت میں ایک نور ہوگا۔" [1]

گویا خدا پیغمبرؐ سے فرماتا ہے: تو خود بھی یتیم تھا، اور تُو نے بھی یتیمی کا رنج اور تکلیف اُٹھائی ہے، تو اب تو دل و جان سے یتیموں کی نگہبانی کر، اور ان کی پیاسی رُوح کو محبت کے ساتھ سیراب کر۔

بعد والی آیت میں دُوسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اور سوال کرنے والے کو نہ دھتکار" (واما السائل فلا تنھر)۔

"لا تنھر" "نھر" کے مادہ سے "سختی کے ساتھ دھتکارنے" کے معنی میں ہے۔ اور بعید نہیں ہے کہ اس کی اصل "نھر" ہو اور جاری پانی کی نہر کے معنی کے ساتھ ایک ہو، کیونکہ وہ بھی پانی کو شدت کے ساتھ دھکیلتی ہے۔

اِس بارے میں کہ یہاں "سائل" سے کون مراد ہے؛ چند تفسیریں موجود ہیں، پہلی یہ کہ اس سے ایسے افراد مُراد ہیں جو علمی، اعتقادی اور دینی مسائل میں سوالات رکھتے ہیں، اور قرینہ اس کا یہ ہے کہ یہ حکم اس چیز پر جو گزشتہ آیات میں آیا ہے متفرع ہے "ووجدک ضالا فھدی" "خُدا نے تجھے گم شُدہ پایا تو تجھے ہدایت کی، پس اس ہدایتِ الٰہی کے شکرانے کے طور پر تو بھی ہدایت کے نیازمندوں کے لیے کوشاں رہ، اور کسی ہدایت کا تقاضا کرنے والے کو اپنے پاس سے نہ دھتکار۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مُراد ایسے لوگ ہیں جو مادّی لحاظ سے فقیر ہیں اور وہ تیرے پاس آتے ہیں، تو جتنی تجھ میں طاقت ہے اس کے مطابق عمل کر اور انہیں مایوس نہ کر اور اپنے پاس سے نہ دھتکار۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ یہ فقرِ علمی اور فقرِ مادّی دونوں کو بیان کر رہی ہے، اور اس کا حکم یہ ہے کہ ہر قسم کا سوال کرنے والے کو مثبت جواب دے، یہ معنی پیغمبرؐ کے لیے خدا کی ہدایت کے ساتھ بھی مناسبت رکھتا ہے، اور ان کی یتیمی کے زمانے میں ان کی سرپرستی سے بھی مناسبت رکھتا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض مفسّرین نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ سائل سے مراد یہاں صرف علمی مسائل کے بارے میں سوال کرنے والا ہے، یہ کہا ہے کہ "سائل کی تعبیر قرآن مجید میں ہرگز مالی تقاضا کرنے والوں کے لیے نہیں آئی۔" [2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۶

[2] "تفسیر عبدہ"، جزء عم ص ۱۱۳

حالانکہ یہ قرآن میں بارہا اس معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ سورہ ذاریات کی آیہ ۱۹ میں آیا ہے : وفی اموالھم حق للسائل والمحروم ؛ " ان کے مالوں میں سائل اور محروم کے لیے حق ہے اور یہی معنی سورہ معارج کی آیہ ۲۵ اور سورہ بقرہ کی آیہ ۱۷۷ میں بھی آیا ہے۔

اور آخر میں تیسرے اور آخری حکم میں فرماتا ہے : اور باقی رہیں تیرے پروردگار کی نعمتیں تو تُو ان کو بیان کر " (واما بنعمة ربك فحدث)۔

نعمت کو بیان کرنا کبھی تو زبان سے ہوتا ہے اور ایسی تعبیروں سے جو انتہائی شکر و سپاس کی ترجمان ہوتی ہیں، نہ کہ غرور و تکبر اور برتری کے خیال سے، اور کبھی عمل سے بھی ہوتا ہے، اس طرح کہ اس سے راہِ خدا میں انفاق و بخشش کرے، ایسی بخشش جو اس بات کی نشان دہی ہو کہ خدا نے اُسے فراواں نعمت عطا کی ہے۔

یہ سخی اور کریم لوگوں کی سُنّت ہے کہ جب انہیں کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ اُسے بیان کرتے ہیں اور خدا کا شکر بجا لاتے ہیں۔ اور ان کا عمل بھی اس حقیقت کی تائید و تاکید کرتا ہے۔ پست ہمت بخیلوں کے برعکس جو ہمیشہ نالہ و فریاد کرتے ہیں، اور اگر ساری دنیا بھی انہیں دے دیں، تو بھی نعمتوں پر پردہ پوشی ہی کرتے رہتے ہیں۔ ان کا چہرہ فقیرانہ اور ان کی باتیں آہ و زاری کے ساتھ، اور ان کا عمل بھی فقر و فاقہ کو بیان کرنے والا ہوتا ہے۔

یہ اس حالت میں ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

" ان اللہ تعالیٰ اذا انعم علی عبد نعمة یحب ان یری اثر النعمة علیه "[1]

" خداوندِ عالم جب کسی بندے کو کوئی نعمت عطا کرتا ہے، تو وہ اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ اس پر نعمت کے آثار دیکھے "

اس بنا پر آیت کے معنی کا ماحصل اس طرح ہے : اس بات کے شکرانے میں کہ تو فقیر تھا اور خدا نے تجھے بے نیاز کیا ہے، تُو بھی نعمت کے آثار کو آشکار کر، اور گفتار و عمل سے اس خدائی نعمت کو بیان کر۔

لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں " نعمت " سے مُراد صرف معنوی نعمتیں ہیں، منجملہ ان کے نبوّت یا قرآن مجید ہے کہ پیغمبرؐ اس کی تبلیغ کے ذمہ دار تھے، اور نعمت کو بیان کرنے سے مُراد یہی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تمام مادّی و معنوی نعمتوں کو شامل ہو۔

لہٰذا ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا : کہ آیت کا معنی اس طرح ہے :

حدث بما اعطاك اللہ، وفضلك، ورزقك، واحسن الیك وهداك :

" جو کچھ خدا نے تجھے بخشا ہے، برتری دی ہے، روزی عطا کی ہے، اور تیرے ساتھ نیکی اور احسان کیا ہے اور تجھے ہدایت کی ہے، ان سب کو بیان کر "[2]

---

[1] " نہج الفصاحۃ " حدیث ۶۸۳

[2] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۰۷

اور بالآخر ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک دستور کلی کے عنوان سے آیا ہے :

" من اعطی خیرًا فلم یر علیہ ، سمی بغیض اللہ معادیًا لنعم اللہ "

" جس شخص کو کوئی خیر و نعمت دی جائے ، لیکن اس کی شخصیت میں اُس کے آثار نظر نہ آئیں تو اُسے خدا کا دشمن اور اس کی نعمتوں کا مخالف شمار کرنا چاہیئے "[1]

ہم اس گفتگو کو امیر المومنینؑ کی ایک دوسری حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں ، آپؑ نے فرمایا :

" ان اللہ جمیل یحب الجمال ، و یحب ان یری اثر النعمۃ علی عبدہ "

" خدا جمیل ہے اور وہ جمال و زیبائی کو دوست رکھتا ہے ، اور اسی طرح سے وہ اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کے آثار دیکھے "[2]

چند نکات

۱۔ مصائب و آلام کے درمیان سے مبعوث ہونے والا پیغمبر

اُوپر والی آیات جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خدا کی نعمتوں کی تشریح و تفصیل کو بیان کرتی ہیں ، ضمنی طور پر اس نکتہ کو بھی بیان کرتی ہیں کہ آپ بچپن کے آغاز سے ہی یتیم تھے ، مادی لحاظ سے سخت و شدید حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے ، مصائب و آلام میں گھرے ہوئے تھے اور اُنہیں مصائب میں مبعوث ہوئے تھے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے ۔

ایک خُدائی اور انسانی رہبر کو زندگی کی تلخیوں کو چکھنا ، پریشانیوں کو ذاتی طور پر لمس کرنا ، اور اپنے سارے وجود کے ساتھ تلخیوں کا احساس کرنا چاہیئے تاکہ معاشرے کے محروم طبقات کی صحیح طور سے قدر کر سکے ، اور ایسے لوگوں کے حالات سے جو مصائب و آلام میں مبتلا ہیں باخبر ہو سکے ۔

پھر بچپن میں ہی باپ کی شفقت) سے محروم ہو جائے ، تاکہ اپنے یتیم بچوں کی مصیبت سے باخبر رہے ، دن اس کے بھوک میں گزریں ، اور راتوں کو بھوکا سوئے تاکہ بھوکوں کے درد اور تکلیف کو اپنے سارے وجود کے ساتھ محسوس کرے ۔

یہی وجہ ہے کہ جب آپ کسی یتیم کو دیکھتے تھے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے ۔ اُسے اپنی گود میں بٹھاتے تھے ، اس پر نوازش و شفقت کرتے تھے ، اور اپنی جان نثریں کی طرح اپنی آغوش میں لے لیتے تھے ۔

اور پھر اس نے معاشرے کے تمدن میں فقر کو اچھی طرح سے درک کیا ہو ، تاکہ جو لوگ علم و دانش کے حصول کے لیے اس کی خدمت میں آئیں ان کا احترام کرے ، اور کھلی آغوش کے ساتھ اُن کی پذیرائی کرے ۔

نہ صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلکہ شاید تمام کے تمام انبیاء مصائب اور محرومیوں کے پروردہ تھے ، اور نہ صرف انبیاء بلکہ تمام سچے اور موفق رہبر ایسے ہی ہوئے ہیں اور انہیں ایسا ہی ہونا چاہیئے ۔

---

[1] "تفسیر قرطبی" جلد ۱۰ ص ۷۱۹۲ ، اسی معنی کے قریب قریب کافی جلد ۶ ۔ کتاب الزی والتجمل حدیث ۲ میں بھی آیا ہے ۔

[2] فروع کافی جلد ۶ ص ۴۳۸ حدیث

جس شخص نے ناز و نعمت کے درمیان پرورش پائی ہو ، شان و شوکت والے محلوں میں زندگی بسر کی ہو ، اُس نے جب بھی کوئی خواہش کی ہو وہ پُوری ہوگئی ہو ، وہ محروم لوگوں کے درد و تکلیف کو کس طرح سے درک کر سکتا ہے، اور فقراء و مساکین کے کاشانوں اور یتیموں کے گھروں کا منظر اُس کی نظروں میں کیسے مجسم ہو سکتا ہے اور وہ ان کی کمک اور مدد کے لیے بے تابی کے ساتھ کیسے آگے بڑھ سکتا ہے؟!

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے آیا ہے :

"ما بعث الله نبیا قط حتی یسترعیه الغنم لیعلمه بذلك رعیة الناس"

" خدا نے ہرگز کسی پیغمبر کو مبعوث نہیں کیا جب تک اس سے بھیڑ بکریوں کی چوپانی کا کام نہیں کرایا ، تاکہ وہ اس طریقہ سے انسانوں کی نگہبانی کا طریقہ سیکھ سکیں "[1]

یعنی ایک تو رنج و تکلیف برداشت کیا ، دوسرے کم شعور افراد کے مقابلہ میں صبر و تحمل کا تجربہ کیا اور کوہ و صحرا اور فطرت و مادّہ کی آغوش میں توحید و عرفان کے عظیم سبق حاصل کیے ۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ " موسیٰ بن عمران " نے اپنے خدا سے سوال کیا کہ میں کس بنا پر اس مقام تک پہنچا ؟ خطاب قدرت ہوا ، کیا تجھے وہ دن یاد ہے جب گوسفند کا ایک بچہ تیرے گلہ سے بھاگ گیا تھا ، تُو اُس کے پیچھے گیا اور اس کو پکڑ لیا ، اور اس سے کہا : اے حیوان ! تُو نے اپنے آپ کو کیوں تھکا لیا ؟ پھر تُو اُس کو دوش پر اُٹھا کر گوسفندوں کے گلہ میں واپس لے آیا ، مَیں نے اسی بنا پر تجھے مخلوق کا سرپرست بنا دیا ہے ۔ (ایک جانور کے مقابلہ میں تیرا یہ عجیب و غریب تحمل و حوصلہ ، تیری عظیم روحی قدرت کی دلیل ہے ۔ لہٰذا تو اس عظیم مقام کے لائق ہے) ۔

۲ ۔ یتیموں پر نوازش و شفقت

چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کا وجود ، جو بچپنے میں اپنے باپ (کی شفقت) سے محروم ہو چکے ہوں ، ہر معاشرے میں اجتناب ناپذیر ہے ۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی کئی جہات سے حمایت ہونی چاہیئے ۔

شفقت و مہربانی کے لحاظ سے بہت سی محرومیاں ہوتی ہیں ۔ اگر ان کے وجود کا خلا اس لحاظ سے پر نہ ہو تو غیر صحیح ، غیر سالم اور بہت سے مواقع پر سنگ دل ، مجرم اور خطرناک بچے پروان چڑھتے ہیں ۔ علاوہ ازیں عواطف انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ تمام لوگ ان کی طرف معاشرے کے تمام بچوں کی طرح توجہ اور حمایت کریں ۔ اور ان تمام باتوں سے قطع نظر لوگ اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں جو ممکن ہے انہیں حالات سے دوچار ہو جائیں ، مطمئن ہوں ۔

بہت سے موارد میں یتیم بچے ایسے مال کے مالک ہوتے ہیں جسے دقت و امانت کے ساتھ ان کے مستقبل کے لیے محفوظ رکھنا چاہیئے ۔ اور بہت سے موارد میں ان کے ہاں مالی امکانات و وسائل کا فقدان ہوتا ہے ۔ لہٰذا انہیں اس لحاظ سے بھی مورد توجہ ہونا چاہیئے اور دوسرے لوگوں کو ، مہربان ماں باپ کی طرح ، ان کی رُوح سے یتیمی کے رنج اور تکلیف کو دُور کرنا چاہیئے اور تنہائی کے گرد و غبار کو ان کے

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۱۱ ص ۶۴ حدیث ۷

چہرے سے ہٹا دینا چاہیئے۔

اسی لیے قرآن مجید کی آیات، اور بہت سی اسلامی روایات میں اس مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے جس میں اخلاقی پہلو بھی ہے اور معاشرتی اور انسانی پہلو بھی۔

یہ حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معروف ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"ان الیتیم اذا بکی اھتز لبکائہ عرش الرحمٰن"[1]:

"جب یتیم روتا ہے تو خدائے رحمان کا عرش لرز اُٹھتا ہے"۔

"خدا اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے: اے میرے فرشتو! اس یتیم کو جس کا باپ مٹی میں رُوپوش ہوگیا ہے، کس نے رُلادیا؟ فرشتے کہتے ہیں: خدایا تُو زیادہ بہتر طور سے جانتا ہے۔ خدا فرماتا ہے: اے میرے فرشتو! میں تمہیں گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ جو شخص اس کو رونے سے خاموش کرے گا، اور اس کے دل کو خوش کرے گا میں قیامت کے دن اسے خوش کروں گا"[2]

اس سے بالاتر ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"اذا بکی الیتیم وقعت دموعہ فی کف الرحمٰن"[3]

"جب یتیم روتا ہے تو اس کے آنسو خدائے رحمٰن کے ہاتھ میں پڑتے ہیں"۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"انا وکافل الیتیم کھاتین فی الجنۃ اذا اتقی اللہ عزوجل واشار بالسبابۃ والوسطی"[4]:

"میں اور یتیم کا سرپرست ان دو کی طرح جنت میں ہوں گے، بشرطیکہ وہ خوفِ خدا اور تقویٰ رکھتا ہو۔ پھر آپؐ نے انگشتِ شہادت اور درمیانی اُنگلی کی طرف اشارہ کیا"۔

اس موضوع کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ امیرالمومنین علی علیہ السلام نے اپنے مشہور وصیت نامہ میں یتیموں کی طرف توجہ اور دھیان دینے کو نماز و قرآن کی طرف توجہ کرنے کے ساتھ قرار دیا ہے، فرماتے ہیں:

"اللہ اللہ فی الایتام فلا تغبوا افواھھم ولا یضیعوا بحضرتکم"[5]:

"خدا کو یاد رکھو، خدا کو یاد رکھو! یتیموں کو کبھی سیر اور کبھی بھوکا نہ رکھو، اور تمہارے سامنے وہ ضائع نہ ہوں"۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۶۔

[2] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۱ ص ۲۱۹۔

[3] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۵۹۷ حدیث ۲۳۔

[4] "نہج البلاغہ" خط نمبر ۴۷ حصۂ خطوط۔

ایک حدیث میں پیغمبرؐ کے ایک صحابی سے آیا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم رسولِ خداؐ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بچہ آپؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: "میں ایک یتیم بچہ ہوں، میری ایک یتیم بہن ہے، اور ایک بیوہ ماں ہے، جو کچھ خدا نے آپ کو کھانے کے لیے دیا ہے اس میں سے ہمیں بھی کھلائیے تاکہ خدا کے پاس جو کچھ ہے اس میں سے وہ آپؐ کو اس قدر دے کہ آپؐ راضی اور خوش ہو جائیں"!

پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

"بیٹا تم نے کتنی اچھی بات کہی ہے! پھر آپؐ نے حضرت بلالؓ کی طرف رُخ کرکے فرمایا: جاؤ اور جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ لے آؤ - بلال اکیس خرمے کے دانے لے آئے پیغمبرؐ نے فرمایا: سات دانے تیرے لیے، سات دانے تیری بہن کے لیے اور سات دانے تیری ماں کے لیے"۔

"معاذ بن جبلؓ" اُٹھے اور یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا: خدا تیری یتیمی کی تلافی کرے اور تجھے اپنے باپ کا اچھا جانشین بنائے۔ (یتیم بچہ مہاجرین کی اولاد میں سے تھا)۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے "معاذ" کی طرف رُخ کرکے فرمایا:

"تیرے اس کام کا کیا سبب تھا؟" اُس نے عرض کیا: محبت اور رحمت تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص تم میں سے کسی یتیم کی سرپرستی اپنے ذمہ لے، اور اس کا حق ادا کرے اور یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرے تو خدا ہر بال کی تعداد میں اس کے لیے ایک نیکی تحریر کرے گا اور ہر بال کی تعداد میں اس کی بُرائیوں کو محو کر دے گا، اور ہر بال کے بدلے اس کو ایک درجہ عطا کرے گا"۔ [1]

البتہ ایسے وسیع معاشروں میں جیسا کہ آج کے معاشرے ہیں، مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اس سلسلے میں انفرادی کاموں پر قناعت نہ کریں، بلکہ انہیں چاہیئے کہ اپنی توانائیوں کو یکجا طور پر استعمال کرتے ہوئے یتیموں کو اقتصادی، علمی اور تربیتی پروگراموں کے ذریعے کارآمد بنائیں اور انہیں اسلامی معاشرے کے لائق افراد بنائیں۔ اور یہ اہم کام عمومی تعاون کا محتاج ہے۔

۳۔ نعمتوں کو بیان کرنا

وہ حکم جو اس سلسلہ میں اُوپر والی آیات میں بیان ہوا ہے، اگر وہ خدا کے شکر و سپاس کے عنوان سے ہو، اور خود کو بڑا کرکے دکھانے اور فخر کے عنوان سے نہ ہو، تو وہ نہ صرف انسان کو پروردگار کے مقام عبودیت میں تکامل و ارتقاء بخشتا ہے اور اجتماعی مثبت اثرات رکھتا ہے، بلکہ خود انسان کی رُوح و جان میں بھی آرام بخش اثر چھوڑتا ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۰۶

خدا کی نعمتوں کے ذکر کرنے سے انسان اپنے پاس کسی چیز کے کم ہونے کا احساس ہی نہیں کرتا، بیماری کا شکوہ نہ کرنے سے دوسرے اعضاء کی سلامتی پر شکرگزار ہوتا ہے، کسی چیز کے کھوئے جانے پر جزع و فزع نہ کرنے سے وہ اپنے باقی امکانات و وسائل کو بیان کرتا ہے۔

اس قسم کے افراد زندگی کی سختیوں اور طوفانوں میں یاس و نا اُمیدی میں گرفتار نہیں ہوتے اور نہ ہی مضطرب و پریشان ہوتے ہیں۔ ان کی رُوح سکون و آرام میں، اور دل مطمئن ہوتا ہے۔ اور مشکلات سے مقابلہ کرنے میں ان میں زیادہ توانائی ہوتی ہے۔

خداوندا! تیری نعمتیں اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ انہیں بیان کیا جا سکے، ان کو ہم سے سلب نہ کرنا، اور اپنے فضل و کرم سے ان میں اضافہ فرمانا۔

پروردگارا! ہم اس دنیا میں تیرے احسان میں غرق ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ اُس جہان میں بھی اسی طرح ہوں۔

بارالہا! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم ہمیشہ محروم لوگوں کے پشتیبان اور یتیموں کے حقوق کے محافظ ہوں۔

❖ ❖ ❖

آمین یارب العالمین

سُورہ "والضحیٰ" کا اِختتام

اِختتام ترجمہ

قم مقدس برمکان حقیر

۱۳ رمضان ۱۴۰۸ھ بروز ہفتہ

گیارہ بج کر اکتالیس منٹ صبح

سورہ الم نشرح

❖ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا

❖ اس میں ۸ آیات ہیں

سُورہ "الم نشرح" کے مضامین اور اس کی فضیلت

مشہور یہ ہے کہ یہ سُورہ ، سُورہ والضحیٰ کے بعد نازل ہوا ہے اور اس کے مضامین بھی اسی مطلب کی تائید کرتے ہیں، کیونکہ اس سُورہ میں بھی پھر سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خدا کی نعمتوں کے ایک حصہ کو شمار کیا گیا ہے۔ حقیقت میں تین قسم کی عظیم نعمتیں سُورہ والضحیٰ میں آئی تھیں، اور تین ہی عظیم نعمتیں سُورہ الم نشرح میں آئی ہیں۔ گزشتہ نعمتوں میں تو بعض مادی اور بعض معنوی تھیں، لیکن اس سُورہ کی تمام نعمتیں معنوی پہلو رکھتی ہیں اور یہ سُورہ خصوصیت کے ساتھ تین محوروں کے گرد گردش کرتا ہے :

ایک تو انہی تینوں نعمتوں کا بیان ہے ، دوسرا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مستقبل میں ان کی دعوت کی مشکلات کے برطرف ہونے کے لحاظ سے بشارت ہے ، اور تیسرا خداوند یگانہ کی طرف توجہ اور اس کی عبادت و بندگی کی طرف تحریص و ترغیب۔

اسی بنا پر روایات اہل بیت میں ــ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے ــ یہ دونوں ایک ہی سورہ شمار ہوئی ہیں، اسی لیے قرأت نماز میں اس بنا پر کہ ایک مکمل سُورت پڑھی جائے ، دونوں کو اکٹھا پڑھتے ہیں۔

اہل سُنّت میں بھی بعض حضرات اسی نظریہ کے طرف دار ہیں جیسا کہ فخر رازی نے طاؤس اور عمر بن عبدالعزیز سے نقل کیا ہے کہ وہ بھی یہی کہا کرتے تھے کہ یہ دونوں سورتیں ایک ہی سورت ہیں اور وہ ایک رکعت میں دونوں کو تلاوت کیا کرتے تھے ، البتہ وہ ان دونوں کے درمیان بسم اللہ کو حذف کر دیتے تھے۔ (لیکن ہمارے فقہا کے مطابق بسم اللہ دونوں میں ہونا چاہیے، اور یہ جو مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ ہمارے فقہا بسم اللہ کو حذف کرتے ہیں درست نظر نہیں آتا)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ فخر رازی ان لوگوں کا قول نقل کرنے کے بعد جو ان دونوں کو ایک سُورہ کہتے ہیں، کہتا ہے کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ان دونوں کے مضامین ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سُورہ والضحیٰ اس وقت نازل ہوا جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار کی اذیت رسانی سے پریشان تھے اور سختی اور غم و اندوہ میں بسر کر رہے تھے، حالانکہ دوسری سُورت اس وقت نازل ہوئی جب کہ پیغمبرؐ

خوش حال و شادمان تھے ، تو یہ دونوں چیزیں ایک دُوسرے کے ساتھ کیسے جمع ہو سکتی ہیں ؟[1]

لیکن یہ استدلال عجیب ہے کیونکہ دونوں سورتیں پیغمبر کی گزشتہ زندگی کی بات کر رہی ہیں ، اور یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ آپ بہت سی مشکلات کو پیچھے چھوڑ چکے تھے ، اور آپ کا پاک دل اُمید و سرور میں غرق تھا ۔ یہ دونوں سُورتیں خدا کی نعمتوں کی بات کر رہی ہیں، اور سختی اور مشکلات سے پُر ماضی کی یاد دلا رہی ہیں ، تاکہ پیغمبرؐ کے دل کی تسلی اور زیادہ سے زیادہ کامل اُمید کا باعث ہو ۔

بہر حال ان دونوں سورتوں کے مضامین کا قریبی تعلق ایسی چیز نہیں ہے جو شک اور تردید کے قابل ہو ، اسی معنی کی نظیر سورہ فیل اور سورہ قریش میں بھی آئے گی ۔ انشاء اللہ ۔

اس بارے میں کہ یہ سورہ (الم نشرح) مکہ میں نازل ہوا ہے یا مدینہ میں ، اُوپر والے بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہوا ہے ، لیکن آیہ ورفعنا لك ذکرک "ہم نے تیرے ذکر کو بلند کیا" کی طرف توجہ کرتے ہوئے بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوا ہے ، اس وقت جب کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی تھی ۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ دلیل اطمینان بخش نہیں ہے کیونکہ پیغمبرؐ کی شہرت ، ان تمام مشکلات کے باوجود ، جو آپ کو مکہ میں درپیش تھیں ، ہر طرف پھیل چکی تھی ، اور تمام محفلوں میں آپ کے قیام ، رسالت اور دعوت کے بارے میں چرچے ہو رہے تھے اور حج کے سالانہ اجتماع کے ذریعے یہ شہرت حجاز کے دوسرے علاقوں خصوصاً مدینہ میں پہنچ چکی تھی ۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلے میں ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

" من قرأها اعطی من الاجر کمن لقی محمدًا ص مغتمًا ففرج عنه "

" جو شخص اس سُورہ کو پڑھے اس کو اس شخص کا اُجر ملے گا ، جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غمگین دیکھا اور آپؐ کے قلب مُبارک سے غم و اندوہ کو دُور کیا ہو "[2]

❖ ❖ ❖

---

[1] " تفسیر فخر رازی " جلد ۳۲ ص ۲

[2] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۰۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝
۲۔ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝
۳۔ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝
۴۔ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝
۵۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝
۶۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝
۷۔ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝
۸۔ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خُدا کے نام سے

۱۔ کیا ہم نے تیرے سینہ کو کُشادہ نہیں کیا؟
۲۔ اور تجھ سے بھاری بوجھ برطرف نہیں کیا؟
۳۔ وہی بوجھ جو تیری پُشت کو جُھکائے دے رہا تھا۔

۴۔ اور تیرے ذکر کو ہم نے بلند کیا۔

۵۔ اس بنا پر یقینی طور پر سختی کے ساتھ آسانی ہے۔

۶۔ اور یقیناً سختی کے ساتھ آسانی ہے۔

۷۔ پس جب تو ایک اہم کام سے فارغ ہو جائے تو دوسری مہم کو شروع کر دے۔

۸۔ اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ اور رغبت کر۔

تفسیر

ہم نے تجھے انواع و اقسام کی نعمتیں عطا کی ہیں

آیات کا لب ولہجہ پروردگار کے حد سے زیادہ لطف و محبت، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی و دلداری کے پہلو رکھتا ہے۔

پہلی آیت میں خدا کی اہم ترین نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا ہم نے تیرے سینہ کو کشادہ نہیں کیا" (الم نشرح لك صدرك)۔

"نشرح" "شرح" کے مادہ سے، مفردات میں راغب کے قول کے مطابق اصل میں گوشت کے ٹکڑوں کو کشادہ کرنے اور زیادہ نازک اور پتلے ورق بنانے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ شرح صدر سے مراد نور الٰہی اور خداداد سکون و آرام کے ذریعے اس کو وسیع کرنا ہے، اور اس کے بعد کہتا ہے: گفتگو اور کلام کی مشکلات کی شرح کرنا، اس کو پھیلانے اور اس کے مخفی معانی کی وضاحت کرنے کے معنی میں ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں ہے کہ یہاں شرح صدر سے مراد اس کا کنائی معنی ہے۔ اور وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح و فکر کو وسعت دینا ہے اور یہ وسعت ممکن ہے کہ ایک وسیع مفہوم رکھتی ہو جو وحی و رسالت کے طریق سے پیغمبرؐ کے وسعت علم کو بھی شامل رکھتا ہو اور دشمنوں اور مخالفین کی ہٹ دھرمیوں اور کارشکنیوں کے مقابلہ میں آپ کے تحمل و استقامت میں وسعت و کشادگی کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہو۔

اسی لیے جب موسیٰ علیہ السلام بن عمران، فرعون جیسے سرکش کی دعوت پر مامور ہوئے، اذهب الى فرعون انه طغى "فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے"، تو بلا فاصلہ عرض کرتے ہیں: رب اشرح لی صدری ویسرلی امری "پروردگار میرے سینہ کو کشادہ کر دے اور میرے کام کو آسان کر دے" (طٰہٰ ۔ ۲۵ ۔ ۲۶)

دوسرے مقام پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے فاصبر لحكم ربك ولا تكن كصاحب الحوت

اب جب کہ یہ حال ہے تو اپنے پروردگار کے حکم کا منتظر رہ، اور استقامت اور صبر و شکیبائی اختیار کر اور یونس کی طرح نہ ہو (جو ضروری و لازمی صبر و شکیبائی کو ترک کرنے کی بنا پر ان تمام مشکلات اور تلخیوں میں گرفتار ہوا)۔ (قلم - ۴۸)

شرح صدر حقیقت میں ضیق صدر کا نقطۂ مقابل ہے جیسا کہ سورہ حجر کی آیہ ۹۷ میں آیا ہے۔ ولقد نعلم انك یضیق صدرك بما یقولون: "ہم جانتے ہیں کہ تیرا سینہ ان کی (مغرضانہ) باتوں سے تنگ ہو جاتا ہے"۔ اصولی طور پر کوئی عظیم رہبر شرح صدر کے بغیر مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اور وہ شخص جس کی رسالت سب سے زیادہ عظیم ہے۔ (جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تھی) تو اس کا شرح صدر سب سے زیادہ ہونا چاہیئے۔ ابتلاؤں کے طوفان اس کی روح کے سمندر کے سکون و آرام کو درہم و برہم نہ کریں، اور مشکلات سے اس کے گھٹنے نہ ٹک جائیں، دشمنوں کی کارشکنیاں اسے مایوس نہ کریں، پیچیدہ مسائل کے سوالات اُسے ہر طرف سے مجبور کر کے لاجواب نہ کر دیں، اور یہ خدا کا رسولؐ اللہ کے لیے ایک عظیم ترین ہدیہ تھا۔

اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"میں نے اپنے پروردگار سے ایک درخواست کی، حالانکہ میں چاہتا تھا کہ یہ درخواست نہ کرتا۔ میں نے عرض کیا مجھ سے پہلے پیغمبروں میں سے بعض کو ہوا کے چلنے پر اختیار دیا، بعض مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ خدا نے مجھ سے فرمایا: کیا تو یتیم نہیں تھا تو میں نے تجھے پناہ دی؟ میں نے عرض کیا، ہاں! فرمایا: کیا تو گمشدہ نہیں تھا، میں نے تجھے ہدایت کی؟ میں نے عرض کیا، ہاں! اے پروردگار! فرمایا: کیا میں نے تیرے سینہ کو کشادہ اور تیری پشت کے بوجھ کو ہلکا نہیں کیا؟ میں نے عرض کیا، ہاں! اے پروردگار!"[1]

یہ چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ "شرح صدر" کی نعمت انبیاء کے معجزات سے مافوق تھی، اور واقعاً اگر کوئی شخص پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات کا باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرے اور آپ کے شرح صدر کا اندازہ آپ کی زندگی کے دور کے سخت اور پیچیدہ حوادث سے لگائے، تو وہ یقین کر لے گا کہ یہ چیز عام طریقہ سے ممکن نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تائید الٰہی اور توفیق ربانی ہے۔

اس مقام پر بعض نے یہ کہا ہے کہ اس شرح صدر سے مراد وہی حادثہ ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بچپن یا جوانی میں پیش آیا تھا کہ آسمان سے فرشتے اُترے، آپ کا سینہ شگافتہ کیا، آپ کے دل کو باہر نکال کر اُسے پاک و صاف کیا، اور اس کو علم و دانش اور رافت و رحمت سے بھر دیا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس حدیث سے مراد یہ جسمانی دل نہیں ہے، بلکہ یہ روحانی اور پیغمبر کے عزم و ارادہ کی تقویت اور اس کی ہر قسم کے اخلاقی نقائص، اور وسوسۂ شیطانی سے پاکسازی کے لحاظ سے، خدائی امدادوں کی طرف، ایک کنایہ اور اشارہ ہے۔

لیکن بہر حال ہمارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ زیر بحث آیت خاص طور پر اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے، بلکہ

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۱۸

اس کا ایک وسیع مفہوم ہے کہ یہ داستان بھی اس کا ایک مصداق شمار ہو سکتی ہے۔

اسی شرح صدر کی بنا پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رسالت کی مشکلات کو اعلیٰ ترین صورت میں برداشت کیا اور اس طریقہ میں اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سے نبھایا۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "کیا ہم نے تیرے سنگین بوجھ کو اُٹھا نہیں لیا"؟ (ووضعنا عنك وزرك)۔

"وہی بوجھ جو تیری پُشت پر سخت گرانی کر رہا تھا" (الذی انقض ظهرك)۔

"وزر" لُغت میں بوجھ کے معنی میں ہے۔ "وزیر" کا لفظ بھی اسی معنی سے مشتق ہوا ہے چونکہ وہ حکومت کے سنگین بوجھ اپنے کندھے پر اُٹھاتا ہے۔ اور گناہوں کو بھی اسی بنا پر "وزر" کہتے ہیں، کیونکہ وہ گنہگار کے دوش پر ایک سنگین بوجھ ہوتا ہے۔

"انقض" "نقض" کے مادہ سے، رسّی کی گرہ کو کھولنے کے معنی میں ہے، یا کسی عمارت کے ایک دوسرے میں گھسے ہوئے حصّوں کو الگ کرنے کے معنی میں ہے، اور "انقاض" اس آواز کو کہا جاتا ہے جو کسی عمارت کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرتے وقت کان میں پڑتی ہے۔ یا کمر کے مہروں کی اس آواز کو کہتے ہیں جو سنگین بوجھ کے زیر بار آنے کے وقت آتی ہے۔

یہ لفظ عہد و پیمان اور معاہدوں کو توڑنے کے موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے نقضِ عہد کیا۔

اس طرح اُوپر والی آیت یہ کہتی ہے کہ: "خدا نے وہ سنگین اور کمر کو توڑنے والا بوجھ تجھ سے اُٹھالیا"۔

یہ کون سا بوجھ تھا جو خدا نے پیغمبرؐ کی پُشت سے اُٹھالیا؟ آیات کے قرائن اس بات کی اچھی طرح نشان دہی کرتے ہیں کہ اس سے مراد وہی رسالت و نبوت اور توحید و یکتا پرستی کی طرف دعوت کی مشکلات، اور اس آلودہ ماحول سے فساد کے آثار کو ختم کرنا ہے، نہ صرف پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلکہ سارے کے سارے انبیاؑ کا دعوت کے آغاز میں اس قسم کے عظیم مشکلات سے سامنا رہا، اور وُہ صرف خدائی امدادوں سے ہی ان پر کامیاب ہوتے تھے۔ البتہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماحول اور زمانہ کے حالات کئی جہات سے زیادہ سخت اور زیادہ سنگین تھے۔

بعض نے "وزر" کی تفسیر آغاز نزول میں "وحی" کے بارِ سنگین کے معنی میں بھی کی ہے۔

بعض نے مشرکین کی ضلالت و گمراہی اور عناد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ بھی۔

اور بعض نے ان کی حد سے زیادہ اذیت و آزار سے۔

اور بعض نے اس غم و اندوہ سے جو آپ کے چچا حضرت ابوطالبؑ اور آپؐ کی زوجہ حضرت خدیجہؑ کی وفات سے پیدا ہوا تھا۔

اور بعض نے گناہ سے عصمت و پاکیزگی کے مسئلہ سے تفسیر کی ہے۔

لیکن ظاہراً وہی پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے اور یہ سب اس کے شاخ و برگ ہیں۔

اور تیسری نعمت کے بارے میں فرماتا ہے: "ہم نے تیرے ذکر کو بلند کیا"[1] (ورفعنا لك ذكرك)۔

---

[1] "رفع" کی تعبیر "وضع" کے بعد اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ایک دوسرے کی ضد ہیں، یہاں ایک خاص لطف دیتی ہے۔

تیرا نام اسلام اور قرآن کے نام کے ساتھ ہر جگہ پہنچا۔ اور اس سے بہتر یہ ہے کہ تیرا نام ہر صبح و شام اذان کے گلدستوں پر اور اذان کے وقت اللہ کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اور تیری رسالت کی شہادت خدا کی توحید و یگانگت کی شہادت کے ساتھ اسلام کا نشان اور اس پاک دین کے قبول ہونے کی دلیل ہے۔

اس سے بڑھ کر فخر کی بات اور رفعت مقام کا اس سے بالاتر تصوّر اور کیا ہوگا ؟!

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

"جبرئیل نے مجھ سے کہا ہے کہ خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے : جس وقت میرا نام لیا جاتا ہے تو اس وقت تیرا نام بھی میرے ہی ساتھ لیا جاتا ہے۔" (اور تیرے مقام کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے)

"لک" (تیرے لیے) کی تعبیر اس بات کی تاکید کے لیے ہے کہ ہم نے تیرے نام اور شہرت کو ان تمام کارشکنیوں اور دشمنیوں کے باوجود بلند کیا۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا ہے، جب کہ اسلام کا پھیلنا اور پیغمبرؐ کے کاندھے سے رسالت کے بوجھ کا ہلکا ہونا اور اطراف عالم میں آپ کے نام کا بلند ہونا مدینہ میں ہوا ہے۔

اس سوال کے جواب میں بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی بشارت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلے سے دے دی گئی تھی، اور اسی چیز نے آپ کے دل سے غم و اندوہ کا بوجھ ہٹا دیا تھا۔

اور کبھی یہ کہا ہے کہ یہاں فعل "ماضی" "مستقبل" کا معنی دیتا ہے، اور یہ آئندہ کے لیے ایک خوشخبری ہے۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ ان امور میں سے بعض، مکہ میں ہی، خصوصاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تیرہ سالہ دور کے آخری حصہ میں ہی، جب کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں لوگوں کو دعوت دینے میں مشغول تھے، پورے ہو چکے تھے۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں ایمان و اسلام نفوذ کر چکا تھا اور مشکلات نسبتاً کم ہو چکی تھیں، اور پیغمبر اکرمؐ کا نام اور کام ہر جگہ پہنچ چکا تھا، اور آئندہ کی عظیم کامیابیوں کی تمہید فراہم ہو چکی تھی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "حسان بن ثابت" پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشہور شاعر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں اس آیت کے مضمون کی طرف بڑے خوبصورت انداز میں اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے :

"وضم الاله اسم النبی الی اسمه
اذا قال فی الخمس المؤذن اشهد
و شق له من اسمه ليجله
فذو العرش "محمود" وهذا "محمد"

"خدا نے پیغمبرؐ کا نام اپنے نام کے ساتھ ضم کر دیا ہے"
جب کہ مؤذن پانچ مرتبہ اشهد ..... کہتا ہے۔

اس نے اپنے نام سے اس کے نام کو مشتق کیا ہے تاکہ اس کا احترام برقرار رکھے۔
لہٰذا صاحب عرش خدا تو "محمود" ہے اور وہ "محمد" ہے۔

"سیمرغِ فہم ہیچکس از انبیاء نرفت
آنجا کہ تو بہ بالِ کرامت پریدہ ای"

"ہر یک بقدر خویش بجائی رسیدہ اند
آنجا کہ جائے نیست بجائی رسیدہ ای"

انبیاء میں کسی کا بھی طائر فکر و فہم وہاں تک نہیں پہنچا
جہاں آپ کرامت و بزرگی کے پر و بال سے پہنچے ہیں
ان میں سے ہر ایک اپنی قدر و منزلت کے ایک مقام تک پہنچا ہے
جہاں کسی کے لیے کوئی مقام نہیں ہے آپ اس مقام پر پہنچے ہیں

بعد والی آیت میں اپنے پیغمبرؐ کو اہم ترین بشارت دیتا ہے اور آپؐ کے قلب پاک میں اُمید کے انوار کی روشنی پیدا کرتا ہے اور فرماتا ہے: "یقیناً سختی کے ساتھ آسانی ہے" (فان مع العسر یسرًا)۔
اس کے بعد پھر تاکید کرتا ہے، یقیناً سختی کے ساتھ آسانی ہے" (ان مع العسر یسرًا)۔
غم نہ کھاؤ یہ مشکلات اور سختیاں ایسی شکل میں باقی نہیں رہیں گی، دشمنوں کی کارشکنیاں ہمیشہ کے لیے جاری نہیں رہیں گی اور مادی محرومیاں، اقتصادی مشکلات اور مسلمانوں کا فقر و فاقہ اس صورت میں باقی نہیں رہے گا۔
جو شخص مشکلات کو برداشت کرتا ہے، اور طوفانوں کے مقابلہ میں ڈٹ جاتا ہے، وہ ایک دن اس کا میٹھا پھل بھی کھاتا ہے۔ جس دن دشمنوں کی چیخ و پکار بند ہو جائے گی، اور ان کی کارشکنیاں ختم ہو جائیں گی، ترقی و تکامل کے راستے صاف ہو جائیں گے، اور راہِ حق کو طے کرنا آسان ہو جائے گا۔
اگرچہ بعض مفسرین نے ان آیات کو ظہورِ اسلام کے آغاز میں مسلمانوں کے عمومی فقر و فاقہ کی طرف اشارہ شمار کیا ہے لیکن آیات کے مفہوم کی وسعت تمام مشکلات کو شامل ہے، یہ دونوں آیات اس طرح سے پیش کی گئی ہیں کہ نہ تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اختصاص رکھتی ہیں اور نہ ہی آپؐ کے زمانہ سے، بلکہ یہ ایک قاعدہ کلی کی صورت میں اور سابقہ مباحث کی ایک علت کے طور پر پیش کی گئی ہیں اور یہ تمام مخلص مومن اور سعی و کوشش کرنے والے انسانوں کو نوید اور خوش خبری دیتی ہیں کہ ہمیشہ سختیوں کے ساتھ آسانیاں ہوتی ہیں، یہاں تک کہ "بعد" کی تعبیر نہیں کرتا بلکہ "مع" (ساتھ) کی تعبیر کرتا ہے، جو ہمراہ ہونے کی علامت ہے۔
ہاں! اسی طرح ہے، ہر مشکل کے ساتھ آسانی ملی ہوئی ہے اور ہر سختی کے ساتھ سہولت ہے، یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں اور رہیں گے۔
یہ الٰہی نوید اور وعدہ الٰہی ہے، جو دل کو نور و صفا بخشتا ہے، اور کامیابیوں کا اُمیدوار بناتا ہے، اور یاس و نا اُمیدی کے گرد و غبار کو انسان کے صفحۂ روح سے صاف کر دیتا ہے۔[1]

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

" واعلموان مع العسر یسرًا ، وان مع الصبر النصر، وان الفرج مع الکرب " :

" جان لو کہ سختیوں کے ساتھ آسانی ہے ، اور صبر کے ساتھ کامیابی ہے ، اور غم و اندوہ کے ساتھ کشائش و خوش حالی ہے " [1]

ایک حدیث میں امیر المومنین علی علیہ السلام سے آیا ہے :

" ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے شوہر کی شکایت کی کہ وہ مجھے کوئی خرچہ نہیں دیتا، جب کہ اس کا شوہر واقعاً تنگ دست تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس کے شوہر کو زنداں میں ڈالنے کی بجائے اس کے جواب میں فرمایا : ان مع العسر یسرا (اور اُسے صبر کی تلقین کی)" [2]

ہاں !

صبر و ظفر ہر دو دوستان قدیمند

بر اثر صبر نوبت ظفر آید

" صبر اور کامیابی دونوں قدیمی دوست ہیں

صبر کے بعد ہی کامیابی کی نوبت آتی ہے "

اس کے بعد اس سُورہ کی آخری آیت میں فرماتا ہے ، : " پس جب تم کسی اہم کام سے فارغ ہو جاؤ تو دوسرے کام میں لگ جاؤ " (فاذا فرغت فانصب)۔

ہرگز بھی بیکار نہ رہو ، تلاش و کوشش کو نہ چھوڑو ، ہمیشہ جدوجہد میں مشغول رہو ، اور ہر اہم کام کو ختم کرنے کے ساتھ ہی دوسرے اہم کام کو شروع کر دیا کرو۔

اور ان تمام حالات میں خدا پر بھروسہ رکھو " اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ رکھو " (والی ربک فارغب)۔

اس کی رضا و خوشنودی طلب کر اور اس کے قرب و جوار کی طرف جلدی کر۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے ۔ اس کے مطابق آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ہر مہم سے فارغ ہونے اور دوسری مہم کو شروع کرنے کو شامل ہے ، اور تمام کوششوں کا رُخ پروردگار کی طرف کرنے کا حکم دیتی ہے ، لیکن بہت سے مفسرین نے اس آیت کے لیے محدود معانی ذکر کیے ہیں ، جن میں سے ہر ایک کو اس کے ایک مصداق کے عنوان سے قبول کیا جا سکتا ہے ۔

حاشیہ صفحہ ہٰذا

[1] " تفسیر نور الثقلین " صفحہ ۶۰۴ حدیث ۱۱ ، ۱۳

[2] " تفسیر نور الثقلین " ص ۶۰۴ حدیث ۱۱ ، ۱۳

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مُراد یہ ہے کہ جب تو واجب نماز سے فارغ ہو جائے تو دُعا میں مشغول ہو جا، اور خدا سے درخواست کر کہ وہ تیری حاجت کو پُورا کر دے۔

یا یہ کہا ہے کہ جب تُو فرائض سے فارغ ہو جائے تو نافلۂ شب کے لیے کھڑا ہو جا۔

یا یہ کہا ہے کہ جب تُو دُنیا کے کاموں سے فارغ ہو جائے تو آخرت کے امور، عبادت اور اپنے پروردگار کی نماز میں مشغول ہو جا۔

یا یہ کہا ہے کہ جب تُو واجبات سے فارغ ہو جائے، تو ان مستحبات کی طرف توجہ کر جن کا خدا نے حکم دیا جائے۔

یا یہ کہا ہے کہ جب تُو دشمن سے جہاد کرنے سے فارغ ہو جائے تو جہاد نفس کے لیے کھڑا ہو جا۔

یا یہ کہا ہے کہ جب تُو ادائے رسالت سے فارغ ہو جائے تو شفاعت کی درخواست کرنے کے لیے کھڑا ہو جا۔

متعدد روایات میں، جنہیں اہل سنّت کے مشہور عالم حافظ "حاکم حسکانی" نے "شواہد التنزیل" میں نقل کیا ہے، امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس طرح آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

یعنی: "جب تو فارغ ہو جائے تو علیؑ کی ولایت کے لیے نصب کر دے"[1]

قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں بعض سے یہ نقل کیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تُو فارغ ہو جائے تو اس امام کو جو تیرا جانشین ہے نصب کر دے، (اگرچہ مفسّر مذکور نے خُود اس معنی کو قبول نہیں کیا)[2]

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیہ شریفہ میں فراغت کا موضوع معیّن نہیں ہوا ہے، اور "فانصب" "نصب" کے مادّہ سے (نسب کے وزن پر) تعب اور زحمت کے معنی میں ہے، یہ آیت ایک ہمہ گیر اصل کلّی کو بیان کرتی ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبرؐ کو کسی امرِ مہم کے ختم ہونے کے بعد آرام سے بیٹھ جانے سے روکے اور انہیں ایک نمونہ اور مثال کے طور پر زندگی میں ہمیشہ مسلسل طور پر سعی و کوشش میں مصروف رہنے کی تلقین کرے۔

اِس معنی کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ اُوپر والی تمام تفاسیر صحیح ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک اس وسیع اور عام معنی کے ایک مصداق کے عنوان سے ہے۔

اور کیا ہی اصلاحی اور مؤثر پروگرام ہے، جس میں کامیابی اور تکامل و ارتقا کی رمز چھپی ہوئی ہے۔ اصولی طور پر بیکار رہنا اور مکمل طور پر فارغ ہو کر بیٹھ رہنا تھکاوٹ، خوشی کے کم ہونے اور سستی و فرسودگی کا سبب ہوتا ہے، اور بہت سے مواقع میں فساد و تباہی اور انواع و اقسام کے گناہوں کا باعث بنتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اعداد و شمار اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ تعلیمی اداروں کی تعطیلات کے زمانے میں بعض اوقات فتنہ و فساد کی تعداد سات گنا تک پہنچ جاتی ہے۔

بہرحال یہ سُورہ مجموعی طور پر پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خدا کی خاص عنایت اور مصائب و آلام میں تسلی اور رسالت کے

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۲ ص ۳۴۹ (احادیث ۱۱۱۶ تا ۱۱۱۹)۔

[2] قرطبی جلد ۱۰ ص ۷۱۹۹

کام کی مشکلات اور نشیب و فراز کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کی تائید و نصرت کا وعدہ ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ تمام انسانوں اور راہِ حق پر چلنے والوں کے لیے ایک اُمید بخش، اصلاحی اور حیات آفرین مجموعہ ہے۔

چند نکات

جیسا کہ ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے، متعدد روایات میں آیا ہے کہ (ایک اہم مصداق کے بیان کے عنوان سے) "فاذا فرغت فانصب" کی آیت سے مراد کارِ رسالت کی انجام دہی کے بعد امیر المومنین علی علیہ السلام کو خلافت کے لیے نصب کرنا ہے۔

"آلوسی" "رُوح المعانی" میں بعض امامیہ (شیعہ) کی گفتگو کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے، انہوں نے "فانصب" کو "ص" کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ بالفرض اگر ایسا ہو بھی تو وہ اس بات کی دلیل نہیں بنتا کہ اس سے علی ابن ابی طالبؑ کو نصب کرنا مُراد ہو۔ اس کے بعد وہ زمخشری کی کشاف سے نقل کرتا ہے کہ اگر شیعوں کے لیے اس قسم کی تفسیر ممکن ہو تو "ناصبی" (دُشمنانِ علیؑ) بھی اس کی نصب کے دستور کے عنوان سے (بُغض علی بن ابی طالبؑ کے معنی میں) تفسیر کر سکتے ہیں۔[1]

کیونکہ "انصب" (ص کی زبر کے ساتھ) خُود کو مشقت میں ڈالنے اور جدوجہد کرنے کے معنی میں آیا ہے، جب کہ "انصب" (ص کی زیر کے ساتھ) نصب کرنے، اُوپر لے جانے اور قائم کرنے کا حکم دینے کے معنی میں ہے۔

ان مفسرین نے یہ خیال کر لیا ہے کہ شیعہ مسئلہ ولایت پر استدلال کرنے کے لیے آیت کی قرأت کو تبدیل کر دیتے ہیں، حالانکہ اس قسم کی تبدیلی کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ مذکورہ تفسیر کے لیے وہی مشہور اور جانی پہچانی قرأت ہی کافی ہے کیونکہ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ رسالت کے اہم امر سے فارغ ہو جانے کے بعد دوسرے اہم اُمر کے لیے جیسا کہ ولایت ہے، سعی و کوشش کر اور یہ ایک اعتبار سے مکمل طور پر قابلِ قبول ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ پیغمبرؐ مشہور حدیثِ غدیر اور دوسری بہت سی احادیث کے مطابق، جو تمام علماءِ اسلام کی کتابوں میں آئی ہیں، ہمیشہ مسلسل طور پر کوشش کرتے رہتے تھے، لیکن کتنی قابلِ افسوس اور دُکھ دینے والی بات ہے کہ زمخشری جیسا عالم جو علی علیہ السلام کو پیغمبرؐ کا چوتھا جانشین اور اسلام کا عظیم پیشوا سمجھتا ہے، یہ کہنے کے لیے تیار ہو گیا کہ ناصبی بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ آیت کو علی بن ابی طالبؑ کے بُغض کے ساتھ تفسیر کریں، یہ کتنی رکیک اور چُبھنے والی تعبیر ہے؛ وہ بھی ایسے مفسر سے؛

واقعاً تعصب بھی کیسے کیسے گُل کھلاتا ہے؛

۲۔ مشہور معتزلی عالم "ابن ابی الحدید" نے "نہج البلاغہ" کی شرح میں "زبیر بن بکار" سے جو اس کے قول کے مطابق نہ شیعہ تھا اور نہ ہی معاویہ سے دشمنی رکھتا تھا، بلکہ علیؑ سے جُدا ہو کر گوشہ گیر ہو گیا تھا، اور آپ کے مخالفین سے جا ملا تھا۔ روایت کی ہے کہ وہ مغیرہ بن شعبہ کے بیٹے سے نقل کرتا ہے کہ میرا باپ "مغیرہ" معاویہ کی عقل اور سمجھ کے بارے میں بہت باتیں کیا کرتا تھا اور اس کے طرزِ فکر پر حیران ہوا کرتا تھا، لیکن ایک رات وہ اس کے پاس سے بہت ہی غمگین اور پریشانی کی حالت میں آیا۔ مَیں سمجھ گیا کہ کوئی اہم مسئلہ پیش آگیا ہے، مَیں نے اس سے سوال کیا تو اس نے معاویہ کو سخت بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا جب مَیں نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا

---

[1] "روح المعانی" جلد ۳۰ ص ۱۶۲۔ "تفسیر کشاف" جلد ۴ ص ۷۸۲

آج رات جب میں اور وہ خلوت میں تھے تو میں نے اس سے کہا، تو جس مقام اور مرتبہ کا خواہش مند تھا وہ تُو نے حاصل کر لیا ہے اب تو عدل و انصاف اور نیکی کرنے میں کوشش کر، کیونکہ تیری عمر بھی اب بہت زیادہ ہو گئی ہے لہٰذا بنی ہاشم کے بارے میں بھی نیکی کر کیونکہ اب تجھے ان سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ اور یہ بات تیرے لیے نیک نامی کا سبب بن جائے گی۔

تو اس نے جواب میں کہا، ہیہات اب میرے لیے کون سی نیک نامی باقی رہ جائے گی، خلیفہ اوّل و دوم نے کتنے کام کیے تو ان کا کون سا نام باقی رہ گیا، لیکن تم "ابن ابی کبشہ" (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھو کہ لوگ اس کا نام ہر روز پانچ مرتبہ بلند آواز سے اذان پر "اشھد ان محمدًا رسول اللہ" کی صورت میں لیتے ہیں، اے بیچارے! اب اس کے بعد کون سا کام باقی رہ گیا ہے اور ہمارا کون سا نام باقی رہ جائے گا، نہیں خدا کی قسم نہیں، سوائے اس صورت کے کہ یہ حالت بدل جائے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام دفن ہو جائے۔[1]

لیکن ورفعنالك ذكرك کے مقتضیٰ کے مطابق خدا نے چاہا کہ یہ مبارک نام ساری دُنیائے تاریخ اور تمام عالم بشریت میں بلند اور مشہور رہے، چاہے دُوسرے لوگ پسند کریں یا پسند نہ کریں؛ خوش ہوں یا ناخوش؛ اگر ہم ان تعبیرات کو کھول کر دیکھیں تو ان کا کیا معنی ہوگا؛ لاحول ولا قوۃ الا باللہ!

خداوندا! ہمارے دل کو حبِّ ذات سے خالی کر دے اور اپنے عشق و محبت سے پُر کر دے۔

پروردگارا! تُو نے خُود وعدہ دیا ہے کہ ہر مشکل کے ساتھ راحت ہے اور آسودگی ہے، اس زمانہ کے مسلمانوں کو ان عظیم اور سخت مشکلات سے جو دشمنوں کی طرف سے انہیں پہنچ رہی ہیں آسودہ کر دے۔

بارِ الٰہا! تیری نعمتیں اور مواہب ہم پر بہت زیادہ ہیں ہمیں ان کی شکر گزاری کی توفیق مرحمت فرما۔

آمین یا ربّ العالمین

سورہ "الم نشرح" کا اختتام

اختتام ترجمہ قم مقدسہ برمکان حقیر
پونے چھ بجے شام چودہ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ

احقر صفدر حسین نجفی

[1] شرح نہج البلاغہ جلد ۵ ص ۱۲۹۔ (ابن ابی الحدید کی عبارت یہاں اس طرح ہے: "فای عمل یبقی؛ وای ذکر یدوم بعد ھذا لا ابالك، لا واللہ الا دفنًا دفنًا"!

سُورَۃُ التّین

❖ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا

❖ اس میں ۸ آیات ہیں

سُورہ "التین" کے مطالب اور فضیلت

یہ سُورہ حقیقت میں انسان کی خلقتِ زیبا، اور اس کے تکامل و ارتقا اور انحطاط و پستی کے گرد گھومتا ہے اور یہ مطلب سُورہ کے شروع میں پُرمعنی قسموں کے ساتھ شروع ہوا ہے، اور انسان کی نجات اور کامیابی کے عوامل کو شمار کرنے کے بعد آخر میں مسئلہ معاد اور خدا کی حاکمیتِ مطلقہ کی تاکید پر ختم ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من قرأها اعطاه الله خصلتين: العافية واليقين ما دام في دار الدنيا، فاذا مات اعطاه الله من الاجر بعدد من قرأ هذه السورة صيام يوم"[1]:

"جو شخص اس سُورہ کو پڑھے گا جب تک وہ دنیا میں رہے گا خدا اس کو دو نعمتیں عطا کرے گا: سلامتی اور یقین، اور جب دُنیا سے رُخصت ہو جائے گا، تو ان تمام لوگوں کی تعداد کے برابر جنہوں نے اس سُورہ کو پڑھا ہے، اُن سب کے ایک دن کے روزہ کا ثواب اَجر کے طور پر اُسے عطا کرے گا۔"[1]

یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا ہے اور آیۂ "وھٰذا البلد الامین"، جس میں اسم اشارہ قریب کے ساتھ مکّہ کے شہر کی قسم کھائی گئی ہے، اس کی دلیل ہے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۱۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ
۲۔ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ
۳۔ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ
۴۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۫
۵۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ
۶۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۭ
۷۔ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۭ
۸۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۧ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ انجیر اور زیتون کی قسم (یا سرزمین شام اور بیت المقدس کی قسم)۔
۲۔ اور طور سینین کی قسم۔

۳۔ اور اس امن والے شہر (مکّہ) کی قسم۔

۴۔ کہ ہم نے انسان کو بہترین صُورت اور بہترین نظام میں پیدا کیا ہے۔

۵۔ پھر ہم نے اُسے پست ترین مرحلہ کی طرف لَوٹا دیا۔

۶۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لے آئے اور عملِ صالح بجالائے، تو ان کے لیے ایسا اجر و ثواب ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا۔

۷۔ پس ان تمام چیزوں کے باوجود تیرے روزِ جزا کے تکذیب کرنے کا کیا سبب ہے؟!

۸۔ کیا خدا بہترین حکم کرنے والا نہیں ہے؟

تفسیر

ہم نے انسان کو بہترین صُورت میں پیدا کیا ہے۔

اِس سُورہ کے آغاز میں بھی چار پُرمعنی قسمیں بیان کی گئی ہیں جو بہت ہی اہم معنی کے بیان کا مقدمہ ہیں۔

فرماتا ہے: "انجیر اور زیتون کی قسم" (والتین والزیتون)۔

"اور طُورِ سینین کی قسم" (وطور سینین)[1]

اور اس امن و امان والے شہر کی قسم (وھذا البلد الامین)۔

"تین" لُغت میں انجیر کے معنی میں ہے اور "زیتون" وہی معروف زیتون ہے جس سے ایک مفید روغنی مادّہ حاصل کیا جاتا ہے۔

اِس بارے میں کہ کیا اس سے انہیں دو مشہور پھلوں کی قسم مُراد ہے یا کسی اور چیز کی، مفسّرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

اگرچہ بعض اس سے انہیں دو مشہور پھلوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جو حد سے زیادہ غذائی اور دوائی خواص کے حامل ہیں لیکن بعض کا نظریہ یہ ہے کہ اس سے مُراد وہ دو پہاڑ ہیں جن پر شہرِ دمشق اور بیت المقدس واقع ہیں، کیونکہ یہ دونوں مقامات بہت سے انبیاء اور خدا کے بزرگ پیغمبروں کے قیام کی سرزمین ہیں، اور یہ دونوں قسمیں تیسری اور چوتھی قسموں کے ساتھ، جو مقدّس سرزمینوں کی قسمیں ہیں،

---

[1] بعض نے "سینین" کو "سینہ" کی جمع سمجھا ہے جو درخت کے معنی میں ہے، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "طور" "پہاڑ" کے معنی میں ہے، تو اس کا معنی درختوں سے پُر پہاڑ ہوگا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "سینین" ایک زمین کا نام ہے کہ جس پر وہ پہاڑ واقع ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ "سینین" پُربرکت اور خوبصورت کے معنی میں ہے، اور یہ اہلِ حبشہ کی زبان کا لفظ ہے۔ (رُوح المعانی جلد ۳۰ ص ۱۷۳)

ہم آہنگ ہیں۔

اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ان دونوں پہاڑوں کو تین اور زیتون اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ ان میں سے ایک پر انجیر کے درخت اُگتے ہیں اور دُوسرے پر زیتون کے درخت۔

اور بعض نے تین کو آدم علیہ السلام کے زمانہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، کیونکہ وہ لباس جو آدم علیہ السلام اور حوا نے جنت میں پہنا تھا وہ انجیر کے درختوں کے پتوں کا تھا، اور زیتون کو نوحؑ کے زمانہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، کیونکہ طوفان کے آخری مرحلوں میں نوحؑ نے ایک کبوتر اس مقصد سے چھوڑا تھا۔ تاکہ پانی کے نیچے سے خشکی کے ظاہر ہونے کو معلوم کرے۔ وہ (کبوتر) زیتون کی ایک شاخ لے کر واپس آیا تو نوحؑ سمجھ گئے کہ طوفان ختم گیا ہے، اور خشکی پانی کے نیچے سے ظاہر ہوگئی ہے۔ (اس لیے زیتون صلح و امنیت کی رمز ہے)۔

بعض "تین" کو اس مسجد نوحؑ کی طرف بھی اشارہ سمجھتے ہیں جو کوہ جودی پر تعمیر کی گئی تھی۔ اور زیتون کو بیت المقدس کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

ابتدائی نظر میں تو آیت کا ظاہر وہی دو مشہور پھل ہیں، لیکن بعد والی قسموں کی طرف توجہ کرتے ہوئے دو پہاڑ یا مورد احترام دو مقدس مراکز ہی مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ خدا نے شہروں میں سے چار شہروں کو منتخب کیا ہے اور ان کے بارے میں فرمایا ہے: والتین والزیتون وطور سینین وھٰذا البلد الامین:

"تین" مدینہ ہے، اور "زیتون" بیت المقدس، "طور سینین" کوفہ ہے اور "ھٰذا البلد الامین" مکہ۔ [1]

"طور سینین" سے مراد ظاہراً وہی "طور سینا" ہے جسے مفسرین نے اسی مشہور کوہ "طور" کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو صحرائے سینا میں ہے، اور وہاں زیتون کے پُربار درخت موجود ہیں۔

"سینا" کو برکتوں والا یا درختوں سے پُر یا خوبصورت پہاڑ سمجھتے ہیں، اور یہ وہی پہاڑ ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام مناجات کے وقت گئے تھے۔

بعض نے اسے کوفہ کے نزدیک سرزمین نجف کا ایک پہاڑ بھی سمجھا ہے۔

اور بعض نے تصریح کی ہے کہ "سینین" اور "سینا" ایک ہی چیز ہے، اور اس کا معنی پُر برکت ہے۔

باقی رہا "ھٰذا البلد الامین" تو یہ یقیناً سرزمین مکہ کی طرف اشارہ ہے، وہ سرزمین جو زمانۂ جاہلیت میں بھی منطقۂ امن اور حرم خدا سمجھی جاتی تھی، اور کوئی شخص وہاں دوسرے پر تعرض کا حق نہیں رکھتا تھا، یہاں تک کہ مجرم اور قاتل بھی جب اس سرزمین میں

---

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۵ ص ۶۰۶ حدیث ۴۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس زمانہ میں کوفہ ایک بڑا شہر نہیں تھا، لیکن اس سرزمین سے دریائے فرات کے گزرنے کی وجہ سے یقینی طور پر بہت سی آبادیاں اس زمانہ میں بھی وہاں موجود تھیں۔ (تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے بھی وہاں پر ایک شہر آباد تھا)۔ (دائرۃ المعارف مصاحب جلد ۲ مادۂ کوفہ)۔

پہنچ جاتے تھے تو وہ بھی امن میں ہوتے تھے۔

یہ سرزمین اسلام میں حد سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اور انسان تو رہے ایک طرف اس کے جانور، درخت اور پرندے بھی خصوصیت کے ساتھ امن سے رہنے چاہئیں[1]

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن مجید میں لفظ "تین" صرف اسی جگہ استعمال ہوا ہے۔ جب کہ لفظ زیتون قرآن مجید میں چھ مرتبہ صراحت کے ساتھ آیا ہے، اور ایک دفعہ اشارہ کی صورت میں جہاں فرماتا ہے: وشجرة تخرج من طور سیناء تنبت بالدھن وصبغ للآکلین، اور وہ درخت جو طور سینا میں اُگتا ہے، اس سے کھانے والوں کے لیے روغن اور سالن فراہم ہوتا ہے۔ (مومنون ۔ ۲۰)

اب اگر ان دونوں قسموں (تین وزیتون) کو ان کے ابتدائی معنی پر محمول کریں، یعنی معروف انجیر و زیتون پر، تو پھر بھی یہ ایک پُر معنی قسم ہے، کیونکہ:

انجیر بہت زیادہ غذائی قدر و قیمت کا حامل ہے، اور ہر سن و سال کے لیے ایک مقوی اور غذا سے بھرپور نوالہ ہے، جس میں چھلکا، گٹھلی اور کوئی زائد چیز نہیں ہوتی۔

غذا کے ماہرین کہتے ہیں کہ:

انجیر کو بچوں کے لیے طبیعی شکر کے طور پر استعمال کرایا جا سکتا ہے اور ورزش یا محنت مشقت کرنے والے اور بڑھاپے اور کمزوری میں مبتلا لوگ اپنی غذا کے لیے انجیر سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ "افلاطون" انجیر کو اس قدر دوست رکھتا تھا کہ بعض نے اس کا نام ہی فلسفیوں کا دوست رکھ دیا ہے۔ اور "سقراط" اس پھل کو فائدہ مند اجزا کو جذب کرنے والا اور نقصان دہ مادوں کو دفع کرنے والا سمجھتا تھا۔

"جالینوس" نے انجیر سے پہلوانوں کے لیے ایک خاص قسم کی غذا تیار کی تھی، روم اور قدیم یونان کے پہلوانوں کو بھی انجیر دیے جاتے تھے۔

غذا شناس ماہرین کہتے ہیں کہ انجیر میں مختلف قسم کے بہت سے وٹامن اور شکر موجود ہے۔ اور بہت سی بیماریوں میں اس سے ایک دوا کے طور پر فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر جب انجیر اور شہد کو مساوی طور سے مخلوط کر دیں تو زخم معدہ کے لیے بہت ہی مفید ہے۔ خشک انجیر کا کھانا دماغ کو تقویت دیتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ انجیر میں معدنی عناصر کے وجود کی بنا پر جو قوائے بدن اور خون میں اعتدال کا سبب بنتے ہیں انجیر ہر سن و سال اور ہر قسم کے حالات میں غذا کے طور پر بہترین پھل ہے۔

ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے آیا ہے:

"التین یذھب بالبخر ویشد اللثم والعظم، و ینبت الشعر ویذھب بالداء ولا یحتاج معہ الی دواء وقال علیہ السلام: التین اشبہ شیء

---

[1] لفظ "امین" ممکن ہے کہ یہاں "فعیل" بمعنی "فاعل" ہو اور اس کا معنی "ذوالامانۃ" ہو اور یا "فعیل" بمعنی "مفعول" ہو، یعنی وہ سرزمین جس میں لوگ امن میں ہیں۔

بنبات الجنۃ :

" انجیر منہ کی بدبُو کو دُور کرتا ہے، مسوڑھوں اور ہڈیوں کو مضبُوط بناتا ہے، بالوں کو اُگاتا ہے
درد اور تکلیف کو برطرف کرتا ہے۔ اور اس کے ہوتے ہوئے کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے۔
اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ انجیر جنّت کے پھلوں سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے "[1]۔

باقی رہا " زیتون " تو اس کے بارے میں غذا شناس اور بڑے بڑے ماہرین جنہوں نے سالہا سال تک پھلوں کے مختلف خواص کا مطالعہ کرنے میں اپنی عمریں صرف کی تھیں، زیتون اور اس کے تیل کی حد سے زیادہ اہمیت کے قائل ہیں، اور وہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ جو لوگ ہمیشہ صحیح و سالم رہنا چاہیں انہیں اس حیاتی اکسیر سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔

روغن زیتون انسان کے جگر کا پکّا اور مخلص دوست ہے۔ اور گُردوں کی بیماریوں، صفراوی پتھریوں اور دردِ گُردہ اور دردِ جگر کو دُور کرنے اور خشکی کو رفع کرنے کے لیے بہت ہی مؤثر ہے۔

اِسی بنا پر زیتون کے درخت کو قرآن مجید میں شجرۂ مبارکہ کہا گیا ہے۔

روغن زیتون بھی انواع و اقسام کے وٹامن سے سرشار ہے اور اس میں فاسفورس، سلفر، کیلشیم، فیرم، پوٹاشیم اور منگنیز بھی پائی جاتی ہے۔

وُہ مرہم جو روغن زیتون اور لہسن کے ساتھ بنائی جاتی ہے گٹھیا کے دردوں کے لیے مفید بتائی جاتی ہے، پتّہ کی پتھری روغنِ زیتون کے کھانے سے ختم ہو جاتی ہے[2]۔

ایک روایت میں امیرالمومنین علی علیہ السّلام سے آیا ہے :

" ما افقر بیت یأتدمون بالخل والزیت و ذالك ادام الانبیاء "
" وہ گھر جس میں سرکہ اور زیتون سالن کے طور پر استعمال ہوتا ہے، وہ کبھی کھانے سے
خالی نہ ہوگا اور یہ پیغمبروں کی غذا ہے "[3]

اور ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السّلام سے آیا ہے[4]

" نعم الطعام الزیت : یطیب النکهة، و یذهب بالبلغم، و یصفی
اللون، و یشد العصب و یذهب الوصب، و یطفیء الغضب " :
" روغن زیتون ایک اچھی غذا ہے، منہ کو خوشبودار کرتا ہے، بلغم کو دُور کرتا ہے، چہرے

---

[1] " کافی " جلد ۶ ص ۳۵۸ - مرحوم علامہ مجلسی نے بحارالانوار جلد ۶۶ ص ۱۸۴ میں انجیر کے خواص کے بارے میں متعدد روایات نقل کی ہیں۔

[2] " اوّلین دانش گاہ و آخرین پیغمبر " جلد ۹ ص ۹۰ سے آگے۔

[3] " اوّلین دانش گاہ و آخرین پیغمبر " جلد ۹ ص ۱۳۰ کے بعد۔

[4] " بحارالانوار " جلد ۶۶ ص ۱۸۰ حدیث ۶

کے رنگ کو صاف کرتا ہے۔ اور تر و تازہ بناتا ہے، اعصاب کو تقویت دیتا ہے، بیماری، درد اور ضعف کو دُور کرتا ہے، اور غصہ کی آگ کو بجھاتا ہے۔" [1]

ہم اس بحث کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا:

"کلوا الزیت وادھنوا بہ فانہ من شجرۃ مبارکۃ"

"روغن زیتون کھاؤ اور بدن پر اس کی مالش کرو کیونکہ یہ ایک مبارک درخت سے ہے۔" [2]

ان چاروں پُرمعنی قسموں کو ذکر کرنے کے بعد جواب قسم پیش کرتے ہوئے اس طرح فرماتا ہے: "یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صُورت اور نظام میں پیدا کیا ہے۔"

(لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم)۔

"تقویم" کا معنی کسی چیز کو مناسب صُورت، معتدل نظام اور شائستہ کیفیت میں لانا ہے۔ اور اس کے مفہوم کی وسعت اس کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے انسان کو ہر لحاظ سے موزوں اور شائستہ پیدا کیا ہے، جسم کے لحاظ سے بھی، اور رُوحانی و عقلی لحاظ سے بھی، کیونکہ اس کے وجود میں ہر قسم کی استعداد رکھی گئی ہے اور اُسے ایک بہت ہی عظیم قوس صعودی کو طے کرنے کے لیے آمادہ کیا گیا ہے، اور اس کے باوجود کہ انسان ایک "جرم صغیر" ہے، "عالم کبیر" کو اس میں جگہ دی گئی ہے، اور اُسے اس قدر استعدادیں اور شائستگیاں بخشی ہیں کہ وہ ولقد کرمنا بنی آدم "ہم نے بنی آدم کو کرامت و عظمت بخشی ہے۔" (سُورۂ اسراء آیہ ۷۰) کی خلقت کے لائق ہو گیا ہے۔ وہی انسان جس کی خلقت کی تکمیل پر فرماتا ہے: فتبارک اللہ احسن الخالقین "پس وہ خدا بہت ہی بزرگ و برتر اور برکتوں والا ہے جو بہترین خلق کرنے والا ہے"!

لیکن یہی انسان ان تمام امتیازات و اعزازات کے ہوتے ہوئے اگر حق کے راستے سے منحرف ہو جائے تو اس طرح سقوط کرتا ہے کہ "اسفل السافلین" میں جا پہنچتا ہے، اس لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "پھر ہم اُسے پست ترین مراحل میں لوٹا دیتے ہیں۔" (ثم رددناہ اسفل سافلین)۔

کہتے ہیں کہ ہمیشہ بلند پہاڑوں کے ساتھ بہت ہی گہری گھاٹیاں ہوتی ہیں اور انسان کی اس تکامل و ارتقاء کی قوس صعودی کے ساتھ ہی ایک وحشت ناک قوس نزولی بھی نظر آتی ہے ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ وہ ایک ایسا موجود ہے جو ہر قسم کی استعدادیں رکھتا ہے۔ اگر وہ ان سے صلاح و درستی کے لیے فائدہ اُٹھائے تو افتخار کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ جاتا ہے۔ اور اگر ان تمام استعدادوں کو فساد اور خرابی کی راہ پر ڈال دے تو اس سے عظیم ترین مفسدہ پیدا کر دیتا ہے، اور طبیعی طور پر وہ "اسفل السافلین" کی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے۔

لیکن بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "مگر وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیے ہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ ان کے لیے ایسا اجر و ثواب ہے جو ختم ہونے والا نہیں ہے۔" (الا الذین امنوا وعملوا الصالحات فلھم اجر غیر ممنون)۔

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۶۶ ص ۱۸۳ حدیث ۲۲

[2] وہی مأخذ ص ۱۸۲ حدیث ۱۶

"ممنون" "من" کے مادّہ سے یہاں ختم ہونے یا کم ہونے کے معنی میں ہے۔ اسی بنا پر "غیر ممنون" دائمی اور ہر قسم کے نقص سے خالی اجر و ثواب کے معنی میں ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ منت و احسان سے خالی مراد ہے، لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

بعض نے ثم رددناہ اسفل سافلین کے جملہ کی بڑھاپے کے دَور کے ضعف و ناتوانی اور حد سے زیادہ ہوش کی کمی کے معنی میں تفسیر کی ہے، لیکن اس صورت میں یہ بعد والی آیت کے استثنا کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اس بنا پر قبل و بعد کی آیات کے مجموعہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے وہی پہلی تفسیر ہی درست نظر آتی ہے۔

بعد والی آیت میں اس ناشکرے اور معاد کے دلائل اور نشانیوں سے بے اعتنا انسان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کیا سبب ہے کہ تو ان تمام دلائل کے باوجود روزِ جزا کی تکذیب کرتا ہے؟! (فما یکذبک بعد بالدین)۔

ایک طرف تو خود تیرے وجود کی ساخت اور دوسری طرف اس وسیع و عریض عالم کی عمارت اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ دنیا کی چند روزہ زندگی تیری خلقت اور اس عظیم جہان کی خلقت کا اصل ہدف نہیں ہو سکتی۔

یہ سب کچھ وسیع تر اور کامل تر جہان کے لیے ایک مقدمہ ہے اور قرآن کی تعبیر میں "نشأۃ اُولیٰ" خود "نشأۃ اخریٰ" کی خبر دیتی ہے۔ تو پھر انسان متذکر کیوں نہیں ہوتا۔ ولقد علمتم النشأۃ الاولیٰ فلولا تذکرون۔ (واقعہ ۶۲)[1]

عالم نباتات ہمیشہ اور ہر سال نئے سرے سے موت و حیات کے منظر کو انسان کی آنکھ کے سامنے مجسم کرتا ہے اور جنینی دَور کی پے در پے خلقتیں ہر ایک معاد اور ایک نئی زندگی شمار ہوتی ہے۔ ان تمام چیزوں کے باوجود یہ انسان روزِ جزا کا کس طرح انکار کرتا ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں مخاطب نوعِ انسان ہے، اور یہ احتمال کہ یہاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مخاطب ہے اور مُراد یہ ہے کہ معاد کے دلائل کے باوجود کون شخص یا کون سی چیز تیری تکذیب کر سکتی ہے، بعید نظر آتا ہے۔

اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ "دین" سے مراد یہاں آئین و شریعت نہیں ہے، بلکہ وہی جزا اور روزِ جزا ہے۔ اس کے بعد والی آیت بھی اسی معنی کی گواہ ہے۔

جیسا کہ فرماتا ہے: "کیا خدا بہترین حکم کرنے والا اور فیصلہ کرنے والا نہیں ہے؟" (الیس اللہ باحکم الحاکمین)۔

اور اگر ہم دین کو کل شریعت اور آئین کے معنی میں لیں تو پھر آیت کا مفہوم و معنی اس طرح ہو گا، "کیا خدا کے احکام و فرامین سب سے زیادہ حکیمانہ اور قابلِ یقین نہیں ہیں"؟ یا یہ کہ انسان کے لیے خدا کی خلقت ہر لحاظ سے حکمت، علم اور تدبیر کے ساتھ آمیختہ ہے۔

---

[1] جلد ۲۳ ص ۱۸۵ سے آگے سورۂ واقعہ کی آیات سے استفادہ کرتے ہوئے سات دلیلیں بیان کی گئی ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ "والتین" کی تلاوت فرماتے تھے تو جیسے ہی آیہ "الیس اللہ باحکم الحاکمین" پر پہنچتے تھے تو فرماتے تھے:

"بلی وانا علیٰ ذالک من الشاھدین"

"ہاں خدا احکم الحاکمین ہے، اور میں اس بات کا گواہ ہوں"۔[1]

خداوندا! ہم بھی گواہی دیتے ہیں کہ تُو احکم الحاکمین ہے۔

پروردگارا! تُو نے ہماری خلقت کو بہترین صُورت میں قرار دیا ہے۔ ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہمارا عمل اور ہمارے اخلاق بھی بہترین صورت میں ہوں۔

بارِالٰہا! ایمان و عملِ صالح کی راہ کو طے کرنا تیرے لُطف و کرم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ہم پر اس راہ میں اپنا لُطف و کرم فرما۔

آمین یا ربّ العالمین

سُورہ التین کا اختتام

اختتام ترجمہ

۱۶ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ

قم مقدس برمکان حقیر

بروز منگل بوقت بارہ بج کر اکتالیس منٹ

احقر: صفدر حسین نجفی

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۱۲۔ یہی مضمون تفسیر "رُوح البیان" و "قرطبی" اور "فی ظلال" میں بھی زیر بحث آیت کے ذیل میں آیا ہے۔

سُورَۃُ الْعَلَقِ

❖ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا

❖ اس میں ۱۹ آیات ہیں۔

سُورہ علق کے مطالب اور فضیلت

مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ یہ سورہ وہ پہلا سورہ ہے جو پیغمبر گرامی اسلام پر نازل ہوا اور اس کے مطالب بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں اور یہ بات جو بعض نے کہی ہے کہ پہلا سُورہ، سورۂ "حمد" یا سورہ "مدثر" ہے، یہ بات قطعی مشہور نہیں ہے۔

یہ سُورہ پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرأت و تلاوت کا حکم دیتا ہے اور اس کے بعد اس باعظمت انسان کی ایک بے قدر و قیمت قطرۂ خون سے خلقت کی بات کرتا ہے۔

اور بعد کے مرحلہ میں پروردگار کے لطف و کرم کے سائے میں انسان کے تکامل و ارتقا اور اس کی علم و دانش اور قلم سے آشنائی کے بارے میں بحث ہوتی ہے۔

اور اس کے بعد کے مرحلہ میں ان ناشکرے انسانوں کے بارے میں، جو ان تمام خدائی نعمتوں اور الطاف الٰہی کے باوجود سرکشی کی راہ اختیار کرتے ہیں، گفتگو کرتا ہے۔

اور آخر میں ان لوگوں کی دردناک سزا کی طرف اشارہ کرتا ہے جو لوگوں کو ہدایت اور نیک اعمال سے روکتے ہیں۔

اور سُورہ کو "سجدہ" اور بارگاہِ پروردگار میں تقرب حاصل کرنے کے حکم پر ختم کرتا ہے۔

اس سُورہ کی قرأت کی فضیلت کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"من قرأ فی یومه او لیلته اقرأ باسم ربك ثم مات فی یومه او لیلته مات شهیدًا و بعثه الله شهیدًا، واحیاه کمن ضرب بسیفه فی سبیل الله مع رسول الله"۔

"جو شخص دن میں یا رات کو سورۂ اقرأ باسم ربک پڑھے گا اور وہ اس رات یا دن کو مرجائے گا تو وہ دنیا سے شہید جائے گا اور خدا اُسے شہید مبعوث کرے گا اور شہیدوں کی صف میں اُسے جگہ دے گا، اور وہ قیامت میں اس شخص کی مانند ہوگا جس نے راہِ خدا میں

پیغمبرِ اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں شمشیر سے جہاد کیا ہو۔

یہ سورہ اُن مختلف تعبیروں کی مناسبت سے جو اس سورہ کے آغاز میں آئی ہیں سورۂ "علق" یا سورہ "اقرأ" یا سورہ "قلم" کے نام سے موسوم ہوا ہے۔[1]

❖ ❖ ❖

[1] "تفسیر برہان" جلد ۴ ص ۴۷۸۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ
۲۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ
۳۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ
۴۔ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ
۵۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے جہان کو پیدا کیا۔
۲۔ وہی جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔
۳۔ پڑھ کہ تیرا پروردگار سب سے زیادہ مکرم و باعزت ہے۔
۴۔ وہی جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔
۵۔ اور انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

شانِ نزول

جیسا کہ ہم نے سُورہ کے مطالب کی تشریح میں بھی اشارہ کیا ہے کہ اکثر مفسرین کے نظریہ کے مطابق یہ پہلا سُورہ ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے، بلکہ بعض کے قول کے مطابق تو اوپر والی پانچ آیات سب ہی مفسرین کے نزدیک آغاز وحی میں ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں اور ان کا مضمون بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے۔

روایات میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوہِ حرا پر گئے ہوئے تھے کہ جبرئیل آئے اور کہا: اے محمدؐ پڑھ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔

جبرئیل نے انہیں آغوش میں لے کر دبایا اور پھر دوبارہ کہا: پڑھ، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر اسی جواب کو دُہرایا۔ اس کے بعد جبرئیل نے پھر وہی کام کیا اور وہی جواب سُنا، اور تیسری بار کہا: اقرأ باسم ربك الذی خلق ..... پانچوں آیات کے آخر تک۔

جبرئیل یہ بات کہہ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظروں سے غائب ہوگئے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو وحی کی پہلی شعاع کو حاصل کرنے کے بعد بہت تھکے ہوئے تھے خدیجہ کے پاس آئے اور فرمایا: "زملونی و دثرونی" مجھے اُڑھا دو اور کوئی کپڑا میرے اُوپر ڈال دو تاکہ میں آرام کروں۔[1]

"طبرسی" بھی مجمع البیان میں یہ نقل کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدیجہ سے فرمایا:

"جب میں تنہا ہوتا ہوں تو ایک آواز سُن کر پریشان ہو جاتا ہوں"۔

حضرت خدیجہؑ نے عرض کیا: خدا آپؐ کے بارے میں خیر اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں کرے گا کیونکہ خدا کی قسم آپؐ امانت کو ادا کرتے ہیں اور صلۂ رحم بجالاتے ہیں، اور جو بات کرتے ہیں اس میں سچ بولتے ہیں۔

"خدیجہؑ" کہتی ہیں: اس واقعہ کے بعد ہم ورقہ بن نوفل کے پاس گئے (نوفل خدیجہؑ کا چچازاد بھائی اور عرب کے علماء میں سے تھا)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ "ورقہ" سے بیان کیا۔ ورقہ نے کہا: جس وقت وہ پکارنے والا آپؐ کے پاس آئے تو غور سے سنو کہ وہ کیا کہتا ہے؟ اس کے بعد مجھ سے بیان کرنا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی خلوت گاہ میں سنا کہ وہ کہہ رہا ہے:

اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہو: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للہ رب العلمین الرحمٰن الرحیم مالك یوم الدین ایاك نعبد وایاك نستعین اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین۔

---

[1] "ابوالفتوح رازی" جلد ۱۲ ص ۹۶، (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ، اسی مطلب کو بہت سے مفسرین عامہ و خاصہ نے بہت سے شاخ و برگ اور پھول بوٹے لگا کر نقل کیا ہے، جن میں سے بعض بالکل قابلِ قبول نہیں ہے۔)

اور کہو لا الٰہ الّا اللہ ، اس کے بعد آپؐ ورقہ کے پاس آئے اور اس ماجرے کو بیان کیا۔

" ورقہ " نے کہا : آپؐ کو بشارت ہو ، پھر بھی آپؐ کو بشارت ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ وہی ہیں جن کی عیسٰی بن مریمؑ نے بشارت دی ہے، آپؐ موسٰی علیہ السّلام کی طرح صاحب شریعت ہیں اور پیغمبر مرسل (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ آج کے بعد بہت جلد جہاد کے لیے مامور ہوں گے اور اگر میں اس دن تک زندہ رہا تو آپ کے ساتھ ہو کر جہاد کروں گا"

جب " ورقہ " دنیا سے رُخصت ہو گیا تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

" میں نے اس رُوحانی شخص کو بہشت (برزخی جنّت) میں دیکھا ہے کہ وہ جسم پر ریشمی لباس پہنے ہوئے تھا، کیونکہ وہ مجھ پر ایمان لایا تھا اور میری تصدیق کی تھی"۔[1]

یقینی طور پر مفسّرین کے بعض کلمات یا تاریخ کی کتابوں میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی اس فصل کے بارے میں ایسے ناموزوں مطالب، نظر آتے ہیں جو مسلمہ طور پر جعلی ، وضعی، گھڑی ہوئی روایات اور اسرائیلیات سے ہیں، مثلاً یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزولِ وحی کے پہلے واقعہ کے بعد بہت ہی ناراحت ہوئے اور ڈر گئے کہ کہیں یہ شیطانی القاآت نہ ہوں، یا آپ نے کئی مرتبہ اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا کہ خُود کو پہاڑ سے گرا دیں، اور اسی قسم کے فضول اور بے ہودہ باتیں جو نہ تو نبوّت کے بلند مقام کے ساتھ سازگار ہیں اور نہ ہی پیغمبرؐ کی اس عقل اور حد سے زیادہ دانش مندی، مدبریت، صبر و تحمل و شکیبائی ، نفس پر تسلّط اور اس اعتماد کو ظاہر کرتی ہیں جو تاریخوں میں ثبت ہے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس قسم کی ضعیف و رکیک روایات دُشمنانِ اسلام کی ساختہ و پرداختہ ہیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو بھی موردِ اعتراض قرار دے دیں اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو بھی۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے آیات کی تفسیر پیش کرتے ہیں۔

تفسیر

اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ

پہلی آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے : " اپنے اس پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے سارے جہان کو خلق کیا ہے"۔ (اقرأ باسم ربك الّذی خلق)[2]

بعض نے یہ کہا ہے کہ اُوپر والے جملہ میں مفعول محذوف ہے اور اصل میں اس طرح تھا اقرأ القرآن باسم ربك اپنے

---

[1] " تفسیر مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۱۴

[2] " راغب " " مفردات " کہتا ہے " قرأت " حروف و کلمات کو ایک دوسرے میں ملانے اور ضم کرنے کے معنی میں ہے، اسی لیے ایک حرف کو قرأت نہیں کہتے۔

پروردگار کے نام سے قرآن مجید پڑھ، اور اسی بنا پر بعض علمانے اس آیت کو اس پر دلیل بنایا ہے کہ بسم اللہ قرآن کی سورتوں کا جزو ہے۔

اور بعض نے "باء" کو زائدہ سمجھا ہے اور یہ کہا ہے کہ اپنے پروردگار کے نام کو پڑھ ہے، لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے۔ کیونکہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے اپنے پروردگار کے نام کو یاد کر۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں سب سے پہلے پروردگار کی "ربوبیت" کے مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ "رب" "مالک مصلح" کے معنی میں ہے، یعنی وہ ہستی جو کسی چیز کی مالک بھی ہے اور اس کی اصلاح و تربیت بھی کرتی ہو۔

اس کے بعد پروردگار کی ربوبیت کو ثابت کرنے کے لیے عالم ہستی کی خلقت و آفرینش پر تکیہ ہوا ہے، کیونکہ اس کی ربوبیت کی بہترین دلیل اس کی خالقیت ہے، اور عالم کی تدبیر وہی کر سکتا ہے جس نے اس کو خلق کیا ہے۔

یہ حقیقت میں عرب کے مشرکوں کا جواب ہے جو خدا کی خالقیت کو تو قبول کرتے تھے لیکن ربوبیت اور تدبیر کے ضمن میں بتوں کے قائل تھے۔ اس کے علاوہ نظام ہستی میں خدا کی ربوبیت اور اس کی تدبیر اس کی ذاتِ مقدس کو ثابت کرنے کی بہترین دلیل ہے۔

اس کے بعد تمام مخلوقات میں سے عالم خلقت کے اہم ترین موجود اور آفرینش کے گل سرسبد یعنی انسان پر تکیہ کرتا ہے اور اس کی آفرینش کو ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہی خدا جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا" (خلق الانسان من علق)۔

"من علق" اصل میں کسی چیز کے چپک جانے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے جمے ہوئے خون کو اور اسی طرح "جونک" کو جو خون چوسنے کے لیے بدن سے چپک جاتی ہے "علق" کہتے ہیں۔ اور چونکہ نطفہ عالم جنین کا پہلا دور گزارنے کے بعد جمے ہوئے اور چپکے ہوئے خون کے ٹکڑے کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جو ظاہر میں بہت ہی کم قدر و قیمت رکھتا ہے لہٰذا اس آیت میں انسان کی خلقت کا مبداء اسی ناچیز موجود کو شمار کرتا ہے تاکہ پروردگار کی عظیم قدرت نمائی واضح ہو جائے جس نے اس قسم کی بے قدر و قیمت موجود سے ایسی قابلِ قدر اور قیمتی مخلوق پیدا کر دی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ علق سے مراد یہاں آدم علیہ السلام کی مٹی ہے جو چپکنے کی حالت بھی رکھتی تھی، اور یہ بات واضح ہے کہ وہ خدا جو اس عجیب مخلوق کو اس "چپکی ہوئی مٹی" کے ایک ٹکڑے سے وجود میں لایا ہے[1] وہی ہر قسم کی حمد و ستائش کے لائق ہے۔

کبھی "علق" کو "صاحبِ علاقہ" وجود کے معنی میں لیا ہے، جو انسان کی اجتماعی روح اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کی طرف ایک اشارہ ہے۔ اور یہ حقیقت میں تکامل بشر اور تمدنوں کی پیش رفت کا پایہ اصلی ہے۔

بعض "علق" کو نر کے نطفہ (سپرم) کی طرف بھی اشارہ سمجھتے ہیں جو "جونک" کے ساتھ بہت زیادہ مناسبت رکھتا ہے یہ خورد بینی موجود نطفہ کے پانی میں تیرتا ہے، رحم میں عورت کے نطفہ کی طرف بڑھتا ہے، اس کے ساتھ چپک جاتا ہے اور ان دونوں کی ترکیب سے انسان کا کامل و مکمل نطفہ وجود میں آتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس زمانہ میں یہ مسائل تحقیق و دریافت نہیں ہوئے تھے، لیکن قرآن مجید نے علمی اعجاز کے طریق سے اس سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان چاروں تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے، اگرچہ چاروں تفسیروں کے درمیان جمع کرنے میں

---

[1] اس صورت میں "باء" ملابست کے لیے ہے۔

بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ " انسان " ایک تفسیر کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کے معنی میں ہے اور دوسری تین تفاسیر کے مطابق مطلق انسانوں کے معنی میں ہے۔

دوبارہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے : " پڑھ کہ تیرا پروردگار ہر کریم سے زیادہ کریم اور ہر بزرگوار اور باعزت سے بڑھ کر بزرگوار اور باعزت ہے " : (اقرأ و ربك الاکرم)[1]

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ دوسرا " اقرأ " اسی " اقرأ " کی ایک تاکید ہے جو اس سے پہلی آیات میں ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ اُس سے مختلف ہے۔ پہلے جملہ میں پیغمبرؐ کا اپنے لیے پڑھنا مراد ہے، اور دوسرے جملہ میں لوگوں کے لیے پڑھنا۔ لیکن تاکید زیادہ مناسب نظر آتی ہے کیونکہ اس فرق پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

بہرحال اس آیت کی تعبیر حقیقت میں پیغمبرؐ کی اس گفتگو کا جواب ہے جو جبرئیل کے جواب میں آپ نے کہی تھی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ یعنی پروردگار کی برکت سے جو خدا سے زیادہ کریم و بزرگوار ہے تو قرأت و تلاوت کی طاقت و توانائی رکھتا ہے۔

اس کے بعد اس خدا کی توصیف کرتے ہوئے جو سب کریموں سے بڑھ کر کریم و بزرگوار ہے، فرماتا ہے :

" وہی ہستی جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی " : (الذی علم بالقلم).

" اور انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا " : (علم الانسان ما لم یعلم).

یہ آیات بھی درحقیقت پیغمبرؐ کی اُسی گفتگو کا جواب ہیں جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ :

" میں قرأت کرنے والا نہیں ہوں " یعنی وہی خدا جس نے انسان کو قلم کے ذریعے تعلیم دی ہے اور جو کچھ انسان نہیں جانتا تھا اُسے سکھایا ہے، وہ اس بندے کو بھی جس نے کسی سے سبق نہیں پڑھا ہے قرأت و تلاوت سکھانے کی قدرت رکھتا ہے۔

" الذی علم بالقلم " کے جملہ کے دو معنی نکلتے ہیں، ایک یہ کہ : خدا نے انسان کو لکھنا اور کتابت کرنا سکھایا، اور اس عظیم کام کی قدرت و توانائی، جو تاریخ بشر کا مبدء اور تمام علوم و فنون اور تمدنوں کا سرچشمہ ہے، اس میں ایجاد کی۔

دوسرا یہ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اس طریق سے اور اس وسیلہ سے علوم و فنون سکھائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک تفسیر کے مطابق تو لکھنے کی تعلیم مراد ہے، اور دوسری تفسیر کے مطابق وہ علوم مُراد ہیں جو کتابت کے ذریعہ انسان تک پہنچے ہیں۔

بہرحال یہ ایک ایسی پُرمعنی تعبیر ہے، جو نزولِ وحی کے ان حساس لمحات میں ان عظیم اور پُرمعنی آیات میں منعکس ہوگئی ہے۔

---

[1] " و ربك الاکرم " کا جملہ، جملہ اسمیہ استینافیہ ہے اور " مبتدا " اور " خبر " سے مرکب ہے۔

چند نکات

۱۔ وحی کا آغاز ایک حرکت علمی کے آغاز کے ساتھ ہوا

یہ آیات ، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ، اکثر مفسرین یا تمام کے تمام مفسرین کے نظریہ کے مطابق وہ سب سے پہلی آیات ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب پاک پر نازل ہوئی تھیں اور وحی کی پہلی شعاعوں کی روشنی سے تاریخ بشریت میں ایک نئی فصل کا آغاز ہوا ، اور نوع انسانی ایک عظیم ترین الطاف الٰہی کی مشمول ہوئی ، اور خدا کا وہ اکمل ترین دین' جو سارے دینوں کا نقطۂ اختتام تھا ، نازل ہوا ، اور تمام احکام اور اسلامی تعلیمات کے نزول کے بعد الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ۔ (مائدہ ۔ ۳) کے مطابق دین الٰہی کی تکمیل ہوئی اور اس کی نعمت حد کمال کو پہنچ گئی اور اسلام خدا کا پسندیدہ دین قرار پایا۔

یہاں ایک بہت ہی عمدہ موضوع ہے' (اور وہ یہ ہے) کہ باوجود اس بات کے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم " اُمّی تھے' اور آپؐ نے کسی سے درس نہیں لیا تھا ، اور حجاز کے ماحول کو سراسر جہالت و نادانی کے ماحول نے گھیر رکھا تھا ، وحی کی پہلی آیات میں " علم " اور " قلم " کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی ، جو ان آیات میں خلقت و آفرینش جیسی عظیم نعمت کے فوراً بعد بلا فاصلہ ذکر ہوا ہے ۔

حقیقت میں یہ آیات پہلے انسانی جسم کی ایک بے قدر و قیمت لوتھڑے " علقہ " جیسے موجود سے تکامل و ارتقاء کی خبر دیتی ہیں ، اور دوسری طرف سے رُوح کے تکامل کی ، تعلیم و تعلم کے ذریعے ، خصوصاً قلم کے ذریعے بات کرتی ہیں ۔

جس دن یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اس دن نہ صرف حجاز کے ماحول میں ، جو جہالت کا ماحول تھا ، کوئی شخص قلم کی قدر و منزلت کا قائل نہ تھا بلکہ اس زمانہ کی متمدن دُنیا میں بھی قلم کی کم ہی قدر کی جاتی تھی۔

لیکن آج کے زمانہ میں ہم جانتے ہیں کہ وہ تمام تمدن' علوم و فنون اور ترقیاں جو ہر میدان میں نوع بشر کو نصیب ہوئی ہیں ، قلم کے محور کے گرد ہی گردش کرتی ہیں ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ " مداد علماء " (علماء کے قلم کی سیاہی) " دماء شہداء " (شہداء کے خون) پر سبقت لے چکی ہے کیونکہ شہید کے خون کی بُنیاد اور اس کی پشتیبان علماء کے قلموں کی سیاہی ہی ہے ، اور اصولی طور پر انسانی معاشروں کی سرنوشت پہلے درجہ میں قلم کی نوک سے ہی لکھی گئی ہے ۔

انسانی معاشروں کی اصلاحی باتیں مؤمن و متعہد قلموں سے لکھی جاتی ہیں' اور معاشروں کے فساد اور تباہیوں کی باتیں بھی مسموم اور فاسد قلموں سے ہی تحریر میں آتی ہیں۔

یہ بات بلاوجہ نہیں ہے کہ قرآن مجید نے قلم کی اور جو کچھ قلم سے لکھتے ہیں ، اس کی قسم کھائی ہے ۔ یعنی " آلہ " کی قسم بھی کھائی ہے اور جو کچھ اس سے حاصل ہوتا ہے اس کی قسم بھی ، جیسا کہ فرماتا ہے : " نٓ والقلم ومایسطرون " (قلم ۔ ۱)

ہم جانتے ہیں کہ بشر کی زندگی کے ادوار کو دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں ۔

۱۔ تاریخ کا دور

۲۔ قبل از تاریخ کا دور

تاریخ کا دور وہ ہے جس میں قلم، پڑھنے اور لکھنے کا زمانہ شروع ہوا، اور انسان اس قابل ہوگیا کہ قلم کے ذریعے اپنی زندگی کی کوئی چیز لکھ سکے، اور آنے والے لوگوں کے لیے بطور یادگار چھوڑ جائے۔ اس طرح تاریخ بشر قلم اور خط کی تاریخ کے برابر ہے۔

ہم نے انسانوں کی زندگی میں قلم کے اثرات کے بارے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۲۴ میں سورہ قلم کے آغاز میں ایک مفصل اور مبسوط تشریح پیش کی ہے۔

اسی بنا پر ابتدا سے ہی اسلام کی بنیاد علم و قلم پر رکھی گئی ہے، اور یہ بات بلاوجہ نہیں ہے کہ اس قسم کی پس ماندہ قوم علوم و فنون میں اس قدر ترقی کر گئی کہ، دوست و دشمن کے اعتراف کے مطابق، انہوں نے ساری دنیا میں علم و دانش کو پھیلا دیا اور یورپ کے مورخین کے اعتراف کے مطابق یہ مسلمانوں کا نور علم و دانش ہی تھا جو قرون وسطیٰ میں تاریک یورپ کے صفحہ پر چمکا اور انہیں متمدن عصر میں داخل کر گیا۔

اور اس سلسلہ میں خود انہیں کی طرف سے بہت سی کتابیں "تاریخ تمدن اسلام" یا "میراث اسلام" کے عنوان سے لکھی گئی ہیں۔

کس قدر نامناسب بات ہے کہ اس قسم کی ملت اور ایسا دین علم و دانش کے میدان میں پیچھے رہ جائے اور دوسروں کا محتاج ہو جائے، یہاں تک کہ ان سے وابستہ ہو جائے۔

۳۔ ہر حال میں ذکر خدا

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا آغاز خدا کے نام کے ذکر سے شروع ہوا "اقرأ باسم ربك" اور قابل غور بات یہ ہے کہ آپ کی بھرپور زندگی ذکر خدا اور یاد خدا سے ملی ہوئی تھی۔

آپ کا ہر سانس ذکر خدا کے ساتھ وابستہ تھا۔ کھڑے ہوتے، بیٹھتے، سوتے، چلتے، سوار ہوتے، پیادہ چلتے یا توقف کرتے سب یاد خدا کے ساتھ اور "اللہ" کے نام کے ساتھ تھا۔

جب آپ نیند سے بیدار ہوتے تھے تو فرماتے تھے:

"الحمد لله الذی احیانا بعد ما اماتنا والیه النشور"

"حمد کے لائق وہی ہے جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی بخشی اور اسی کی جانب ہم سب نے لوٹ کر جانا ہے"

"ابن عباس" کہتے ہیں کہ ایک رات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں سویا ہوا تھا۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ نے آسمان کی طرف سر کو بلند کیا اور سورہ آل عمران کی آخری دس آیات کی تلاوت فرمائی۔ ان فی خلق السماوات والارض واختلاف اللیل والنهار ۔ ۔ ۔

پھر عرض کیا:

اللّٰھم لك الحمد انت نور السمٰوات والارض ومن فیھن ۔ ۔ ۔ ۔ اللّٰھم لك اسلمت وبك اٰمنت وعلیك توكلت والیك انبت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" خدایا سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں، تو ہی آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے، سب کا نور ہے ۔ ۔ ۔ ۔ خدایا میں تیرے سامنے سر تسلیم خم کر چکا ہوں، تجھ پر ایمان لا چکا ہوں ، تجھ پر توکل کر چکا ہوں اور تیری طرف لوٹ چکا ہوں "

جس وقت آپ گھر سے نکلتے تو فرماتے :

" بسم اللّٰہ ، توكلت على اللّٰہ ، اللّٰھم انی اعوذ بك ان اضل او اضل ، او ازل ، او اظلم ، او اظلم ، او اجھل ، او یجھل علیّ "

" اللہ کے نام سے ، میں اللہ پر توکل کرتا ہوں ، خدایا میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں گمراہ ہو جاؤں ، یا کسی کی گمراہی کا سبب بنوں ، یا میں پھسل جاؤں ، یا کسی پر ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤں ، یا جہالت سے کام لوں ، یا مجھ سے جہالت کا برتاؤ کیا جائے "

جب آپ مسجد میں داخل ہوتے تو فرماتے :

" اعوذ باللّٰہ العظیم ، وبوجھہ الكریم وسلطانہ القدیم من الشیطان الرجیم "

" میں عظیم خدا سے اور اس کی کریم ذات سے اور اس کی قدیم سلطنت کے ذریعہ رانده درگاہ شیطان سے پناہ مانگتا ہوں "

اور جس وقت آپ نیا لباس زیب تن کرتے تو فرماتے :

" اللّٰھم لك الحمد انت كسوتنیہ اسئلك خیرہ وخیر ما صنع لہ و اعوذ بك من شرہ وشر ما صنع لہ "

" خدایا سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں ۔ تو نے ہی یہ لباس مجھے پہنایا ہے ۔ میں تجھ سے اس کی خیر چاہتا ہوں اور جس خیر کے لیے یہ بنا ہے اور تجھ سے اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں اور جس شر کے لیے یہ بنا ہے "

اور جب گھر کی طرف لوٹتے تو فرماتے :

" الحمد للّٰہ الذی كفانی واٰوانی والحمد للّٰہ الذی اطعمنی واسقانی ۔

" حمد ہے اس اللہ کی جس نے میری کفایت کی اور مجھے پناہ دی اور حمد ہے اس اللہ کی جس نے مجھے کھلایا اور پلایا ۔

اور اسی طرح آپ کی تمام زندگی یادِ خدا ، نامِ خدا اور الطافِ خدا کے تقاضوں سے گوندھی ہوئی اور ملی ہوئی تھی [1]

---

[1] " فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۶۱۹ سے آگے (بہت زیادہ تلخیص کے ساتھ) ۔

۶۔ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝

۷۔ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝

۸ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝

۹۔ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى ۝

۱۰۔ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝

۱۱۔ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۝

۱۲۔ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝

۱۳۔ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝

۱۴۔ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۝

ترجمہ

۶۔ ایسا نہیں ہے کہ انسان حق شناس ہو، یقیناً وہ سرکشی کرتا ہے۔

۷۔ اس وجہ سے کہ وہ خود کو بے نیاز سمجھتا ہے۔

۸۔ یقینی طور پر سب کی بازگشت تیرے پروردگار کی طرف ہے۔

۹۔ مجھے بتا کیا وُہ شخص جو نہی کرتا ہے۔

۱۰۔ بندہ کو جب وہ نماز پڑھتا ہے (کیا وُہ مستحق عذاب الٰہی نہیں ؟)

۱۱۔ مُجھے بتا اگر یہ بندہ طریق ہدایت پر ہو۔

۱۲۔ یا لوگوں کو تقویٰ کا حکم دے (کیا اُسے نہیں کرنا مناسب ہے ؟)

۱۳۔ مجھے بتا اگر (یہ سرکش) حق کی تکذیب کرے اور اس کی طرف سے پُشت پھیر لے (تو اس کی کیسی دردناک سرنوشت ہوگی ؟)

۱۴۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ خدا اس کے تمام اعمال کو دیکھتا ہے ؟

تفسیر

کیا تجھے معلوم نہیں کہ خدا تیرے تمام اعمال کو دیکھتا ہے ؟

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں انسان کے لیے پروردگار کی مادی و معنوی نعمتوں کی طرف اشارہ ہوا تھا، اور ایسی وسیع نعمتوں کا لازمہ یہ ہے کہ انسان شکر ادا کرے اور خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے، لہٰذا زیر بحث آیات میں فرماتا ہے: ایسا نہیں ہے کہ خدائی نعمتیں ہمیشہ ہی انسان میں شکر گزاری کی رُوح بیدار کرتی ہوں، بلکہ وہ یقینی طور پر طغیان و سرکشی کرتا ہے: "(کلّا ان الانسان لیطغیٰ)[1]

"اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگ جاتا ہے:" (ان رآہ استغنیٰ)[2]

یہ عام لوگوں کی فطرت ہے، ان لوگوں کی فطرت اور عادت جنہوں نے عقل و وحی کے مکتب میں پرورش نہ پائی ہو۔ چنانچہ جب وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگ جاتے ہیں تو سرکشی و طغیان شروع کر دیتے ہیں۔

نہ تو وہ خدا کا بندہ بنتے ہیں، نہ اس کے احکام کو قبول کرتے ہیں، نہ وجدان کی پکار پر کان دھرتے ہیں اور نہ ہی حق و

---

[1] جو کچھ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے "کلا" اس چیز کو روکنے کے لیے ہے جو گزشتہ آیات کے مضمون کا لازمہ ہے، اور بعض نے اسے حقاً کے معنی میں بھی لیا ہے جو تاکید کے لیے ہے۔

[2] "ان رآہ استغنیٰ" کا جملہ مفعول لاجلہ ہے اور تقدیر میں لان ... ہے، اور رؤیت یہاں علم کے معنی میں ہے، لہٰذا اس کے دو مفعول ہوئے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ رؤیت حسی کے معنی میں ہو اور "استغنیٰ" بمنزلہ "حال" کے ہو۔

عدالت کا خیال کرتے ہیں۔

انسان اور کوئی بھی دُوسری مخلوق ہرگز بے نیاز اور مستغنی نہیں ہوسکتی۔ بلکہ تمام ممکن موجودات ہمیشہ خدا کے لطف اور نعمتوں کے محتاج اور نیازمند رہتے ہیں۔ اور اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا فیض و کرم منقطع ہو جائے تو ٹھیک اسی لمحہ سب کے سب نابود و فنا ہو جائیں۔ البتہ انسان بعض اوقات غلطی سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگ جاتا ہے، اور آیت کی تعبیرِ لطیف بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے، جو یہ کہتی ہے کہ: "وُہ خود کو بے نیاز سمجھنے لگ جاتا ہے" یہ نہیں کہتی کہ وہ بے نیاز ہو جاتا ہے:

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں "انسان" سے مراد خصوصیت کے ساتھ "ابوجہل" ہے، جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے آغاز ہی سے مخالفت کے لیے کھڑا ہوگیا تھا۔ لیکن مسلمہ طور پر یہاں "انسان" ایک مفہوم کلّی رکھتا ہے، اور "ابوجہل" جیسے افراد اس کے مصادیق ہیں۔

بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ لوگ فوراً ہی ان کی دعوت کو قبول کر لیں گے۔ بلکہ انہیں چاہیئے کہ وہ خُود کو سرکش مستکبرین کے انکار اور مخالفت کے لیے آمادہ و تیار رکھیں اور یہ جان لیں کہ ایک نشیب و فراز سے بھرا ہوا راستہ ان کے سامنے ہے۔

اس کے بعد ان مستکبر سرکشوں کو تہدید کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یقیناً سب کی بازگشت تیرے پروردگار کی طرف ہے" (ان الی ربک الرجعٰی)۔

اور وہی سرکشوں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔

اصولی طور پر جس طرح کہ ہر چیز کی بازگشت اس کی طرف ہے اور سب مر جائیں گے، اور آسمان و زمین کی میراث اس کی پاک ذات کے لیے رہ جائے گی: وللہ میراث السمٰوات والارض (آل عمران ۔۱۸۰) ابتدا میں بھی تمام چیزیں اسی کی طرف سے تھیں، اور اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان خُود کو بے نیاز سمجھنے لگ جائے، اور مغرور ہوکر سرکش بن جائے۔

اس کے بعد مغرور سرکشوں کے کاموں کے ایک حصّہ، یعنی راہِ حق پر چلنے اور ہدایت و تقویٰ کے طریق کو طے کرنے سے روکنے کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "مجھے بتا کیا وہ شخص جو منع کرتا ہے" (ارءیت الذی ینھٰی)۔

"بندہ کو جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے" (عبدًا اذا صلّٰی)۔

کیا ایسا آدمی عذاب الٰہی کا مستحق نہیں ہے؟!

احادیث میں آیا ہے کہ "ابوجہل" نے اپنے اطرافیوں سے سوال کیا! کیا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے سامنے بھی (سجدہ کیلئے) مٹی پر چہرے کو رکھتا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! اس نے کہا: قسم ہے اس کی جس کی ہم قسم کھاتے ہیں، اگر میں اُسے اس حالت میں دیکھوں گا تو اپنے پاؤں سے اس کی گردن کو کچل کر رکھ دوں گا۔ انہوں نے اس سے کہا: وہ دیکھو! وہ اس جگہ نماز پڑھنے میں مشغول ہے۔ ابوجہل چلا تاکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گردن کو اپنے پاؤں کے نیچے کچلے۔ لیکن جب وہ قریب پہنچا تو پیچھے ہٹ گیا اور ایسا معلوم دیتا تھا جیسے کہ وہ کسی چیز کو اپنے ہاتھ سے ہٹا رہا ہے۔ ان لوگوں نے اس سے کہا، ہم تیری یہ کیا حالت دیکھ رہے ہیں؟ اس نے کہا: مَیں نے اچانک اپنے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق دیکھی ہے، اور ایک وحشت ناک منظر اور کچھ پر وبال مشاہدہ

کیے ہیں!

اس موقع پر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر وہ میرے قریب آجاتا تو خدا کے فرشتے اس کے بدن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے اور اس کے ایک ایک عضو کو اچک کر لے جاتے"!

اس موقع پر اُوپر والی آیات نازل ہوئیں،[1]

اِن روایات کے مطابق اُوپر والی آیات آغازِ بعثت میں نازل نہیں ہوئیں، بلکہ اس وقت نازل ہوئیں جب اسلام کی دعوت برملا ہو چکی تھی۔ اسی لیے ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ اس سورت کی صرف پہلی پانچ آیات ہی آغازِ بعثت میں نازل ہوئی تھیں، اور باقی کافی مدّت کے بعد نازل ہوئیں۔

لیکن بہرحال یہ شانِ نزول آیت کے مفہوم کی وسعت سے مانع نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں اور زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "مجھے بتا اگر یہ نماز گزار بندہ طریق ہدایت پر ہو"۔ (ارءیت ان کان علی الھدٰی)۔

"یا لوگوں کو تقویٰ کا حکم دے"۔ (او امر بالتقوٰی)۔ کیا اس کو منع کرنا مناسب ہے، اور کیا اس قسم کے شخص کی سزا جہنم کی آگ کے علاوہ کچھ اور ہو سکتی ہے؟!

"مجھے بتا اگر یہ سرکش آدمی جو راہِ حق کے راہ رو افراد کو نماز، ہدایت اور تقویٰ سے روکتا ہے اگر حق کی تکذیب کرے، اور اس سے رُوگردانی کرے، تو اس کی کیسی دردناک سرنوشت ہوگی"؟! (ارءیت ان کذب وتولّٰی)[2]

"کیا وہ نہیں جانتا کہ خدا اس کے تمام اعمال کو دیکھتا ہے، اور ان سب کو حساب و کتاب اور جزا و سزا کے لیے ثبت و ضبط کر رہا ہے"۔ (الم یعلم بان اللہ یرٰی)۔

اُوپر والی آیات میں قضیہ شرطیہ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس مغرور سرکش کو کم از کم یہ احتمال تو دینا چاہیئے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طریقِ ہدایت پر ہیں، اور اُن کی دعوت تقویٰ کی طرف دعوت ہے، یہی احتمال اس کی سرکشی کو روکنے کے لیے کافی ہے

اس بنا پر اِن آیات کا مفہوم، پیغمبرؐ کی تقویٰ کی طرف دعوت، اور ہدایت میں تردید نہیں ہوگا، بلکہ یہ اُوپر والے باریک نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

بعض مفسرین نے "کان" و "امر" کی ضمیر کو اسی نہی کرنے والے شخص کی طرف لوٹایا ہے، جیسا کہ "ابوجہل" تھا۔ اس بنا پر آیات کا مفہوم اس طرح ہو جائے گا، اگر وہ ہدایت کو قبول کر لے اور نماز سے منع کرنے کی بجائے تقویٰ کی دعوت کرے تو اس کی حالت کے لیے یہ کتنا مفید ہوگا؟

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

---

[1] تفسیر "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۱۵

[2] بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق اُوپر والی تینوں آیات میں "رأیت" کے جملے "اخبرنی" کے معنی میں ہیں جس کا ہم "مجھے بتا" کے ساتھ ترجمہ کرتے ہیں اور ان آیات میں جو شرطیں آئی ہیں ان کے جواب محذوف ہیں اور تقدیر میں اس طرح ہے کیف یکون حالہ ومجازاتہ وعذابہ؟: ایسے انسان کی سرنوشت اور سزا و عذاب کیسا ہوگا؟

ایک نکتہ

عالمِ ہستی محضرِ خُدا میں ہے

اِس واقعیت کی طرف توجہ کہ انسان جو کام بھی انجام دیتا ہے وہ خدا کے سامنے ہے، اور اصولاً "تمام عالمِ ہستی محضرِ خدا میں ہے" اور انسان کے اعمال میں سے کوئی بھی چیز، یہاں تک کہ اس کی نیّات بھی خدا سے پنہاں نہیں ہیں، انسان کی زندگی کے پروگرام پر زیادہ اثر انداز ہو سکتی ہے؛ اور اس کو غلط کاریوں سے روک سکتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وُہ واقعی اس مطلب پر ایمان رکھتا ہو اور اس نے ایک قطعی یقین کی صُورت اختیار کر لی ہو۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

"اعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك"

"خدا کی اس طرح عبادت کر گویا کہ تُو اُسے دیکھ رہا ہے، اور اگر تُو اُسے نہیں دیکھ سکتا تو وہ تجھے اچھی طرح سے دیکھ رہا ہے۔"

کہتے ہیں کہ ایک بیدار دل نے گناہ کے بعد توبہ کر لی تھی، لیکن ہمیشہ روتا رہتا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ تُو اتنا کیوں روتا ہے؟ کیا تُو نہیں جانتا کہ خداوند تعالیٰ بخشنے والا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! ممکن ہے کہ وہ معاف کر دے، لیکن یہ خجالت و شرمساری کہ اس نے مجھے گناہ کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے، اس کو اپنے سے کیسے دُور کروں؟!

گیرم کہ تو از سرِ گنہ در گزری
زان شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چکنم؟

مَیں نے مانا کہ تُو میرے گناہ کو ضرور معاف کر دے گا۔
لیکن اس شرم کا کیا کروں کہ تُو نے یہ دیکھ لیا ہے کہ میں نے کیا کیا ہے؟

❖ ❖ ❖

۱۵۔ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۙ

۱۶۔ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ

۱۷۔ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۙ

۱۸۔ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۙ

۱۹۔ كَلَّا ۖ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩

ترجمہ

۱۵۔ جیسا کہ وُہ خیال کرتا ہے ایسا نہیں ہے ، اگر وُہ اپنے کام سے دستبردار نہ ہوگا تو ہم اس کی ناصیہ (اس کے سَر کے اگلے حصّہ کے بال) پکڑ کر (عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے)

۱۶۔ وہی دروغ گو اور خطا کار ناصیہ (پیشانی)

۱۷۔ پھر وُہ جسے چاہے پُکارتا رہے (کہ وہ اس کی مدد کرے)

۱۸۔ ہم بھی عنقریب دوزخ کے مامورین کو پُکاریں گے۔

۱۹۔ جیسا کہ وُہ سمجھتا ہے ، ایسا نہیں ہے ، ہرگز اس کی اطاعت نہ کر ، اور سجدہ کر ، اور خدا کا تقرب حاصل کر۔

تفسیر

سجدہ کر اور تقرب حاصل کر!

اس بحث کے بعد، جو گزشتہ آیات میں کافر سرکشوں، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور نماز گزاروں کے لیے ان کی مزاحمت کے بارے میں آئی تھی، اِن آیات میں اُن پر سخت دھمکیوں کی بارش کرتے ہوئے فرماتا ہے، "جیسا کہ وہ خیال کرتا ہے ایسا نہیں ہے (وہ یہ گمان کرتا ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گردن پر ان کے سجدہ کے وقت پاؤں رکھ سکتا ہے، اور انہیں اس عبادت خدا سے روک سکتا ہے)" (کلّا)۔

"اگر وہ اپنے اس غرور اور جہالت سے دستبردار نہ ہوگا تو ہم اس کے سر کے اگلے حصہ کے بالوں کو پکڑ کر اُسے عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے۔" (لئن لم ینته لنسفعًا بالناصیة)۔

"وہی دروغ گو اور خطا کار کے سر کا اگلا حصہ (پیشانی)" (ناصیة کاذبة خاطئة)

"لنسفعًا" "سفع" (بروزن عفو) کے مادہ سے بعض مفسرین کے قول کے مطابق مختلف معنی رکھتا ہے: پکڑنا، اور سختی کے ساتھ کھینچنا، منہ پر طمانچہ مارنا، منہ کو کالا کرنا۔ (ان تین پتھروں کو بھی، جو دیگ کو آگ پر رکھتے وقت دیگ کے پایے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، سفع کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سیاہ اور دُھوئیں سے آلودہ ہوتے ہیں)۔ اور آخری بات نشان زدہ کرنے اور ذلیل کرنے کے لیے آتا ہے۔[1]

اور یہاں سب سے زیادہ مناسب وہی پہلا معنی ہے۔ اگرچہ زیر بحث آیت میں دوسرے معانی کا احتمال بھی ہے۔

بہر حال کیا اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ماجرا قیامت میں واقع ہوگا کہ ابوجہل جیسے افراد کے سر کے اگلے حصہ کے بالوں کو پکڑیں گے اور جہنم کی طرف کھینچ کر جائیں گے، یا دنیا میں پورا ہو جائے گا، یا دونوں باتیں ہوں گی؟ یہ بات بعید نہیں ہے کہ دونوں ہی مُراد ہوں، اور اس کا گواہ ذیل کی روایت ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے:

"جس وقت سورۂ الرحمٰن نازل ہوا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

"تم میں سے کون ہے؛ جو اس سُورہ کو رؤسائے قریش کے سامنے جا کر پڑھے۔"

حاضرین کچھ دیر کے لیے خاموش رہے چونکہ وہ سرداران قریش کی ایذا رسانی سے ڈرتے تھے۔

"عبداللہ بن مسعود" کھڑے ہو گئے اور کہا: اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں یہ کام کروں گا..... ابن مسعود چھوٹے سے جثہ کے تھے اور جسمانی لحاظ سے کمزور بھی تھے، کھڑے ہو کر سرداران قریش کے پاس پہنچ گئے۔ انہیں دیکھا کہ وہ کعبہ کے گرد اکٹھے بیٹھے ہیں، لہٰذا (ابن مسعود نے) سُورہ الرحمٰن کی تلاوت شروع کر دی۔

---

[1] "فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۲۲

"ابوجہل" نے کھڑے ہو کر ابن مسعودؓ کے منہ پر ایسا تھپڑ مارا کہ ان کا کان پھٹ گیا اور خون جاری ہو گیا۔

ابن مسعودؓ روتے ہوئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، جب پیغمبرؐ کی نگاہ ان پر پڑی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھ ہوا۔ آپؐ نے سر نیچے کر لیا اور گہرے غم و اندوہ میں ڈوب گئے۔

اچانک جبرئیل نازل ہوئے جب کہ وہ خنداں اور مسرور تھے، آپ نے فرمایا: اے جبرئیل تم کس لیے ہنس رہے ہو جب کہ ابن مسعود رو رہا ہے؛ (جبرئیل نے) عرض کیا عنقریب آپؐ کو اس کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔

یہ ماجرا گزر گیا۔ جب مسلمان جنگِ بدر کے دن کامیاب و کامران ہوئے تو ابن مسعود مشرکین کے مقتولین کے درمیان گردش کر رہے تھے، ان کی نظر ابوجہل پر پڑی کہ وہ آخری سانس لے رہا تھا، ابن مسعود اس کے سینہ پر سوار ہو گئے، جب اس کی نگاہ ان پر پڑی تو کہا: اے حقیر چرواہے، تو کتنے بلند مقام پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ابن مسعود نے کہا: الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ: "اسلام برتری حاصل کرے گا اور کسی چیز کو اسلام پر برتری نہیں ہوگی"۔

ابوجہل نے ان سے کہا اپنے دوست محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہہ دے: نہ تو زندگی میں کوئی شخص میری نظر میں اس سے زیادہ مبغوض تھا اور نہ ہی موت کی حالت میں۔

جب یہ بات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کانوں تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا:

"میرے زمانے کا فرعون موسیٰؑ کے زمانے کے فرعون سے بدتر ہے۔ کیونکہ اس نے تو اپنی عمر کے آخری لمحات میں یہ کہا تھا: میں ایمان لے آیا ہوں، لیکن اس کی سرکشی اور بھی بڑھ گئی"۔

اس کے بعد ابوجہل نے ابن مسعودؓ کی طرف رُخ کر کے کہا: میرا سر اس تلوار سے قطع کر جو زیادہ تیز ہے۔ جب ابن مسعود نے اس کا سر قلم کیا تو وہ اس کو اُٹھا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں نہ لا سکے۔ (لہٰذا اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر زمین پر کھینچتے ہوئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے کر پہنچے اور آیت کا مضمون اس دنیا میں پورا ہو گیا)[1]

"ناصیۃ" سر کے اگلے حصہ کے بالوں کو کہتے ہیں۔ اور ان بالوں کو پکڑنا ایسی جگہ بولا جاتا ہے جب کسی شخص کو کسی کام کے لیے ذلت و خواری کے ساتھ لے جائیں، کیونکہ جب کسی کے سر کے اگلے حصہ کے بالوں کو پکڑتے ہیں تو اس سے ہر قسم کی حرکت کی قدرت سلب ہو جاتی ہے اور اس کے لیے سرِ تسلیم خم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔

البتہ لفظ "ناصیۃ" افراد و اشخاص کے لیے بھی اور نفیس اشیاء کے بارے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ ہم فارسی (اور اُردو) زبان میں "جمعیت کی پیشانی" یا "عمارت کی پیشانی" سے تعبیر کرتے ہیں۔

"ناصیۃ کاذبۃ خاطئۃ" کی تعبیر ایسے شخص کی طرف اشارہ ہے، جو یہ ناصیہ رکھتا ہے، جو جھوٹا بھی تھا اور خطاکار بھی، جیسا کہ ابوجہل تھا۔

ایک روایت میں ابن عباسؓ سے آیا ہے کہ ایک دن ابوجہل رسولِ خدا صلی اللہ علیہ

---

[1] "تفسیر رازی" جلد ۳۲ ص ۲۳ (تلخیص کے ساتھ)۔

وآلہ وسلم کے پاس آیا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقام ابراہیم کے پاس نماز میں مشغول تھے، اس نے پکار کر کہا کیا میں نے تجھے اس کام سے منع نہیں کیا تھا؟ حضرتؐ نے اس کو جھڑک کر دھتکار دیا۔

ابوجہل نے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! تم مجھے جھڑکتے ہو اور مجھے دھتکارتے ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اس سرزمین میں میری قوم اور قبیلہ سب سے زیادہ ہے[1]

اس موقع پر بعد والی آیت نازل ہوئی: "یہ جاہل و مغرور اپنی ساری قوم و قبیلہ کو پکار لے اور انہیں مدد کے لیے بلا لے (فلیدع ناديه)۔

"ہم بھی مامورینِ دوزخ کو پکار لیں گے" (سندع الزبانية)۔

تاکہ اُسے معلوم ہو جائے کہ اس بے خبر غافل سے کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ مامورینِ عذاب کے جھنگل میں پرکاہ کی طرح ایک خوفناک طوفان کے درمیان میں ہے۔

"نادی" "ندا" (پکارنا) کے مادے سے مجلسِ عمومی کے معنی میں ہے، اور بعض اوقات مرکزِ تفریح کو بھی نادی کہا جاتا ہے، چونکہ وہاں لوگ ایک دوسرے کو پکارتے اور ندا دیتے ہیں۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ "ندا" سے لیا گیا ہے جو بخشش کے معنی میں ہے۔ کیونکہ وہاں ایک دوسرے کی پذیرائی کرتے ہیں۔

"دارالندوۃ" بھی جو قریش کی مشہور مجلسِ مشاورت کہی جاتی تھی اسی معنی سے لی گئی ہے۔

لیکن یہاں "نادی" سے مُراد وہ جماعت ہے جو اس مجلس میں جمع ہوتی تھی۔ یا دوسرے لفظوں میں اس سے وہ قوم و قبیلہ اور دوست مراد ہیں جن کی قوت پر ابوجہل جیسے لوگ اپنے کاموں میں بھروسہ کرتے تھے۔

"زبانية" جمع "زبنیہ" (زا کی زیر کے ساتھ) اصل میں انتظامی مامورین کے معنی میں ہے جو "زبن" (بروزن متن) کے مادہ سے دفع کرنے، ضرب لگانے اور دُور کرنے کے معنی میں ہے، اور یہاں فرشتگانِ عذاب اور دوزخ کے مامورین کے معنی میں ہے۔

اس سورہ کی آخری آیت میں جو آیۂ سجدہ ہے، فرماتا ہے: "اس طرح نہیں ہے جیسا کہ وہ خیال کرتا ہے اور تیرے سجدہ کے ترک کرنے پر اصرار کرتا ہے "کلا"

"ہرگز اس کی اطاعت نہ کر، اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سجدہ کر اور اس کا تقرب حاصل کر" (لا تطعه واسجد واقترب)۔

دنیا زمانے کے ابوجہل اس سے کہیں زیادہ حقیر و ناچیز ہیں کہ تجھے سجدہ کرنے سے روک سکیں، یا تیرے دین و آئین کی ترقی میں روڑے اٹکا سکیں اور اس میں کوئی رکاوٹ ڈال سکیں۔ تو پروردگار پر توکل کرتے ہوئے اس کی عبادت و بندگی اور سجدہ کے ساتھ اس راستہ میں قدم بڑھائے جا، اور ہر روز اپنے خدا سے نزدیک سے نزدیک تر ہوتا چلا جا۔

ضمنی طور پر اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ سجدہ انسان کے لیے بارگاہِ خدا کے قُرب اور نزدیکی کا باعث ہے۔ اور اسی لیے ایک حدیث میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

---

[1] "فی ظلال القرآن" جلد ۱۰ ص ۶۲۴

"اقرب ما یکون العبد من اللہ اذا کان ساجدًا"

"بندے کی خدا سے سب سے زیادہ قُرب کی حالت اس وقت ہوتی ہے جب وہ سجدہ میں ہوتا ہے"

البتہ ہمیں معلوم ہے کہ اہلِ بیت عصمتؑ کی روایات کے مطابق قرآن مجید میں چار سجدے واجب ہیں "الم سجدہ" و "حٰم سجدہ" و "النجم" اور یہاں "سُورۂ علق" میں اور قرآن کے باقی سجدے مستحب ہیں۔

ایک نکتہ

سرکشی اور بے نیازی کا احساس

دُنیا کے اکثر مفاسد اور خرابیاں مرفہ الحال اور متکبر طبقوں سے قوت حاصل کرتی ہیں، اور انبیاء کے مقابلہ میں مخالفت کرنے والوں کی صفِ اوّل میں یہی لوگ ہوتے تھے، وہی لوگ جنہیں قرآن کبھی "ملأ" (اعراف ۔ ۶۰) سے تعبیر کرتا ہے، اور کبھی "مترفین" (سبا ۔ ۳۴) سے، اور کبھی "مستکبرین" (مؤمنون ۔ ۶۷) کے ساتھ جن میں سے پہلا لفظ تو ان اشراف کی جمعیت کی طرف اشارہ ہے جن کا ظاہر آنکھوں کو بھلا لگتا ہے لیکن ان کا باطن خالی ہوتا ہے، اور دوسرا لفظ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو ناز و نعمت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور مست و مغرور ہو جاتے ہیں اور انہیں دُوسروں کے دُکھ درد کی کوئی خبر نہیں دیتی، اور تیسرا لفظ ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو کبر و غرور کی سواری پر سوار ہو کر خدا اور خلقِ خدا سے دُور ہو جاتے ہیں۔

اور ان سب کا سرچشمہ بے نیازی اور غنا کا احساس ہے، اور یہ کم ظرف لوگوں کی خصوصیات میں سے ہے کہ جب وہ کوئی نعمت، مال یا کوئی مرتبہ و مقام حاصل کر لیتے ہیں تو وہ ایسے مست ہو جاتے ہیں اور بے نیازی کا احساس کرنے لگ جاتے ہیں کہ جس سے خدا کو بھی بھُول جاتے ہیں۔

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہوا کے ایک ذرا سے جھونکے سے دفترِ بام درہم و برہم ہو جاتا ہے اور انسان کا سارا مال و دولت ایک ساعت سے بھی کم وقت میں نابود ہو سکتا ہے، یا سیلاب و زلزلہ اور بجلی کی ایک کڑک سب کچھ برباد کر کے رکھ دیتی ہے اور انسان کی سلامتی بھی، پانی کے ایک گھونٹ کے گلے میں پھنس جانے سے، ایسی خطرے میں پڑ جاتی ہے کہ موت آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتی ہے۔

یہ کیسی غفلت ہے جو کچھ لوگوں کو دامن گیر ہو جاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو بے نیاز خیال کرنے لگ جاتے ہیں اور غرور کی سرکش سواری پر سوار ہو کر معاشرے کے میدان کو اپنی جولانگاہ بنا لیتے ہیں۔

اِس جہل و نادانی، اور اس بے خبری اور خیرہ سری سے خدا کی پناہ۔

ایسی حالت سے بچنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انسان تھوڑا سا اپنے بے حساب ضعف و کمزوری اور پروردگار کی عظیم قدرت پر غور کرے، اور تھوڑا سا گزرے ہوئے لوگوں کی تاریخ کی ورق گردانی کر لے، اور ان اقوام کی سرگزشت کو جو اس سے زیادہ قوی اور طاقت ور تھے، دیکھ لے تاکہ غرور کی سواری سے نیچے اُتر آئے۔

خداوندا ! ہمیں کبر و غرور سے ، جو تجھ سے دُوری کا اصل سبب ہے ، محفوظ رکھ۔
پروردگارا ! ہمیں دُنیا و آخرت میں ایک لمحہ کے لیے بھی ہمارے اپنے سپُرد نہ کرنا۔
بارِ الٰہا ! ہمیں ایسی قدرت عطا فرما کہ ہم ان مغرور متکبرین کی ناک کو ، جو تیرے سامنے سدِّ راہ بنے ہوئے ہیں ، رگڑ کر رکھ دیں اور ان کے تمام منصوبوں کو مٹا دیں۔

❖ ❖ ❖

آمین یا ربّ العالمین

سُورۂ علق کا اختتام

❖ ❖ ❖

سُورَۃُ الْقَدْرِ

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا

❖ اس میں ۵ آیات ہیں۔

سُورۂ "قدر" کے مطالب اور اس کی فضیلت

اِس سُورہ کا مضمون ، جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے، شبِ قدر میں قرآن کا نزول ہے۔ اس کے بعد شب قدر کی اہمیت اور اس کے برکات و آثار کا بیان ہے۔

اس بارے میں کہ یہ سُورہ " مکّہ " میں نازل ہوا ہے یا " مدینہ " میں ، مفسّرین کے درمیان مشہور اس کا " مکی " ہونا ہے لیکن بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوا ہے کیونکہ ایک روایت میں آیا ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ " بنی اُمیہ " آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر پر چڑھ گئے ہیں - یہ چیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گراں گزری اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رنجیدہ ہوئے تو سُورہ قدر نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی، (لہٰذا بعض علما، " لیلۃ القدر خیر من الف شھر " کو بنی اُمیہ کی حکومت کی طرف ناظر سمجھتے ہیں جو تقریباً ایک ہزار ماہ رہی) اور ہم جانتے ہیں کہ مسجد اور منبر مدینہ میں بنائے گئے تھے [1]

اس سُورہ کی فضیلت میں یہی کافی ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

" من قرأھا اعطی من الاجر کمن صام رمضان واحیا لیلۃ القدر "

" جو شخص اس کی تلاوت کرے گا تو وہ اس شخص کی طرح ہوگا جس نے ماہِ رمضان کے روزے رکھے اور شب قدر کو احیاء کیا ہو " [2]

---

[1] " رُوح المعانی " جلد ۳۰ ص ۱۸۸ و " درالمنثور " جلد ۶ ص ۳۷۱

[2] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝

۲۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۝

۳۔ لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝

۴۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝

۵۔ سَلٰمٌ ۛ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔

۲۔ اور تُو کیا جانے کہ شب قدر کیا ہے ؟!

۳۔ شب قدر ہزار مہینہ سے بہتر ہے۔

۴۔ فرشتے اور رُوح اس رات میں اپنے پروردگار کے اذن سے ہر کام (کی تقدیر) کے لیے اُترتے ہیں۔

۵۔ یہ ایک ایسی رات ہے جو طلوعِ صبح تک سلامتی (اور برکت و رحمت) سے پُر ہے۔

تفسیر

شب قدر نزولِ قرآن کی رات

قرآن کی آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید ماہ مبارک رمضان میں نازل ہوا ہے : شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن " (بقرہ - ۱۸۵) اور اس تعبیر کا ظاہر یہ ہے کہ سارا قرآن اسی ماہ میں نازل ہوا ہے۔

اور سُورہ قدر کی پہلی آیت میں مزید فرماتا ہے : ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا ہے " (انّا انزلناہ فی لیلۃ القدر)۔

اگرچہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ قرآن کا نام ذکر نہیں ہوا ، لیکن یہ بات مسلم ہے کہ " انّا انزلناہ " کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹتی ہے اور اس کا ظاہری ابہام اس کی عظمت اور اہمیت کے بیان کے لیے ہے ۔

" انّا انزلناہ " (ہم نے اسے نازل کیا ہے) کی تعبیر بھی اس عظیم آسمانی کتاب کی عظمت کی طرف ایک اور اشارہ ہے جس کے نزول کی خدا نے اپنی طرف نسبت دی ہے مخصوصاً صیغہ متکلم مع الغیر کے ساتھ جو جمع کا مفہوم رکھتا ہے ، اور یہ عظمت کی دلیل ہے ۔

اس کا شب قدر میں نزول ، وہی شب جس میں انسانوں کی سرنوشت اور مقدرات کی تعیین ہوتی ہے ۔ یہ اس عظیم آسمانی کتاب کے سرنوشت ساز ہونے کی ایک اور دلیل ہے ۔

اس آیت کو سُورہ بقرہ کی آیت کے ساتھ ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شب قدر ماہ مبارک رمضان میں ہے ، لیکن وہ کون سی رات ہے قرآن سے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا ۔ لیکن روایات میں اس سلسلہ میں بہت زیادہ بحث آئی ہے ۔ ہم انشاء اللہ اس سُورہ کے آخر میں اس سلسلہ میں بھی اور دوسرے مسائل کے بارے میں بھی گفتگو کریں گے ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخی لحاظ سے بھی اور قرآن کے مضمون کے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی سے ارتباط کے لحاظ سے بھی یہ مُسلّم ہے کہ یہ آسمانی کتاب تدریجی طور پر اور ۲۳ سال کے عرصہ میں نازل ہوئی ہے ۔ یہ بات اُوپر والی آیات سے جو یہ کہتی ہیں کہ ماہِ رمضان میں اور شب قدر میں نازل ہوئی ، کس طرح سازگار ہوگی ؟

اس سوال کا جواب ۔ جیسا کہ بہت سے محققین نے کہا ہے ۔ یہ ہے کہ قرآن کے دو نزول ہیں ۔

۱ ۔ نزول دفعی جو ایک ہی رات میں سارے کا سارا پیغمبر اکرمؐ کے پاک قلب پر یا بیت المعمور پر یا لوحِ محفوظ سے نچلے آسمان پر نازل ہُوا ۔

۲ نزول تدریجی : جو تیئیس ۲۳ سال کے عرصہ میں نبوت کے دوران انجام پایا ۔ (ہم سورہ دُخان کی آیہ ۳ جلد ۲۱ تفسیر نمونہ ص ۱۴۱ سے آگے اس مطلب کی تشریح کر چکے ہیں) ۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آغازِ نزولِ قرآن شبِ قدر میں ہوا تھا ، نہ کہ سارا قرآن ، لیکن یہ چیز آیت کے ظاہر کے خلاف ہے ، جو کہتی ہے کہ ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کے نازل ہونے کے سلسلے میں بعض آیات میں " انزال " اور بعض میں " تنزیل " کی تعبیر ہوئی ہے ۔ اور لغت کے کچھ متنوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ " تنزیل " کا لفظ عام طور پر وہاں بولا جاتا ہے جہاں کوئی چیز تدریجاً نازل ہو لیکن " انزال " زیادہ

وسیع مفہوم رکھتا ہے جو نزولِ دفعی کو بھی شامل ہوتا ہے[1]۔ تعبیر کا یہ فرق جو قرآن کی آیات میں آیا ہے ممکن ہے کہ اُوپر والے دو نزولوں کی طرف اشارہ ہو۔

بعد والی آیت میں شب قدر کی عظمت کے بیان کے لیے فرماتا ہے: "تو کیا جانے کہ شب قدر کیا ہے"۔ (وما ادراك ما لیلة القدر)۔

اور بلا فاصلہ کہتا ہے: "شب قدر ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینے سے بہتر ہے"۔ (لیلة القدر خیر من الف شهر)۔

یہ تعبیر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ اس رات کی عظمت اس قدر ہے کہ پیغمبرِ اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک بھی اپنے اس وسیع و عریض علم کے باوجود آیات کے نزول سے پہلے واقف نہیں تھے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہزار ماہ اسّی (۸۰) سال سے زیادہ ہے۔ واقعاً کتنی باعظمت رات ہے جو ایک پُربرکت طولانی عمر کے برابر قدر و قیمت رکھتی ہے۔

بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

> "بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نے لباسِ جنگ زیبِ تن کر رکھا تھا، اور ہزار ماہ تک اُسے نہ اُتارا، وہ ہمیشہ جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول (یا آمادہ) رہتا تھا۔ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب و انصار نے تعجب کیا، اور آرزو کی کہ کاش اس قسم کی فضیلت و افتخار انہیں بھی میسّر آئے تو اُوپر والی آیات نازل ہوئیں۔ اور بیان کیا کہ شب قدر ہزار ماہ سے افضل ہے[2]۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی اسرائیل کے چار افراد کا ذکر کیا جنہوں نے اسّی سال بغیر معصیت کیے خدا کی عبادت کی تھی۔ اصحاب نے آرزو کی کہ کاش وہ بھی اس قسم کی توفیق حاصل کرتے تو اس سلسلہ میں اُوپر والی آیات نازل ہوئیں[3]۔

اس بارے میں کہ یہاں ہزار کا عدد "تعداد" کے لیے ہے یا "تکثیر" کے لیے بعض نے کہا ہے: یہ تکثیر کے لیے ہے، اور شب قدر کی قدر و منزلت کئی ہزار ماہ سے بھی زیادہ ہے، لیکن وہ روایات جو ہم نے اُوپر نقل کی ہیں وہ اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ عددِ مذکور تعداد ہی کے لیے ہے۔ اور اصولی طور پر بھی عدد ہمیشہ تعداد کے لیے ہوتا ہے مگر یہ کہ تکثیر پر کوئی واضح قرینہ موجود ہو۔

اس کے بعد اس عظیم رات کی مزید تعریف و توصیف کرتے ہوئے اضافہ کرتا ہے: "اس رات میں فرشتے اور رُوح اپنے پروردگار کے اذن سے ہر کام کی تقدیر کے لیے نازل ہوتے ہیں"۔ (تنزل الملائکة والروح فیها باذن ربهم من کل امر)۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "تنزل" فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کرتا ہے (جو اصل میں "تتنزل" تھا) واضح ہو جاتا ہے کہ شبِ قدر پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور نزولِ قرآن کے زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، بلکہ یہ ایک امر مستمر ہے، اور ایسی رات ہے

---

[1] مفردات راغب مادہ نزل۔

[2] "درالمنثور" جلد ۶ ص ۳۷۱

جو ہمیشہ آتی رہتی ہے اور ہر سال آتی ہے۔

اس بارے میں کہ رُوح سے کیا مُراد ہے بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مُراد "جبرئیل امین" ہے، جسے "رُوح الامین" بھی کہا جاتا ہے، اور بعض نے "رُوح" کی سُورہ شوریٰ کی آیہ ۵۲ "وکذالک اوحینا الیک روحًا من امرنا" "جیسا کہ ہم نے گزشتہ انبیاء پر وحی کی تھی، اسی طرح سے تجھ پر بھی اپنے فرمان سے وحی کی ہے" کے قرینہ سے "وحی" کے معنی میں تفسیر کی ہے۔

اِس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا "فرشتے وحی الٰہی کے ساتھ، مقدرات کی تعیین کے سلسلہ میں، اس رات میں نازل ہوتے ہیں"۔

یہاں ایک تیسری تفسیر بھی ہے جو سب سے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "رُوح ایک بہت بڑی مخلوق ہے جو فرشتوں سے مافوق ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے سوال کیا: کیا رُوح وہی جبرئیل ہے"؟ امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

"جبرئیل من الملائکۃ، والروح اعظم من الملائکۃ ان اللہ عزوجل یقول: تنزل الملائکۃ والروح"

"جبرئیل تو ملائکہ میں سے ہے، اور رُوح ملائکہ سے زیادہ عظیم ہے، کیا خداوند تعالیٰ یہ نہیں فرماتا: ملائکہ اور رُوح نازل ہوتے ہیں"؟[1]

یعنی مقابلہ کے قرینہ سے یہ دونوں آپس میں مختلف ہیں۔ لفظ "روح" کے لیے یہاں دوسری تفاسیر بھی ذکر ہوئی ہیں کیونکہ ان کے لیے کوئی دلیل نہیں تھی، لہٰذا ان سے صرفِ نظر کی گئی ہے۔

"من کل امر" سے مُراد یہ ہے کہ فرشتے سرنوشتوں کی تقدیر و تعیین کے لیے، اور ہر خیر و برکت لانے کے لیے اس رات میں نازل ہوتے ہیں، اور ان کے نزول کا مقصد ان امور کی انجام دہی ہے۔

یا یہ مُراد ہے کہ وہ ہر امرِ خیر اور ہر سرنوشت اور تقدیر کو اپنے ساتھ لاتے ہیں[2]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ خدا کے امر و فرمان سے نازل ہوتے ہیں لیکن مناسب وہی پہلا معنی ہی ہے۔

"ربھم" کی تعبیر کو، جس میں ربوبیت اور تدبیرِ جہاں کے مسئلہ پر بات ہوئی ہے، ان فرشتوں کے کام کے ساتھ قریبی مناسبت ہے، کہ وہ امور کی تدبیر و تقدیر کے لیے نازل ہوتے ہیں، اور ان کا کام بھی پروردگار کی ربوبیت کا ایک گوشہ ہے۔

اور آخری آیت میں فرماتا ہے: "یہ ایک ایسی رات ہے، جو طلوع صبح تک سلامتی اور خیر و برکت و رحمت سے پُر رہتی ہے"۔

(سلام ھی حتّٰی مطلع الفجر)۔

قرآن بھی اسی میں نازل ہوا، اس کا احیاء اور شب بیداری بھی ہزار ماہ کے برابر ہے، خدا کی خیرات و برکات بھی اسی شب میں نازل ہوتی ہیں اس کی رحمتِ خاص بھی بندوں کے شاملِ حال ہوتی ہے، اور فرشتے اور رُوح بھی اسی رات میں نازل ہوتے ہیں۔

---

[1] "تفسیر برہان" جلد ۴ ص ۴۸۱

[2] پہلی تفسیر کے مطابق "من" "لام" کے معنی میں ہے اور "من کل امر" کا مطلب "لاجل کل امر" ہے، اور دوسری تفسیر کے مطابق "من" "باء مصاحبت" کے معنی میں ہے۔

اسی بنا پر یہ ایک ایسی رات ہے جو آغاز سے اختتام تک سراسر سلامتی ہی سلامتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق تو اس رات میں شیطان کو زنجیر میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے بھی یہ ایک ایسی رات ہے جو سالم اور سلامتی سے توأم ہے۔

اس بنا پر "سلام" کا اطلاق، جو سلامت کے معنی میں ہے۔ (سالم کے اطلاق کے بجائے) حقیقت میں ایک قسم کی تاکید ہے، جیسا کہ بعض اوقات ہم کہہ دیتے ہیں کہ فلاں آدمی عین عدالت ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس رات پر "سلام" کا اطلاق اس بنا پر ہے کہ فرشتے مسلسل ایک دوسرے پر یا مومنین پر سلام کرتے ہیں یا پیغمبرؐ کے حضور میں اور آپ کے معصوم جانشین کے حضور میں جاکر سلام عرض کرتے ہیں۔

ان تفسیروں کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

بہرحال یہ ایک ایسی رات ہے جو ساری کی ساری نور و رحمت، خیر و برکت، سلامت و سعادت، اور ہر لحاظ سے بے نظیر ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا گیا، کیا آپ جانتے ہیں کہ شبِ قدر کون سی رات ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا:

"کیف لا نعرف والملائکۃ تطوف بنا فیھا"

"ہم کیسے نہ جانیں گے جب کہ فرشتے اس رات ہمارے گرد طواف کرتے ہیں"[1]

حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں آیا ہے کہ خدا کے کچھ فرشتے آپ کے پاس آئے، اور انہیں بیٹے کے تولد کی بشارت دی اور ان پر سلام کیا، (ھود - ۶۹)

کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو جو لذت ان فرشتوں کے سلام میں آئی، ساری دنیا کی لذتیں بھی اس کے برابر نہیں تھیں۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ جب شبِ قدر میں فرشتے گروہ در گروہ نازل ہو رہے ہوں، اور مومنین کو سلام کر رہے ہوں، تو اس میں کتنی لذت، لطف اور برکت ہوگی؟!

جب ابراہیمؑ کو آتشِ نمرود میں ڈالا گیا، تو فرشتوں نے آکر آپ کو سلام کیا اور آگ ان پر گلزار بن گئی، تو کیا شب قدر میں مومنین پر فرشتوں کے سلام کی برکت سے آتش دوزخ "برد" و "سلام" نہیں ہوگی؟

ہاں! یہ اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کی نشانی ہے کہ وہاں تو خلیل پر نازل ہوتے ہیں اور یہاں اسلام کی اس اُمت پر۔[2]

چند نکات

۱۔ شب قدر میں کون سے امور مقدّر ہوتے ہیں؟

اِس سوال کے جواب میں کہ اس رات کو، شبِ قدر، کا نام کیوں دیا گیا ہے، بہت کچھ کہا گیا ہے: منجملہ یہ کہ:

---

[1] "تفسیر برہان" جلد ۴ ص ۴۸۸ حدیث ۲۹

[2] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۳۶

۱۔ شب قدر کو شب قدر کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ بندوں کے تمام سال کے سارے مقدرات اسی رات میں تعیین ہوتے ہیں، اس معنی کی گواہ سورۂ دخان ہے جس میں آیا ہے کہ: انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ انا کنا منذرین فیھا یفرق کل امر حکیم: "ہم نے اس کتاب مبین کو ایک پُر برکت رات میں نازل کیا ہے، اور ہم ہمیشہ ہی ڈراتے رہے ہیں، اس رات میں ہر امر خداوند عالم کی حکمت کے مطابق تنظیم و تعیین ہوتا ہے" (دخان - ۳ و ۴)

یہ بیان متعدد روایات کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو کہتی ہیں کہ اس رات میں انسان کے ایک سال کے مقدرات کی تعیین ہوتی ہے اور رزق، عمریں اور دوسرے امور اسی مبارک رات میں تقسیم اور بیان کیے جاتے ہیں۔

البتہ یہ چیز انسان کے ارادہ اور مسئلہ اختیار کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتی کیونکہ فرشتوں کے ذریعے تقدیر الٰہی لوگوں کی شائستگیوں اور لیاقتوں، اور ان کے ایمان و تقویٰ اور نیت اعمال کی پاکیزگی کے مطابق ہوتی ہے۔

یعنی ہر شخص کے لیے وہی کچھ مقدر کرتے ہیں جو اس کے لائق ہے، یا دوسرے لفظوں میں، اس کے مقدمات خود اسی کی طرف سے فراہم ہوتے ہیں، اور یہ امر نہ صرف یہ کہ اختیار کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتا، بلکہ یہ اس پر ایک تاکید ہے۔

۲۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس رات کا اس وجہ سے شب قدر نام رکھا گیا ہے کہ وہ ایک عظیم قدر و شرافت کی حامل ہے (جس کی نظیر سورۂ حج کی آیہ ۷۴ میں آئی ہے) (ماقدروا اللہ حق قدرہ) انہوں نے حقیقت میں خدا کی قدر و عظمت کو ہی نہیں پہچانا"

۳۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اپنی پوری قدر و منزلت کے ساتھ، قدر و منزلت والے رسولؐ پر اور صاحب قدر و منزلت فرشتے کے ذریعے اس میں نازل ہوا ہے۔

۴۔ یا یہ مطلب ہے کہ یہ ایک ایسی رات ہے جس میں قرآن کا نازل ہونا مقدر ہوا ہے۔

۵۔ یا یہ ہے کہ جو شخص اس رات کو بیدار رہے تو وہ صاحب قدر و مقام و منزلت ہو جاتا ہے۔

۶۔ یا یہ بات ہے کہ اس رات میں اس قدر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ ان کے لیے عرصۂ زمین تنگ ہو جاتا ہے، کیونکہ تقدیر تنگ ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ ومن قدر علیہ رزقہ (طلاق - ۷)

ان تمام تفاسیر کا "لیلۃ القدر" کے وسیع مفہوم میں جمع ہونا پورے طور پر ممکن ہے اگرچہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب اور زیادہ مشہور ہے۔

۲۔ شب قدر کون سی رات ہے؟

اس بارے میں کہ "لیلۃ القدر" ماہ رمضان میں ہوتی ہے، کوئی شک و شبہ نہیں ہے کیونکہ قرآن کی تمام آیات اسی معنی کا اقتضا کرتی ہیں، ایک طرف تو وہ کہتی ہیں کہ قرآن ماہ رمضان میں نازل ہوا ہے (بقرہ - ۱۸۵) اور دوسری طرف یہ کہتی ہیں کہ شب قدر میں نازل ہوا ہے۔ (آیات زیر بحث)۔

لیکن اس بارے میں کہ ماہ رمضان کی راتوں میں سے کون سی رات ہے، بہت اختلاف ہے، اور اس سلسلہ میں بہت سی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ منجملہ: پہلی رات، سترھویں رات، انیسویں رات، اکیسویں رات، تئیسویں رات، ستائیسویں رات اور انتیسویں رات۔

لیکن روایات میں مشہور و معروف یہ ہے کہ ماہ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے اکیسویں یا تئیسویں رات ہے، اسی لیے ایک روایت

میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماہِ مبارک کی آخری دس راتوں میں تمام راتوں کا احیاء فرماتے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ شب قدر اکیسویں یا تئیسویں رات ہے، یہاں تک کہ جب راوی نے اصرار کیا کہ ان دونوں راتوں میں سے کون سی رات ہے اور یہ کہا کہ اگر میں ان دونوں راتوں میں عبادت نہ کر سکوں تو پھر کون سی رات کا انتخاب کروں؟ تو بھی امامؑ نے تعیین نہ فرمائی اور مزید کہا:

"ما الیسر لیلتین فیما تطلب"

"اس چیز کے لیے جسے تُو چاہتا ہے دو راتیں کس قدر آسان ہیں؟"[1]

لیکن متعدد روایات میں جو اہلِ بیت کے طریقہ سے پہنچی ہیں، زیادہ تر تئیسویں رات پر تکیہ ہوا ہے۔ جب کہ اہلِ سنت کی زیادہ تر روایات ستائیسویں رات کے گرد گردش کرتی ہیں۔

ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"التقدیر فی لیلۃ القدر تسعۃ عشر، والابرام فی لیلۃ احدی وعشرین، والامضاء فی لیلۃ ثلاث وعشرین"

"تقدیر مقدرات تو انیسویں کی شب کو ہوتی ہے، اور ان کا حکم اکیسویں رات کو، اور ان کی تصدیق اور منظوری تئیسویں رات کو۔"[2]

اور اس طرح سے روایات کے درمیان جمع ہو جاتی ہے۔

لیکن بہرحال، اس وجہ کی بناء پر جس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا، شب قدر کو ابہام کے ایک ہالے نے گھیر رکھا ہے۔

۳۔ شب قدر مخفی کیوں رکھی گئی؟

بہت سے علماء کا نظریہ یہ ہے کہ سال بھر کی راتوں یا ماہِ مبارک رمضان کی راتوں میں شبِ قدر کا مخفی ہونا اس بناء پر ہے کہ لوگ ان سب راتوں کو اہمیت دیں۔ جیسا کہ خدا نے اپنی رضا و خوشنودی کو مختلف قسم کی عبادتوں میں پنہاں کر رکھا ہے تاکہ لوگ سب عبادتوں اور اطاعتوں کی طرف رُخ کریں۔ اور اپنے غضب کو معاصی کے درمیان پنہاں رکھا ہے، تاکہ لوگ سب گناہوں سے پرہیز کریں، اپنے دوستوں کو لوگوں سے مخفی رکھا ہے تاکہ سب کا احترام کریں اور دُعاؤں کی قبولیت کو مختلف دعاؤں میں پنہاں رکھا ہے تاکہ دُعاؤں کی طرف رُخ کریں۔ اسمِ اعظم کو اپنے اسماء میں مخفی رکھا ہے تاکہ تمام اسماء کو بزرگ و عظیم سمجھیں۔ اور موت کے وقت کو مخفی رکھا ہے تاکہ ہر حالت میں آمادہ و تیار رہیں۔ اور یہ فلسفہ مناسب نظر آتا ہے۔

۴۔ کیا گزشتہ اُمتوں میں بھی شب قدر تھی؟

اس سُورہ کی آیات کے ظاہر سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ شب قدر منزلِ قرآن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۶۲۵ حدیث ۵۸

[2] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۶۲۶ حدیث ۶۲

ساتھ مخصوص نہیں تھی۔ بلکہ دنیا کے اختتام تک اس کا ہر سال تکرار ہوتا رہے گا۔

فعل مضارع (تنزل) کی تعبیر، جو استمرار پر دلالت کرتی ہے، اور اسی طرح جملہ اسمیہ "سلام ھی حتّٰی مطلع الفجر" کی تعبیر بھی، جو دوام کی نشانی ہے، اسی معنی کی گواہ ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی روایات بھی، جو شاید حدِ تواتر میں ہیں، اِس معنی کی تائید کرتی ہیں۔

لیکن یہ بات کہ کیا یہ گزشتہ اُمتوں میں بھی تھی یا نہیں؟ متعدد روایات کی تصریح یہ ہے کہ یہ اس اُمت پر مواہبِ الٰہیہ میں سے ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"ان اللہ وھب لامتی لیلۃ القدر لم یعطھا من کان قبلھم"

"خدا نے میری اُمت کو شبِ قدر عطا کی ہے، گزشتہ اُمتوں میں سے کسی کو بھی یہ نعمت نہیں ملی تھی۔"[1]

اُوپر والی آیات کی تفسیر میں بھی بعض وارد شدہ روایات اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔

۵۔ شب قدر ہزار ماہ سے کیسے برتر ہے؟

ظاہر ہے کہ اس شب کا ہزار ماہ سے بہتر ہونا اس رات کو بیدار رہنے اور اس کی عبادت کی قدر و قیمت کی وجہ سے ہے، اور لیلۃ القدر کی فضیلت اور اس میں عبادت کی فضیلت کی روایات، جو شیعہ اور اہلِ سنّت کی کتابوں میں فراواں ہیں، اس مطلب کی مکمل طور سے تائید کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ اس رات میں قرآن کا نزول اور اس میں برکات اور رحمتِ الٰہی کا نزول بھی اس بات کا سبب ہے کہ یہ ہزار ماہ سے برتر و بالاتر ہو۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے "علی بن ابی حمزہ ثمالی" سے فرمایا:

شبِ قدر کی فضیلت کو اکیسویں اور تیئیسویں رات میں تلاش کرو، اور ان دونوں راتوں میں سے ہر ایک میں ایک سو رکعت نماز بجالاؤ۔ اور اگر تم سے ہو سکے تو ان دونوں راتوں کا طلوعِ صبح تک احیا کرو، اور اس رات کو غسل کرو۔

"ابوحمزہ" کہتا ہے: میں نے عرض کیا، "اگر میں کھڑے ہو کر یہ سب نمازیں نہ پڑھ سکوں"۔

آپؑ نے فرمایا: پھر بیٹھ کر پڑھ لو۔ میں نے عرض کیا: اگر اس طرح بھی نہ پڑھ سکوں۔ آپؑ نے فرمایا: پھر بستر میں (لیٹ کر) پڑھ لو[2] اور رات کے پہلے حصہ میں تھوڑا سا سو لینے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے، اور اس کے بعد عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ ماہِ رمضان میں آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور شیاطین طوق و زنجیر میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں اور مومنین کے اعمال مقبول ہوتے ہیں، ماہِ رمضان کتنا اچھا مہینہ ہے۔

---

[1] "درالمنثور" ج ۶ ص ۳۷۱

[2] "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۶۲۶ حدیث ۵۸ کا ایک حصہ۔

۶۔ قرآن شب قدر میں کیوں نازل ہوا ؟

کیونکہ شب قدر میں ایک سال کے لیے انسانوں کی سرنوشت ان کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مطابق مقدر کی جاتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اس رات بیدار رہے۔ اور توبہ اور اپنے آپ کو بہتر بنانے کی کوشش کرے اور خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو کر خود میں اس کی رحمت کے لیے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر لیاقت پیدا کرے۔

ہاں ! جن لمحات میں ہماری سرنوشت کی تعیین ہوتی ہے، ان میں انسان کو سویا ہوا نہیں ہونا چاہیئے، اور نہ ہی ہر چیز سے غافل اور بے خبر رہنا چاہیئے کیونکہ اس صورت میں ایک غم ناک سرنوشت ہو جائے گی۔

قرآن چونکہ ایک سرنوشت ساز کتاب ہے۔ اور اس میں انسانوں کی سعادت و خوش بختی اور ہدایت کی باتوں کی وضاحت کی گئی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ سرنوشتوں کی تعیین کا پروگرام شب قدر میں نازل ہو۔ قرآن اور شب قدر کے درمیان کتنا خوبصورت رابطہ ہے، اور ان دونوں کا ایک دوسرے سے تعلق اور رشتہ کس قدر پُر معنی ہے ؟

۷۔ کیا مختلف علاقوں میں ایک ہی شب قدر ہوتی ہے ؟

ہم جانتے ہیں کہ تمام شہروں میں قمری مہینوں کا آغاز یکساں نہیں ہوتا اور یہ ممکن ہے کہ ایک علاقہ میں تو آج اول ماہ ہو، اور دوسرے علاقہ میں دوسری تاریخ ہو۔ اس بنا پر شبِ قدر سال میں ایک معین رات نہیں ہو سکتی، کیونکہ مثال کے طور پر مکہ کی تیئیسویں رات، ایران و عراق میں بائیسویں کی رات ہو سکتی ہے، اس طرح سے اصولی طور پر ہر ایک کی علیحدہ شب قدر ہوگی۔ کیا یہ بات اس چیز سے، جو آیات و روایات سے معلوم ہوتی ہے، کہ شب قدر ایک معین رات ہے، سازگار ہے ؟!

اس سوال کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ رات وہی کرۂ زمین کے آدھے سایہ کو ہی کہتے ہیں، جو کرۂ زمین کے دوسرے حصہ پر پڑتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ سایہ گردش زمین کے ساتھ حرکت میں ہے، اور اس کا ایک مکمل دورہ چوبیس گھنٹوں میں انجام پاتا ہے۔ اس بنا پر ممکن ہے کہ شب قدر رات کا زمین کے گرد ایک مکمل دورہ ہو۔ یعنی تاریکی کی چوبیس گھنٹے کی مدت جو زمین کے تمام نقاط کو اپنے سائے کے نیچے لے لے۔ وہ شب قدر ہے، جس کا آغاز ایک نقطہ سے ہوتا ہے، اور دوسرے نقطہ میں اختتام پذیر ہوتا ہے۔ (غور کیجئے)۔

خداوندا ! ہمیں اس قسم کی بیداری و آگاہی عطا فرما کہ لیلۃ القدر کی فضیلت سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھائیں۔

پروردگارا ! ہماری چشمِ اُمید تیرے لُطف و کرم پر لگی ہوئی ہے، ہمارے مقدرات کو اس کے موافق معین فرما۔

بارِ الٰہا ہمیں اس مہینہ کے محرومین میں سے قرار نہ دے کہ جس سے بالاتر کوئی محرومیت نہیں ہے۔

آمین یا ربّ العالمین

سُورہ "قدر" کا اختتام

آخر ماہ مبارک رمضان ۱۴۰۷ھ

اختتام ترجمہ

بروز جمعہ ایک بج کر پانچ منٹ
(عجیب اتفاق ہے)
بر مکان حقیر قم مقدس۔ ایران

سُورَہ اَلْبَیِّنَة

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا
❖ اِس میں ۸ آیات ہیں ۔

سُورۂ بینہ کے مطالب اور اس کی فضیلت

مشہور یہ ہے کہ یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے اور اس کے مطالب بھی اسی معنی کی گواہی دیتے ہیں، کیونکہ اس میں بار بار اہلِ کتاب کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اہلِ کتاب سے مسلمانوں کا زیادہ تر سروکار مدینہ میں ہی ہوا۔

اس سے قطع نظر نماز اور زکوٰۃ دونوں کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے، یہ ٹھیک ہے کہ زکوٰۃ کا شرعی حکم تو مکہ میں ہی ہوگیا تھا، لیکن اس کو قانونی صورت اور وسعت مدینہ میں دی گئی۔

بہرحال یہ سُورہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے ہمہ گیر ہونے، اور اس کے روشن و واضح دلائل اور نشانیوں سے آمیختہ ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایسی رسالت جس کے لیے پہلے سے انتظار کیا جارہا تھا۔ لیکن جب ان کے پاس یہ رسالت پہنچی تو ایک گروہ نے اس بناء پر کہ ان کے مادّی منافع خطرے میں پڑ رہے تھے اس کی طرف سے پُشت پھیر لی۔

ضمنی طور پر یہ اس حقیقت کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے کہ انبیاء کی دعوت کا اصول، مثلاً ایمان و توحید و نماز و روزہ، ایک ایسا اصول ہے جو ثابت اور جاودانی ہے اور یہ تمام آسمانی ادیان میں موجود رہا ہے۔

اس سورہ کے ایک دوسرے حصہ میں اہلِ کتاب اور مشرکین کے اسلام کے مقابلہ میں اعتراضات کو مشخص کرتا ہے کہ وہ گروہ جو ایمان لے آیا ہے اور اعمالِ صالح انجام دیتا ہے وہ تو بہترین مخلوق ہے۔ اور وہ گروہ جس نے کفر، شرک اور گناہ کی راہ اختیار کرلی ہے، وہ بدترین مخلوق شمار ہوتی ہے۔

اِس سورہ کے مختلف نام ہیں، جو اس کے الفاظ کی مناسبت سے انتخاب ہوئے ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور سورہ "بینۃ" و "لم یکن" و "قیمۃ" ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں اس طرح نقل ہوا ہے:۔

"اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اس سورہ میں کون کون سی برکتیں ہیں تو وہ اپنے گھر والوں اور مال و منال کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھتے۔"

قبیلہ "خزاعہ" کے ایک شخص نے عرض کیا: اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس کی تلاوت کا اجر و ثواب کیا ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"کوئی منافق اور وہ لوگ جن کے دل میں شک و شبہ ہے، اس کی تلاوت نہیں کریں گے خدا کی قسم مقرب فرشتے اس دن سے جب سے سارے آسمان اور زمین پیدا ہوئے ہیں اسے پڑھتے ہیں، اور اس کی تلاوت میں ایک لمحہ کے لیے بھی سستی نہیں کرتے جو شخص اسے رات کے وقت پڑھے گا، خدا ایسے فرشتوں کو مامور کرے گا، جو اس کے دین و دنیا کی حفاظت کریں گے، اور اس کے لیے بخشش اور رحمت طلب کریں گے، اور اگر دن کے وقت پڑھے گا تو اُن چیزوں کی مقدار میں جنہیں دن روشن کرتا ہے، اور رات انہیں تاریک بنا دیتی ہے، اُسے ثواب دیں گے۔[1]

❖ ❖ ❖

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۲۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ

۲۔ رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ

۳۔ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۚ

۴۔ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۚ

۵۔ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۙ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ ۚ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے کفار (کہتے تھے) جب تک ان کے لیے واضح دلیل نہ آجائے وُہ اپنے دین سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

۲۔ خدا کی طرف سے ایسا رسول جو پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرے۔

۳۔ اور اُن میں صحیح اور قابلِ قدر تحریریں ہوں۔

۴۔ لیکن اہلِ کتاب نے (خدا کے دین میں) اختلاف نہیں کیا مگر اُن کے پاس واضح دلیل پہنچ جانے کے بعد۔

۵۔ حالانکہ انہیں کوئی حکم اس کے سوا نہیں دیا گیا تھا کہ وہ کمال اخلاص کے ساتھ خدا کی عبادت کریں، شرک سے توحید کی طرف لوٹیں، نماز کو قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اور یہی مستقیم اور صحیح دین ہے۔

تفسیر

یہ جاودانی دین ہے

سورہ کے شروع میں ظہور اسلام سے پہلے اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) اور مشرکینِ عرب کی حالت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ اس بات کا دعویٰ کیا کرتے تھے کہ جب تک کوئی واضح دلیل اور مسلّم پیغمبر ان کے پاس نہ آجائے، وہ اپنے دین سے دستبردار نہیں ہوں گے۔" (لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین منفکین حتّٰی تأتیھم البیّنۃ)۔

"ایسا پیغمبر جو خدا کی طرف سے ہو اور پاک و پاکیزہ صحیفوں کو ہمارے سامنے تلاوت کرے۔" (رسول من اللہ یتلوا صحفًا مطھرۃ)۔

ایسے صحیفے جن میں موزوں، ثابت اور قابلِ قدر تحریریں ہوں۔" (فیھا کتب قیمۃ)۔

ہاں! وہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور سے پہلے اسی قسم کے دعوے کیا کرتے تھے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور اور آپؐ کی کتابِ آسمانی کے نزول کے بعد میدان بدل گیا اور وہ خدا کے دین میں اختلاف کرنے لگ گئے۔" اور اہلِ کتاب نے اختلاف نہیں کیا، مگر واضح دلیل اور سچا اور آشکار پیغمبر ان کے پاس آجانے کے بعد" (وما تفرق الذین اوتوا الکتاب الّا من بعد ما جاءتھم البیّنۃ)۔

اس طرح سے اُوپر والی آیات اہلِ کتاب اور مشرکین کے دعووں کو بیان کر رہی ہیں کہ ابتداء میں تو انہیں یہ اصرار تھا کہ اگر کوئی پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ ہمیں دعوت دینے کے لیے آئے گا تو ہم قبول کرلیں گے۔

لیکن اس کے آجانے کے بعد وہ اپنے اس قول سے پھر گئے اور اس کے مقابلہ میں جنگ و جدال کے لیے کھڑے ہوگئے، سوائے اس گروہ کے جنہوں نے ایمان کی راہ اختیار کرلی۔

اس بنا پر اُوپر والی آیت اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورہ بقرہ کی آیہ ۸۹ : ولما جاء هم كتاب من عند الله مصدق لما معهم وكانوا من قبل يستفتحون على الذين كفروا فلما جاءهم ما عرفوا كفروا به فلعنة الله على الكافرين : میں آئی ہے۔ یعنی جب خدا کی طرف سے ان کے پاس کتاب آئی جو ان نشانیوں کے موافق تھی جو ان کے پاس تھیں، اور اس سے پہلے وہ خود کو فتح کی خوش خبری دیا کرتے تھے۔ لیکن جب یہ کتاب اور وہ پیغمبر جسے انہوں نے پہلے سے پہچانا ہوا تھا، ان کے پاس آیا تو وہ کافر ہوگئے، پس کافروں پر خدا کی لعنت ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ اہلِ کتاب اس قسم کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے، اور اصولی طور پر، مشرکینِ عرب بھی، جو اہلِ کتاب کو اپنے سے زیادہ عالم اور زیادہ آگاہ سمجھتے تھے، اس پروگرام میں ان کے ساتھ ہم آواز تھے۔ لیکن جب ان کی آرزوئیں پوری ہوگئیں تو انہوں نے اپنے راستہ کو بدل لیا اور مخالفین کی صفوں میں جا ملے۔

مفسرین کی ایک جماعت کا ان آیات کی تفسیر کے بارے میں ایک دوسرا نظریہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ واقعاً وہ اپنے ادعا کے مطابق اپنے دین سے دستبردار نہیں ہوئے، اور اُسے نہیں چھوڑا جب تک کہ واضح دلیل ان کے پاس نہ آگئی۔

لیکن اس بات کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس قسم کی واضح دلیل آجانے کے بعد وہ ایمان لے آئیں گے۔ حالانکہ بعد والی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ یہ مطلب اس طرح نہیں تھا۔ مگر اس صورت میں کہ یہ کہا جائے کہ اس سے مُراد ان میں سے ایک گروہ کا ایمان لانا ہے، چاہے وہ بالکل قلیل تعداد میں ہی ہوں، اور اصطلاح کے مطابق یہ "موجبۂ جزئیہ" کی قبیل سے ہے۔

لیکن بہرحال یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے، اور شاید اسی بنا پر "فخر رازی" اپنی تفسیر میں پہلی آیت کو قرآنی آیات میں سب سے زیادہ پیچیدہ آیت شمار کرتا ہے، جو (اس کی نظر میں) بعد والی آیات سے تضاد رکھتی ہے۔ اس کے بعد وہ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے چند طریقے بیان کرتا ہے جن میں سے بہترین وہی ہے جو ہم نے اُوپر نقل کیا ہے۔

یہاں ایک تیسری تفسیر بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا مشرکین اور اہلِ کتاب کو ان کی حالت پر نہیں چھوڑے گا، جب تک کہ ان پر اتمامِ حجت نہ کر دے اور کوئی دلیل "بیّنہ" نہ بھیجے، اور انہیں راستہ نہ بتا دے۔ اسی لیے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔

حقیقت میں یہ آیت قاعدۂ لُطف کی طرف اشارہ ہے جو علمِ کلام میں بیان کیا جاتا ہے کہ خدا اتمامِ حجت کے لیے ہر قوم و ملت کے لیے واضح دلائل بھیجے گا۔[1]

بہرحال "بیّنہ" سے مُراد یہاں واضح و روشن دلیل ہے جس کا مصداق دوسری آیت کے مطابق "رسول اللہ" صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے جب کہ آپ کی زبان پر قرآن مجید تھا۔

---

[1] اس بات پر توجہ کرنا چاہیئے کہ "منفکین" جو "منفک" کی جمع ہے، ممکن ہے کہ اسم فاعل ہو، یا اسم مفعول ہو، پہلی اور دوسری تفسیر کی بنا پر اسم فاعل کے معنی دیتا ہے اور تیسری تفسیر کی بنا پر اسم مفعول کا (غور کیجئے)

"صحف" "صحیفہ" کی جمع ہے، جو ایسے اوراق کے معنی میں ہے جن پر کوئی چیز لکھتے ہیں، اور یہاں اس سے مُراد ان اوراق کے مطالب ہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز کوئی چیز اوراق سے نہیں پڑھتے تھے۔

اور "مطہرہ" سے مُراد، اس کا ہر قسم کے شرک، کذب، دروغ اور باطل سے پاک ہونا ہے اور شیاطینِ جن و انس کے اس میں دخل دینے سے پاک ہے۔

جیسا کہ سُورہ حٰم سجدہ کی آیہ ۴۲ میں آیا ہے: لایأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ: "اس کے پاس کسی قسم کا باطل نہ اس کے سامنے سے آتا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے۔

"فیھا کتب قیمۃ" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان صحف آسمانی میں ایسے مطالب لکھے ہوئے ہیں جن میں کسی قسم کا انحراف اور کجی نہیں ہے۔ اس بنا پر تو "کتب" "مکتوبات" کے معنی میں ہے، یا یہ ان احکام و مقررات کے معنی میں ہے جو خدا کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں کیونکہ کتابت تعیین حکم کے معنی میں بھی آئی ہے جیسا کہ فرماتا ہے: کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم۔ "روزہ تمہارے اُوپر اسی طرح سے مقرر کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر مقرر کیا گیا تھا" (بقرہ ۱۸۳)

اور اس طرح "قیمۃ" "صاف و مستقیم، یا محکم و پائیدار، یا قدر و قیمت والا کے معنی میں ہے، یا یہ سب مفاہیم اس میں جمع ہیں۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ چونکہ قرآن میں تمام گزشتہ کتب کے مضامین و مطالب بہت سے اضافات کے ساتھ ہیں، لہٰذا یہ کہا گیا ہے کہ اس میں گزشتہ کتب قیمہ ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پہلی آیت میں اہلِ کتاب کا "مشرکین" سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ اور چوتھی آیت میں صرف اہلِ کتاب کا بیان ہے اور مشرکین کے سلسلہ میں کوئی بات نہیں کی گئی، حالانکہ آیت دونوں کی طرف ناظر ہے۔

یہ تعبیرات ظاہراً اس وجہ سے ہیں کہ ان پروگراموں میں اہلِ کتاب اصل اور بنیادی حیثیت رکھتے تھے اور مشرکین ان کے تابع تھے۔

یا اس بنا پر ہے کہ اہلِ کتاب زیادہ لائقِ مذمت تھے کیونکہ ان میں بہت سے علما اور دانش مند موجود تھے اور وہ اس لحاظ سے مشرکین کی نسبت بلند سطح پر تھے۔ اس بنا پر ان کی مخالفت زیادہ قبیح اور زیادہ ناپسندیدہ تھی، لہٰذا وہ زیادہ سرزنش کے لائق تھے۔

اس کے بعد "اہلِ کتاب" کو اور ان کے تابع "مشرکین" کو ملامت کرتے ہوئے فرماتا ہے: "انہوں نے اس جدید دین میں اختلاف کیوں کیا کہ بعض تو ایمان لے آئے اور بعض کافر ہو گئے حالانکہ اس دین میں انہیں اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا ہے کہ خدا کی عبادت کریں، اور اس کی عبادت کو اس کے غیر کی عبادت سے خالص رکھیں، اور ہر قسم کے شرک سے باز رکھیں اور توحید کی طرف مائل رہیں، نماز کو قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں"۔ (وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکاۃ)[1]

---

[1] "وما امروا" کا جملہ ممکن ہے کہ "جملہ حالیہ" ہو یا "استینافیہ" ہو اور "لیعبدوا" میں "لام" "لام غرض" ہو، اور یہاں اس سے مراد وہ مقصد اور نتیجہ ہے جو بندوں کی طرف لوٹتا ہے، نہ کہ وہ ہدف و نتیجہ جو خدا کی طرف لوٹے، جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے "لام غرض" کا انکار کیا ہے۔ اصولی طور پر خدا کے تمام افعال کی کوئی نہ کوئی غرض اور علت ہوتی ہے، لیکن وہ اغراض ایسے ہوتے ہیں جو بندوں کی طرف لوٹتے ہیں اور بعض نے یہاں "لام" کو "ان" کے معنی میں سمجھا ہے جیسا کہ "یرید اللہ لیبین لکم" (نساء: ۲۶) میں ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے :

" اور یہ ایک مستقیم و پائیدار دین ہے " (وذالك دین القیمة)۔

اس بارے میں کہ یہاں " وما امروا " سے کیا مراد ہے ؟ ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اہل کتاب کے اپنے دین میں مسئلہ توحید اور نماز و زکوٰۃ موجود تھا ، اور یہ ایسے مسائل ہیں جو ثابت ہیں ، لیکن وہ ان احکام کے بھی وفادار نہیں رہے تھے۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ دین اسلام میں سوائے خالص توحید ، اور نماز و زکوٰۃ وغیرہ کے اور کوئی حکم نہیں آیا۔ اور یہ ایسے امور ہیں جنہیں وہ سب جانتے تھے۔ تو پھر وہ ان کو قبول کرنے سے روگردانی کیوں کرتے ہیں ؟ اور ان کو ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔

دوسرا معنی زیادہ نزدیک دکھائی دیتا ہے ، کیونکہ گزشتہ آیت کے بعد ، جو دین جدید کے قبول کرنے میں ان کے اختلاف کرنے کی بات کر رہی تھی ، مناسب یہی ہے کہ " امروا " جدید دین کی طرف ناظر ہو۔

اس سے قطع نظر پہلا معنی صرف اہل کتاب کے بارے میں صادق آتا ہے ، اور مشرکین پر صادق نہیں آتا ، جب کہ دوسرا معنی سب کو شامل ہے۔

بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق " دین " سے مراد جسے خدا کے لیے خالص کرنا چاہیئے وہی " عبادت " ہے ، اور " الا لیعبدوا اللہ " کا جملہ بھی ، جو اس سے پہلے ذکر ہوا ہے ، اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے دین و شریعت کا مجموعہ مراد ہو ، یعنی وہ اس بات پر مامور ہوئے تھے کہ خدا کی پرستش کریں اور ہر جہت سے اپنے دین و آئین کو خالص رکھیں۔ یہ معنی " دین " کے وسیع مفہوم کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔ اور بعد والا جملہ " وذالك دین القیمة " جو دین کو وسیع معنی میں پیش کرتا ہے اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔

" حنفاء " " حنیف " کی جمع ہے ، جو " حنف " (بروزن کنف) کے مادہ سے ہے ، اور " مفردات " میں " راغب " کے قول کے مطابق گمراہی سے راہ مستقیم کی طرف مائل ہونے کے معنی میں ہے اور عرب ان تمام لوگوں کو جو " حج " بجا لاتے تھے یا " ختنہ " کیا کرتے تھے ، " حنیف " کہا کرتے تھے (اور احنف) اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کا پاؤں ٹیڑھا ہو۔

مجموعی طور سے لغت کی مختلف کتابوں سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں انحراف اور ٹیڑھے پن کے معنی میں تھا ، البتہ قرآن ، اور اسلامی روایات میں شرک سے توحید و ہدایت کی طرف انحراف کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس تعبیر کا انتخاب ممکن ہے اصل میں اس بنا پر ہو کہ بت پرست معاشرے ہر اس شخص کو جو ان کے دین کو چھوڑ کر توحید کی طرف قدم بڑھاتا تھا ، اُسے " حنیف " (منحرف) شمار کرتے تھے ، اور پھر آہستہ آہستہ یہ تعبیر راہ توحید کو طے کرنے والوں کے لیے ایک رائج تعبیر کے عنوان سے پہچانی گئی ، اور حقیقت میں اس کا مفہوم " ضلالت " سے ہدایت کی طرف انحراف تھا۔ اور اس کا لازمہ ، وہی توحید خالص اور اعتدال کامل اور ہر قسم کے افراط و تفریط سے اجتناب ہے ، لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ سب اس لفظ کے ثانوی معنوی ہیں۔

" وذالك دین القیمة " کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اصول یعنی توحید خالص اور نماز (خالق کی طرف توجہ) اور زکوٰۃ (مخلوق کی طرف توجہ) تمام ادیان کے ثابت اور پائیدار اصول ہیں ، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

کیونکہ ایک طرف تو انسان کی سرنوشت مسئلہ توحید پر ہے اور دوسری طرف سے اس کی فطرت منعم کا شکر ادا کرنے اور اس کی معرفت و شناخت کی دعوت دیتی ہے، اور تیسری طرف سے رُوح اجتماعی اور انسان کی مدنیت اُسے محروم افراد کی مدد کے لیے پکارتی ہے۔

اِس بنا پر ان احکام و دستورات کی جڑ بنیاد کلّی طور پر فطرت کی جُملہ گہرائیوں میں موجود ہے۔ اسی لیے یہ تمام گزشتہ انبیا اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات میں پائی جاتی ہے۔

❖ ❖ ❖

گزشتہ صفحہ کا حاشیہ

لہ اس بات پر توجہ رکھنا چاہیئے کہ "دین القیمۃ" اضافت کی صورت میں ہے، وصف کی صورت میں نہیں ہے۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ ایک ایسا دین ہے جو گزشتہ (مستقیم اور قابلِ قدر) کتب قیمہ میں آیا ہے، یا یہ ایک ایسا دین ہے جس میں اسلام کے مستقیم اور قابلِ قدر احکام بیان ہوئے ہیں۔ اس بنا پر قیمہ کا مؤنث ہونا اس وجہ سے ہے کہ وہ "کتب" یا ملت و شریعت کا وصف ہے (غور کیجئے)

۶۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمْ شَرُّ الْبَرِیَّۃِ ؕ

۷۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ ؕ

۸۔ جَزَآؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ؕ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ ؕ

ترجمہ

۶۔ اہلِ کتاب اور مُشرک کفار دوزخ میں جائیں گے اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے، وہ بدترین مخلوق ہیں۔

۷۔ یقینی طور سے وُہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیے ہیں، وُہ (خدا کی) بہترین مخلوق ہیں۔

۸۔ ان کی جزاء ان کے پروردگار کے یہاں بہشتِ جاودانی کے باغات ہیں، جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وُہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، خدا بھی ان سے راضی ہے اور

وُہ بھی خدا سے راضی ہیں، اور یہ (بلند مقام) اس شخص کے لیے ہے، جو اپنے پروردگار سے ڈرے۔

تفسیر

بہترین اور بدترین مخلوق

گزشتہ آیات میں آیا تھا کہ کفار اہلِ کتاب اور مشرکین اس انتظار میں تھے کہ خدا کی طرف سے کوئی واضح و روشن دلیل ان کے پاس آئے، لیکن واضح و روشن دلیل "بینہ" کے آجانے کے بعد وہ متفرق اور پراگندہ ہوگئے اور ہر ایک نے الگ الگ راہ اختیار کرلی زیرِ بحث آیات میں اس دعوتِ الٰہی کے مقابلہ میں "کفر کرنے والے" اور "ایمان لانے والے" دونوں گروہوں اور ان میں سے ہر ایک کے انجام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ اس جدید دین سے کافر ہوئے ہیں وہ دوزخ کی آگ میں ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ وہ بدترین مخلوق ہیں"۔ (ان الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین فی نار جھنم خالدین فیھا اولئک ھم شر البریۃ)۔

"کفروا" کی تعبیر دینِ اسلام کے مقابلہ میں ان کے کفر کی طرف اشارہ ہے۔ ورنہ ان کا پہلے کا کفر و شرک کوئی نئی بات نہیں ہے۔

"اولئک ھم شر البریۃ" (وہ بدترین مخلوق ہیں) کی تعبیر ایک لرزہ خیز تعبیر ہے، جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ تمام چلنے پھرنے والی مخلوق، اور نہ چلنے پھرنے والی مخلوق میں سے، ان لوگوں سے بڑھ کر مردود اور دھتکاری ہوئی مخلوق اور کوئی نہیں ہے۔ جنہوں نے حق کے واضح ہوتے ہوئے اور اتمامِ حجت کے بعد سیدھی راہ کو چھوڑ دیا اور ضلالت و گمراہی کی راہ اختیار کرلی۔ اور یہ بات حقیقت میں اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورہ انفال کی آیہ ۲۲ میں بیان ہوئی ہے: ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون: "خدا کے نزدیک بدترین جانور وہ لوگ ہیں جو نہ سُننے والے کان رکھتے ہیں، نہ گویا زبان اور نہ ہی بیدار فکر و اندیشہ"۔

یا جو کچھ سورۂ اعراف کی آیہ ۱۷۹ میں بیان ہوا ہے، جہاں دوزخیوں کے گروہ کو ان ہی اوصاف کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے: اولئک کالانعام بل ھم اضل اولئک ھم الغافلون: وہ چوپاؤں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ اور وہ غافل ہیں۔

زیرِ بحث آیت کا مطلب ان سے بھی کچھ آگے ہے کیونکہ یہ ان کا بدترین مخلوق ہونے کے ساتھ ان کا تعارف کراتی ہے اور یہ حقیقت میں ان کے جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کی ایک دلیل کے طور پر ہے۔

وہ بدترین مخلوق کیوں نہ ہوں گے جب کہ سعادت کے تمام دروازے ان کے سامنے کھلے ہوئے تھے لیکن وہ کبر و غرور اور عناد و ہٹ دھرمی کی وجہ سے جان بُوجھ کر مخالفت کے لیے کھڑے ہوگئے۔

اس آیت میں بھی "اہل کتاب" کو مشرکین پر مقدم رکھنے کی وجہ بھی ممکن ہے یہ ہو کہ وہ کتابِ آسمانی کے حامل اور دانشمند تھے۔ اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیاں ان کی کتابوں میں صراحت کے ساتھ آئی تھیں۔ اس بنا پر ان کا مخالفت کرنا زیادہ قبیح و بدتر تھا۔

بعد والی آیت میں دوسرے گروہ کی طرف، جو اُن کے مخالف نقطۂ مقابل اور قوس صعودی میں واقع ہوئے ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیے ہیں وہ خدا کی بہترین مخلوق ہیں: (ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات اولئک ھم خیر البریۃ)۔

اس کے بعد ان کی جزا اور پاداش کو چند مختصر سے جملوں میں اس طرح بیان کرتا ہے: ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس بہشت کے جاودانی باغات ہیں، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے" (جزاؤھم عند ربھم جنات عدن تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ابدًا)۔

"خدا بھی ان سے خوش اور راضی ہے، اور وہ بھی خدا سے خوش اور راضی ہیں" (رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ)۔

"یہ بلند و والا مقام اور اہم و بے نظیر جزائیں اس شخص کے لیے ہیں جو اپنے پروردگار سے ڈرے" (ذالک لمن خشی ربہ)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مومنین کے بارے میں اعمالِ صالح کی گفتگو بھی درمیان میں آئی ہے، جو حقیقت میں ایمان کے درخت کا پھل ہے۔ اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنا اکیلا کافی نہیں ہے، بلکہ انسان کے اعمال بھی اس کے ایمان پر گواہ ہونے چاہئیں، لیکن کفر اکیلا ہی، چاہے اس کے ساتھ غیر صالح اعمال نہ بھی ہوں، سقوط و بدبختی کا سبب ہے۔ اس سے قطع نظر کفر عام طور پر انواع و اقسام کے گناہوں، جرائم اور غلط اعمال کا مبدا بھی ہوتا ہے۔

"اولئک ھم خیر البریۃ" کی تعبیر اچھی طرح سے اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ مومن اور اعمالِ صالح بجا لانے والے انسان، فرشتوں تک سے بھی برتر و بالاتر ہیں، کیونکہ آیت مطلق ہے، اور اس میں کسی قسم کا استثنا نہیں ہے۔ قرآن کی دوسری آیات بھی اسی معنی کی گواہ ہیں مثلاً: فرشتوں کے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کی آیات، اور آیہ ولقد کرمنا بنی اٰدم (اسراء - ۷۰)

بہرحال اس آیت میں پہلے تو ان کے مادی و جسمانی صلہ، جو جنت کے پُرنعمت باغات ہیں، کا ذکر کرتا ہے، اور اس کے بعد ان کی معنوی و روحانی جزا کو بیان کرتا ہے کہ خدا بھی اُن سے راضی ہے اور وہ بھی خدا سے راضی اور خوش ہیں۔

وہ خدا سے راضی اور خوش ہیں کیونکہ جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ اس نے انہیں دیا ہے، اور خدا اُن سے راضی اور خوش ہے کیونکہ وہ جو کچھ چاہتا تھا وہ انہوں نے انجام دے دیا، اور اگر ان سے کوئی لغزش ہو بھی گئی ہو تو اس نے اپنے لطف و کرم سے اس سے صرفِ نظر کی، اس سے بڑھ کر اور کون سی لذت ہو سکتی ہے کہ اُسے اس بات کا احساس ہو جائے کہ اس کے کاموں کو معبود نے قبول کر لیا ہے اور اس کا محبوب اس سے راضی اور خوش ہے۔ اور اُسے اس کی لقا حاصل ہو گئی ہے۔

دارند ہر کس از تو مرادے و مطلبے
مقصود ما ز دنیا و عقبیٰ لقائے تو است

"ہر شخص تجھ سے کوئی نہ کوئی خواہش اور مطلب رکھتا ہے
لیکن ہمارا مقصد دنیا و آخرت میں تیری لقاء ہے"

ہاں! انسان کے جسم کی جنت تو اُس جہان کے جاودانی باغات ہیں، لیکن اس کی رُوح کی بہشت خدا کی رضا اور لقائے محبوب ہے "ذالك لمن خشی ربه" کا جملہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ان تمام برکات کا سرچشمہ خدا کا خوف، خشیت اور ڈر ہے، کیونکہ یہی خوف ہی ہر قسم کی اطاعت، تقویٰ اور اعمالِ صالح کی طرف حرکت کرنے کا سبب بنتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو سورۂ فاطر کی آیہ ۲۸ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء "صرف علماء ہی خدا سے ڈرتے ہیں" کے ساتھ ملا کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بہشت پر حقیقتاً علماء اور آگاہ دانش مند لوگوں کا مسلّمہ حق ہے۔

البتہ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ خشیت اور خوفِ خدا کے کئی درجے اور مرتبے ہوتے ہیں اور علم و دانش و آگاہی میں بھی کئی درجے اور مرتبے ہوتے ہیں اس بات کا مفہوم واضح اور روشن ہو جاتا ہے۔

ضمنی طور پر بعض کا نظریہ یہ ہے کہ "مقامِ خشیت" "مقامِ خوف" سے بالاتر ہوتا ہے، کیونکہ خوف تو ہر قسم کے ڈر پر بولا جاتا ہے، لیکن خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جو تعظیم و احترام کے ساتھ ہو۔

چند نکات

۱۔ علیؑ اور ان کے شیعہ خیرالبریہ ہیں

بکثرت روایات ہیں، جو اہلِ سنّت کے طریقوں سے ان کی مشہور کتابوں میں اور اسی طرح شیعوں کی مشہور کتابوں میں نقل ہوئی ہیں آیہ "اولئك هم خیرالبریة" (وہ خدا کی بہترین مخلوق ہیں) کی علی علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔

"حاکم حسکانی" نیشاپوری نے، جو پانچویں صدی ہجری کے مشہور علماء اہلِ سنّت میں سے ہیں، ان روایات کو اپنی مشہور کتاب "شواھد التنزیل" میں مختلف اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے، اور ان کی تعداد بیس روایات سے زیادہ ہے جن میں سے ہم چند روایات کو نمونہ کے طور پر آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ "ابن العباس" کہتے ہیں جس وقت آیہ "الذین آمنوا وعملوا الصالحات اولئك هم خیرالبریة" نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے فرمایا:

"هو انت وشیعتك تأتی انت وشیعتك یوم القیامة راضیین مرضیین ویأتی عدوك غضبانا مقمحین"۔

"اس آیت سے مُراد تو اور تیرے شیعہ ہیں جو روزِ قیامت عرصۂ محشر میں اس حال میں وارد ہوں گے کہ تم بھی خدا سے راضی ہوگے اور خدا بھی تم سے راضی ہوگا، اور تیرا دشمن غصّہ کی حالت میں عرصۂ محشر میں وارد ہوگا اور زبردستی اس کو جہنم میں دھکیل دیا جائے گا"۔ (حدیث کے بعض نسخوں میں مقمحین آیا ہے، جس کا معنی طوق و زنجیر کے ذریعہ سر کو اُونچا رکھنا ہے)[1]

---

[1] "شواہد التنزیل" جلد ۲ ص ۳۵۷ حدیث ۱۱۲۶

۲۔ ایک دوسری حدیث میں "ابو برزہ" سے آیا ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی تو فرمایا:

"ھم انت وشیعتك یا علی ومیعادما بینی و بینك الحوض"

"اے علیؑ! وہ تو اور تیرے شیعہ ہیں، اور تیری اور میری وعدہ گاہ حوض کوثر ہے۔"[1]

۳۔ ایک اور حدیث میں "جابر بن عبداللہ انصاری" سے آیا ہے کہ ہم خانۂ خدا کے پاس پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ علیؑ ہماری طرف آئے۔ جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ ان پر پڑی تو فرمایا:

"قد اتاکم اخی"

"میرا بھائی تمہاری طرف آرہا ہے۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانۂ خدا کی طرف رُخ کیا اور فرمایا:

"فقال ورب ھذہ البنیۃ ان ھذا وشیعتہ ھم الفائزون یوم القیامۃ"

"اس کعبہ کے خدا کی قسم یہ شخص اور اس کے شیعہ قیامت کے دن رستگار اور کامیاب ہوں گے۔"

اس کے بعد ہماری طرف رُخ کیا اور فرمایا:

"اما واللہ انہ اولکم ایمانا باللہ، واقومکم بامراللہ، واوفاکم بعھداللہ، واقضاکم بحکم اللہ، واقسمکم بالسویۃ، و اعدلکم فی الرعیۃ، واعظمکم عنداللہ مزیۃ"

قال "جابر": فانزل اللہ: "ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات اولئك ھم خیرالبریۃ" فکان علی اذا اقبل قال اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قد اتاکم خیرالبریۃ بعد رسول اللہ:

"خدا کی قسم یہ تم سب میں سے پہلے خدا پر ایمان لایا ہے اور اس نے خدا کے حکم سے تم سب میں سے پہلے قیام کیا ہے، خدا کے عہد کو تم سب سے زیادہ وفا کرنے والا ہے، اور وہ تم سب سے زیادہ اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے کرنے والا ہے اور وہ (بیت المال) کی تقسیم میں سب سے زیادہ مساوات کرنے والا ہے، اور رعیت میں سب سے زیادہ عدل کرنے والا ہے، اور اس کا مقام و مرتبہ خدا کے نزدیک تم سب سے زیادہ ہے۔"

جابر کہتے ہیں کہ اس موقع پر خدا نے آیہ ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات اولئك ھم خیرالبریۃ نازل فرمائی۔ اس کے بعد جب بھی کبھی علی علیہ السلام آتے تو اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

---

[1] دیکھئے مدرک ص ۳۵۹ حدیث ۱۱۳۰

انہیں آتا ہوا دیکھ کر کہتے :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خدا کی مخلوق میں جو سب سے زیادہ بہتر ہے وہ آرہا ہے ۔ [1]

اس آیت کا خانہ کعبہ کے پاس نزول اس سورہ کے مدنی ہونے کے ساتھ منافات نہیں رکھتا، کیونکہ ممکن ہے کہ یہ نزول مجدد کے قبیل سے ہو، یا تطبیق کے عنوان سے ہو، علاوہ ازیں بعید نہیں ہے کہ ان آیات کا نزول ان سفروں میں ہوا ہو جن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ سے مکہ کی طرف آئے تھے۔ خصوصاً جب کہ اس روایت کا راوی " جابر بن عبداللہ انصاری " ہے جو مدینہ میں آپ کے ساتھ ملحق ہوئے تھے، اور اس قسم کی آیات پر مدنی ہونے کا اطلاق بعید نہیں ہے ۔

ان احادیث میں سے بعض کو " ابن حجر " نے کتاب " صواعقہ محرقہ " میں نقل کیا ہے۔ اور بعض کو شبلنجی نے " نورالابصار " میں ذکر کیا ہے ۔ [2]

" جلال الدین سیوطی " نے " درالمنثور " میں بھی آخری روایت کا عمدہ حصہ " ابن ساکر " سے جابر بن عبداللہ " سے نقل کیا ہے [3]

۴۔ " درالمنثور " میں آیا ہے کہ جس وقت آیۂ " ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات اولئک ھم خیرالبریۃ " نازل ہوئی ، تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے فرمایا :

" ھو انت وشیعتک یوم القیامۃ راضین مرضیین "

" وہ تو اور تیرے شیعہ ہیں ، قیامت کے دن تم خدا سے راضی ہوگے اور خدا تم سے راضی ہوگا " [4]

۵۔ مذکورہ مؤلف نے ایک دوسری حدیث میں " ابن مردویہ " کے واسطے سے علی علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا :

" الم تسمع قول اللہ : ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات اولئک ھم خیرالبریۃ ؛ انت وشیعتک وموعدی وموعدکم الحوض ، اذا جئت الامم للحساب تدعون غرا محجلین : [5]

" کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ فرماتا ہے : جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیے وہ بہترین مخلوق ہیں ؛ یہ تم اور تمہارے شیعہ ہیں ۔ اور میری اور تمہاری وعدہ گاہ حوضِ کوثر کا کنارہ ہے ۔ جب میں اُمتوں کے حساب کے لیے آؤں گا تو تمہیں

---

[1] وہی مدرک ص ۳۶۲ حدیث ۱۱۳۹

[2] " صواعق المحرقہ " ص ۹۶ " نورالابصار " ص ۷۰ ، ۱۰۱

[3] " درالمنثور " جلد ۶ ص ۳۷۹

[4] و [5] " درالمنثور " جلد ۶ ص ۳۷۹

"غرالمحجلین" (سفید پیشانیوں والے) کہہ کر پکارا جائے گا۔

اہلِ سُنّت کے اور بھی بہت سے دوسرے علمائے اسی مضمون کو اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، منجملہ "خطیب خوارزمی نے "مناقب" میں ابونعیم اصفہانی "نے "کفایت الخصام" میں "علامہ طبری" نے "اپنی مشہور تفسیر" میں "ابن صباغ مالکی نے "فصول المهمه" میں "علامہ شوکانی" نے "فتح القدیر" میں "شیخ سلیمان قندوزی" نے "ینابیع المودة" اور "آلوسی" نے "رُوح المعانی" میں زیرِ بحث آیات کے ذیل میں، اور بہت سے دوسرے علمائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اُوپر والی حدیث بہت ہی مشہور و معروف احادیث میں سے ہے جسے اکثر دانش مندوں اور علماء اسلام نے قبول کیا ہے۔ اور یہ علی علیہ السّلام اور ان کے شیعوں کی ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔

ضمنی طور پر اِن روایات سے یہ حقیقت اچھی طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ لفظ "شیعہ" رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے ہی آنحضرتؐ کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان نشر ہوا، اور یہ امیرالمومنین علی علیہ السّلام کے خاص پیروکاروں کی طرف اشارہ ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ "شیعہ" کی تعبیر صدیوں بعد وجود میں آئی ہے، بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

۲۔ عبادت میں خلوص نیّت لازم ہے

اصولِ فقہ کے بعض علمائے آیہ "وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین له الدین" سے عبادات میں قصدِ قربت کے لازم ہونے پر استدلال کیا ہے اور یہ کہ اوامر میں اصل ان کا تعبدی ہونا ہے نہ کہ توصلی ہونا۔ اور یہ اس سے وابستہ ہے کہ یہاں "دین" کا معنی عبادت ہو، تاکہ یہ عبادات میں خلوص کے لازم ہونے کی دلیل بنے، اور "امر" کو ہم اس آیت میں مطلق قرار دیں، تاکہ اس کا مفہوم تمام اوامر میں قصدِ قربت کا لازم ہونا ہے۔ (سوائے ان موارد کے جو دلیل کی وجہ سے خارج ہوں) حالانکہ آیت کا مفہوم، ظاہر کے اعتبار سے، ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود شرک کے مقابلہ میں توحید کا اثبات ہے۔ یعنی انہیں توحید کے سوا اور کسی چیز کی دعوت نہیں دی گئی ہے اور اس حال میں اس کا احکامِ فرعی کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔

۳۔ انسان کی عجیب قوسِ صعودی و نزولی

اِس سورہ کی آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ عالم میں کسی بھی مخلوق کے قوسِ صعودی و نزولی کا فاصلہ انسان کے قوسِ صعودی و نزولی کے برابر نہیں ہے۔ اگر انسان ایمان لے آئے اور اعمالِ صالح بجا لائے (اس بات پر توجہ رہے کہ "عملوا الصالحات" تمام اعمالِ صالح کو شامل ہے، نہ کہ بعض کو) تو وہ خدا کی مخلوق میں سب سے زیادہ افضل اور برتر ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ کفر و ضلالت اور ہٹ دھرمی اور عناد کا راستہ اختیار کرلے، تو اتنا گر جاتا ہے کہ خدا کی مخلوق میں سب سے زیادہ بدتر بن جاتا ہے!

اِنسان کے "قوسِ صعودی" و "نزولی" کا یہ عظیم فاصلہ اگرچہ ایک حساس اور خطرناک مسئلہ ہے لیکن یہ نوعِ بشر کے مقام کی عظمت اور اس کے تکامل و ارتقاء کی قابلیت پر دلالت کرتا ہے، اور یہ ایک طبیعی و فطری چیز ہے کہ اس قسم کی حد سے زیادہ قابلیت و استعداد کے ہوتے ہوئے، تنزل و سقوط کا امکان بھی حد سے زیادہ ہو۔

خداوندا ! ہم "خیر البریہ" کے بلند مقام تک پہنچنے کے لیے تیرے لطف و کرم سے مدد طلب کرتے ہیں۔

پروردگارا ! ہمیں اس عظیم اور بزرگ ہستی کے شیعوں اور پیروکاروں میں سے قرار دے جو اس کے لیے سب سے زیادہ لائق اور شائستہ ہے۔

بارالٰہا ! ہمیں اس قسم کا خلوص مرحمت فرما کہ ہم تیرے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور تیرے غیر سے محبت نہ رکھیں۔

آمین یا رب العالمین

اختتام سورہ "بینہ"

اختتام ترجمہ

بروز اتوار ۲۱ رمضان ۱۴۰۸ھ پونے گیارہ بجے

بر مکان حقیر قم المقدسہ

سُورَہ اَلزِّلزَال

❖ یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوا

❖ اس میں ۸ آیات ہیں ۔

سورہ "زلزلہ" کے مطالب اور فضیلت

اس بارے میں کہ یہ سُورہ مکہ میں نازل ہوا ہے یا مدینہ میں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بہت سے اسے مدنی سمجھتے ہیں جب کہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہوا ہے۔ اس کی آیات کا لب ولہجہ جو "معاد" اور "قیامت کی شرائط" کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، مکی سورتوں سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، لیکن ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس وقت یہ سُورہ نازل ہوا تو "ابوسعید خدری" نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیہ فمن یعمل مثقال ذرة ۔ ۔ ۔ ۔ کے بارے میں سوال کیا، اور ہم جانتے ہیں کہ "ابوسعید" مدینہ میں مسلمانوں سے ملحق ہوئے تھے۔[1]

لیکن اس سُورہ کا مدنی یا مکی ہونا اس کے مفاہیم اور تفسیر پر اثرانداز نہیں ہوتا۔

بہرحال یہ سورہ خصوصیت کے ساتھ تین محوروں کے گرد گردش کرتا ہے۔

پہلے "اشراط الساعة" اور قیامت کے وقوع کی نشانیوں سے بحث کرتا ہے۔

اور اس کے بعد انسان کے تمام اعمال کے بارے میں زمین کی گواہی کی گفتگو ہے۔

اور تیسرے حصہ میں لوگوں کی دو گروہوں "نیکوکار" و "بدکار" میں تقسیم، اور ہر شخص کے اپنے اعمال کا نتیجہ پانے کی بات ہے۔

اس سورہ کی فضیلت میں اسلامی روایات میں اہم تعبیریں آئی ہیں۔ منجملہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من قرأها فكانما قرأ البقرة واعطى من الاجر كمن قرأ ربع القرآن:

"جو شخص اس کی تلاوت کرے گویا اُس نے سُورہ بقرہ کی قرأت، اور اس کا اجر و ثواب اس شخص کے برابر ہے جس نے قرآن کے چوتھے حصہ کی

---

[1] "روح المعانی" جلد ۲۰ ص ۲۰۸

قرأت کی ہو۔[1]

اور ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

سورۂ "اذا زلزلت الارض" کی تلاوت کرنے سے ہرگز خستہ نہ ہونا، کیونکہ جو شخص اس کو نافلہ نمازوں میں پڑھے گا وہ ہرگز بھی زلزلہ میں گرفتار نہ ہوگا اور نہ ہی اس کی وجہ سے مرے گا۔ اور مرتے دم تک صاعقہ اور آفاتِ دنیا میں سے کسی آفت میں گرفتار نہ ہوگا۔[2]

❖ ❖ ❖

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۲۴

[2] "اصول کافی" (مطابق نقل نورالثقلین جلد ۵ ص ۴۴۷)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝
۲۔ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝
۳۔ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ۝
۴۔ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝
۵۔ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝
۶۔ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝
۷۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝
۸۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ جس وقت زمین شدت کے ساتھ لرزنے لگے گی۔
۲۔ اور زمین اپنے سنگین بوجھ کو باہر نکال کر رکھ دے گی۔
۳۔ اور انسان کہے گا کہ زمین کو کیا ہوگیا ہے۔ (کہ اس طرح لرز رہی ہے)
۴۔ اس دن زمین اپنی تمام خبروں کو بیان کردے گی۔

۵۔ کیونکہ تیرے پروردگار نے اُسے وحی کی ہے۔

۶۔ اس دن لوگ مختلف گروہوں کی صُورت میں قبروں سے نکلیں گے، تاکہ ان کے اعمال انہیں دکھائے جائیں۔

۷۔ پس جس شخص نے ایک ذرّہ کے وزن کے برابر بھی اچھا کام انجام دیا ہوگا وہ اُسے دیکھے گا۔

۸۔ اور جس نے ایک ذرّہ کے وزن کے برابر بُرا کام کیا ہوگا وہ اُسے دیکھے گا۔

تفسیر

جس دن اِنسان اپنے تمام اعمال دیکھے گا

جس طرح سورہ کے مطالب کے بیان میں اشارہ ہوا ہے یہ سورہ اس جہان کے اختتام اور قیامت کے شروع کے بعض ہولناک اور وحشت ناک حوادث کے بیان کے ساتھ شروع ہوا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: "جس وقت زمین شدّت کے ساتھ ہلنے لگے گی": (اذا زلزلت الارض زلزالھا)[1]

اور اس طرح زیر و زبر ہوگی کہ "وہ سارے سنگین بوجھ، جو اس کے اندر ہیں، باہر نکال کر رکھ دے گی": (واخرجت الارض اثقالھا)۔

"زلزالھا" (اس کا زلزلہ) کی تعبیر یا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دن سارا کرۂ زمین لرزنے لگے گا۔ (عام زلزلوں کے برخلاف جو سب کے سب کسی خاص موضع یا علاقہ میں ہوتے ہیں)۔ اور زلزالہ معہود یعنی زلزلۂ قیامت کی طرف اشارہ ہے[2]۔

اس بارے میں کہ "اثقال" (سنگین بوجھ) سے کیا مراد ہے، مفسّرین نے متعدد تفاسیر بیان کی ہیں، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مُراد وہ انسان ہیں جو قیامت کے زلزلہ سے قبروں کے اندر سے باہر اُچھل پڑیں گے، جیسا کہ سُورہ انشقاق کی آیہ ۴ میں آیا ہے[3]

---

[1] "اذا" یہاں شرطیہ ہے، اور اس بارے میں کہ جزائے شرط کیا ہے کئی احتمال دیے گئے ہیں، بعض اس کی جزا "یومئذ تحدث اخبارھا" کو سمجھتے ہیں، بعض "یومئذ یصدر الناس اشتاتا" کو، اور بعض نے جزا کو محذوف جانا ہے۔ اس طرح کہ لوگ یہ سوال کرتے تھے کہ متی الساعۃ (قیامت کب واقع ہوگی) تو جواب میں فرمایا: جب وہ عظیم زلزلہ آئے گا، یعنی اس وقت قیامت واقع ہوگی۔

[2] پہلی صُورت میں اضافت عمومی معنی رکھتی ہے اور دوسری صورت میں عہد کے معنی دیتی ہے۔

[3] "زلزال" "زا" کی زیر کے ساتھ مصدری معنی دیتا ہے اور زلزال (زا کی زبر کے ساتھ) اسم مصدر کے معنی دیتا ہے اور یہ وضع عام طور پر ان افعال میں آتی ہے جو مضاعف کی صورت میں استعمال ہوتے ہیں، مثلاً "صلصال" اور "وسواس"۔

"والقت ما فیها وتخلّت"

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ اپنے اندرونی خزانوں کو باہر پھینک دے گی۔ اور بے خبر دُنیا پرستوں کے لیے حسرت کا سبب بنے گی۔[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد زمین کے اندر بھرے والے بھاری مواد کو باہر پھینکنا ہے جن کی کچھ مقدار عام طور پر آتش فشانی اور زلزلوں کے وقت باہر نکلتی ہے۔

عالم کے اختتام پر جو کچھ زمین کے اندر ہے وہ اس زلزلۂ عظیم کے بعد باہر آجائے گا۔

پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اگرچہ ان تفاسیر کے درمیان جمع بھی بعید نہیں ہے۔

بہرحال اس دن انسان اس اَن دیکھے منظر کو دیکھ کر سخت متوحش ہوگا، اور کہے گا: "یہ کیا ہوگیا ہے کہ زمین اس طرح لرز رہی ہے اور جو کچھ اس کے اندر تھا اُسے باہر پھینک دیا ہے۔" (وقال الانسان مالها)۔

اگرچہ بعض نے یہاں انسان کی کافر انسانوں کے ساتھ تفسیر کی ہے، جو مسئلہ معاد و قیامت میں شک کرتے تھے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ انسان یہاں ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو سب کو شامل ہے، کیونکہ زمین کے اوضاع و احوال سے تعجب اُس دن کفار کے ساتھ مخصوص نہیں ہوگا۔

کیا یہ تعجب، اور اس سے پیدا ہونے والا سوال "نفخۂ اولیٰ" سے مربوط ہے یا "نفخۂ دوم" سے، ؟

ظاہر یہ ہے کہ یہ وہی پہلا نفخہ ہے جو اس عالم کے اختتام کا نفخہ ہے۔ کیونکہ یہ زلزلۂ عظیم اختتامِ جہان پر آئے گا۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد نفخۂ قیامت اور مردوں کے زندہ ہونے اور ان کے زمین سے باہر پھینک دینے کا نفخہ ہے کیونکہ بعد والی آیات بھی سب کی سب نفخۂ دوم کے ساتھ مربوط ہیں۔

لیکن چونکہ قرآن کی آیات میں ان دونوں نفخوں کے حوادث بارہا اکٹھے ذکر ہوئے ہیں، لہٰذا اختتامِ جہان پر وحشت ناک زلزلہ کے بیان کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اور اس صورت میں زمین کے "اثقال" سے مراد معدنیات، خزانے اور اس کے اندر موجود پگھلے ہوئے مواد ہیں۔

اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ "زمین اس دن اپنی ساری خبریں بیان کرے گی" (یومئذ تحدث اخبارها)۔

جو خوبیاں اور بُرائیاں، اور خیر و شر کے اعمال رُوئے زمین پر واقع ہوئے ہیں، وہ ان سب کو ظاہر کر دے گی۔ اور اس دن انسان کے اعمال کے گواہوں میں سے اہم ترین گواہ یہی زمین ہوگی جس پر ہم اپنے اعمال انجام دیتے ہیں۔ اور جو ہماری شاہد و ناظر ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"اتدرون ما اخبارها"؟:

"کیا تم جانتے ہو کہ زمین کے اخبار سے یہاں کیا مُراد ہے"؟

---

[1] "اثقال" جمع ہے "ثقل" (بروزن فکر) کی جو "بار" کے معنی میں ہے، اور بعض نے اُسے "ثقل" (بروزن عمل) کی جمع سمجھا ہے جو وسائل خانہ یا وسائل مسافر کے معنی میں ہے، لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

"قالوا : اللہ و رسولہ اعلم" :

" انہوں نے کہا : خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں"۔

آپ نے فرمایا :

"اخبارھا ان تشھد علی کل عبد و امۃ بما عملوا علی ظھرھا، تقول عمل کذا و کذا، یوم کذا، فھذا اخبارھا" :

" زمین کے خبر دینے سے مُراد یہ ہے کہ زمین ہر مرد اور ہر عورت کے اعمال کی، جو انہوں نے رُوئے زمین پر انجام دیے ہیں، خبر دے گی، وہ کہے گی کہ فلاں شخص نے فلاں دن فلاں کام کیا ہے، یہ ہے زمین کا خبر دینا"۔[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے :

"حافظوا علی الوضوء و خیر اعمالکم الصلوۃ فتحفظوا من الارض فانھا امکم، ولیس فیھا احد یعمل خیرا او شرا الا و ھی مخبرۃ بہ"۔

" وضوء اور اپنے اعمال میں سے بہترین عمل، نماز کی حفاظت کرو، اور زمین کی طرف دیکھتے رہو، کیونکہ وہ تمہاری ماں ہے۔ کوئی بھی انسان کوئی اچھا یا بُرا کام انجام نہیں دیتا مگر یہ کہ زمین اس کی خبر دیتی ہے"۔[2]

ابو سعید خدری سے نقل ہوا ہے کہ وہ یہ کہا کرتے تھے : جب کبھی تم بیابان میں ہو، تو بلند آواز کے ساتھ اذان دو، کیونکہ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے :

"لا یسمعہ جنّ ولا انس ولا حجر الّا یشھد لہ"

" کوئی جنّ و انس، اور پتھر کا کوئی ٹکڑا اُسے نہیں سُنتا، مگر یہ کہ (قیامت میں) اس کے لیے گواہی دے گا"۔[3]

کیا واقعاً خدا کے حکم سے زمین کی زبان کُھل جائے گی اور وہ بات کرے گی؟ یا اس سے مراد رُوئے زمین پر انسان کے اعمال کے آثار کا ظاہر ہونا ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان جو عمل بھی انجام دیتا ہے، وہ خواہ مخواہ اس کے اطراف میں کچھ آثار چھوڑتا ہے۔ چاہے وہ آج ہمارے لیے محسوس نہ ہوں۔ ٹھیک ایک دوست یا دشمن کی انگلیوں کے انہیں آثار کے مانند، جو دروازے کے قبضہ پر رہ

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۶۴۹

[2] "مجمع البیان" جلد ۱ ص ۵۲۶

[3] وہی مدرک

جاتے ہیں، اور اس دن یہ سب کے سب آثار ظاہر ہو جائیں گے، اور زمین کا بات کرنا اس عظیم ظہور کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم کسی خواب آلود شخص سے کہتے ہیں، کہ تیری آنکھیں بتلا رہی ہیں کہ تو کل رات سویا نہیں ہے۔ یعنی بے خوابی کے آثار اس میں نمایاں ہیں۔

بہر حال یہ کوئی غیر مانوس بات نہیں ہے کیونکہ موجودہ زمانے میں انسان کے علم و دانش کی پیش رفت کی وجہ سے ایسے آلات و وسائل اختراع ہو چکے ہیں جو ہر جگہ اور ہر لمحہ انسان کی آواز کو گرفت میں لے سکتے ہیں، یا انسان اور اس کے اعمال و افعال کی تصویریں کھینچ سکتے ہیں، اور ایک مسلّم سند کے عنوان سے اُسے عدالت میں پیش کر سکتے ہیں، اس طرح کہ انکار کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔

اگر لوگ گزشتہ زمانہ میں زمین کی گواہی سے تعجب کرتے تھے، تو موجودہ زمانہ میں ایک پتلی سی ریل (فیتہ) یا (ریکارڈ) ضبط کرنے کی مشین جو ایک بٹن کی صورت میں لباس سے ٹکی ہوئی ہوتی ہے، بہت سے مسائل کو بیان کر سکتی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں علی علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"صلوا المساجد فی بقاع مختلفة، فان کل بقعة تشهد للمصلی علیها یوم القیامة"

"مساجد کے مختلف حصّوں میں نماز پڑھا کرو، کیونکہ زمین کا ہر ٹکڑا، اس شخص کے لیے جو اس پر نماز پڑھتا ہے، گواہی دے گا۔"[1]

ایک اور دوسری حدیث میں آیا ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام جب بیت المال تقسیم فرماتے تھے، اور وہ خالی ہو جاتا تھا تو وہاں دو رکعت نماز بجالاتے اور فرماتے:

"اشهدی انی ملأتك بحق و فرغتك بحق"

(قیامت کے دن) "گواہی دینا کہ میں نے تجھے حق کے ساتھ پُر کیا تھا اور حق کے ساتھ ہی خالی کیا ہے۔"[2]

بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے: یہ اس خبر (نبأ) پر ہے کہ تیرے پروردگار نے زمین کو وحی کی ہے"۔ (بان ربك اوحی لها)[3]۔ اور زمین اس فرمان کے اجراء میں کوتاہی نہیں کرے گی، "اوحی" کی تعبیر یہاں اس بنا پر ہے کہ اس قسم کی اسرار آمیز گفتگو کرنا زمین کی طبیعت کے خلاف ہے۔ اور یہ چیز ایک وحی الٰہی کے طریقے کے سوا ممکن نہیں ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ زمین کو وحی کرے گا کہ جو کچھ اس کے اندر ہے وہ باہر پھینک دے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح اور مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے، "اس دن لوگ مختلف گروہوں کی صورت میں قبروں سے نکل کر عرصۂ محشر میں وارد ہوں گے، تا کہ ان کے اعمال

---

[1] "نثالی الاخبار" جلد ۵ ص ۹۷ چاپ جدید

[2] "نثالی الاخبار" جلد ۵ ص ۹۷ چاپ جدید

[3] "بان" میں "باء" سببیت کے لیے ہے اور لها میں "لام" "الی" کے معنی میں ہے جیسا کہ سورہ "نحل" کی آیہ ۶۸ میں آیا ہے "واوحی ربك الی النحل"

انہیں دکھائے جائیں۔ (یومئذ یصدر الناس اشتاتا لیروا اعمالھم)۔

"اشتات" "شت" (بروزن شط) کی جمع ہے، جو پراگندہ اور متفرق کے معنی میں ہے، یہ اختلاف و پراگندگی ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ ہر مذہب والے الگ الگ عرصۂ محشر میں وارد ہوں گے، یا زمین کے علاقوں میں سے ہر علاقے کے لوگ جُدا جُدا وارد ہوں گے، یا یہ ہے کہ ایک گروہ تو ہشاش بشاش، شاد و خنداں، حسین و خوبصورت چہروں کے ساتھ آئے گا اور ایک گروہ تیوری چڑھائے تیرہ و تاریک چہروں کے ساتھ محشر میں وارد ہوگا۔

یا ہر اُمت اپنے امام، رہبر اور پیشوا کے ساتھ ہوگی جیسا کہ سُورہ اسراء کی آیہ ۷۱ میں آیا ہے: یوم ندعوا کل اناس بامامھم": "اس دن ہم ہر گروہ کو اس کے امام و پیشوا کے ساتھ بلائیں گے۔

یا یہ ہے کہ مؤمنین، مؤمنین کے ساتھ، اور کفار، کفار کے ساتھ محشور ہوں گے۔

ان تمام تفاسیر کے درمیان جمع بھی پورے طور پر ممکن ہے کیونکہ آیت کا مفہوم وسیع ہے۔

"یصدر" "صدر" (بروزن صبر) کے مادہ سے اُونٹوں کے پانی والی جگہ سے نکلنے کے معنی میں ہے، جو انبوہ کی صورت میں ہیجان میں آئے ہوئے باہر آتے ہیں۔ "ورود" کے برعکس جو پانی کی جگہ میں داخل ہونے کے معنی میں ہے۔ اور یہاں مختلف قوموں کے قبروں سے نکلنے اور حساب دینے کے لیے محشر میں آنے سے کنایہ ہے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد محشر سے نکل کر جنت یا جہنم میں اپنی جگہ کی طرف چلنا ہے۔

پہلا معنی گزشتہ آیات کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

"لیروا اعمالھم" (تاکہ ان کے اعمال انہیں دکھائے جائیں) کے جملہ سے مراد اعمال کی جزا کا مشاہدہ ہے۔

یا نامۂ اعمال کا مشاہدہ مراد ہے جس میں ہر نیک و بد عمل ثبت ہے۔

یا مشاہدہ باطنی مراد ہے جس کا معنی ان کے اعمال کی کیفیت کی معرفت و شناخت ہے۔

یا "تجسم اعمال" کی صُورت میں خُود اعمال کا مشاہدہ مُراد ہے۔

آخری تفسیر ظاہر آیہ کے ساتھ سب سے زیادہ موافق ہے، اور یہ آیت مسئلہ تجسم اعمال پر روشن ترین آیات میں سے شمار ہوتی ہے کہ اس دن انسان کے اعمال مناسب صُورتوں میں مجسم ہو کر اس کے سامنے حاضر ہوں گے، اور ان کی ہم نشینی خوشی کا موجب یا رنج و بلا کا باعث ہوگی۔

اس کے بعد ان دونوں گروہوں مومن و کافر، نیکو کار و بدکار کے انجام کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "پس جس شخص نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اُسے دیکھے گا": (فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ)۔

اور جس شخص نے ذرہ برابر بُرا کام کیا ہوگا وہ اُسے دیکھے گا": (ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ)۔

یہاں بھی مختلف تفسیریں ذکر ہوئی ہیں، کہ کیا اعمال کی جزا کو دیکھے گا، یا نامۂ اعمال کا مشاہدہ کرے گا، یا خود عمل کو۔

ان آیات کا ظاہر بھی، قیامت کے دن "تجسم اعمال" اور خُود عمل کے مشاہدہ کے مسئلہ پر نئے سرے سے ایک تاکید ہے، چاہے وہ عمل نیک ہو یا بُرا۔ یہاں تک کہ اگر ایک سوئی کے برابر بھی نیک یا بُرا کام ہوگا تو وہ بھی اپنے کرنے والے کے سامنے مجسم ہو جائے گا، اور

اور وہ اس کا مشاہدہ کرے گا۔

"مثقال" لغت میں بوجھ اور سنگینی کے معنی میں بھی آیا ہے، اور اس ترازو کے معنی میں بھی جس سے چیزوں کو تولا جاتا ہے اور یہاں یہ پہلے معنی میں ہی ہے۔

"ذرّة" کے لیے بھی لغت اور مفسرین کے کلمات میں مختلف تفسیریں ذکر ہوئی ہیں، کبھی تو چھوٹی چیونٹی کے معنی میں، اور کبھی اس گرد و غبار کے معنی میں جو زمین پر ہاتھ رکھ کر اٹھانے کے بعد اس سے چپک جاتا ہے اور کبھی غبار کے ان چھوٹے چھوٹے ذرات کے معنی میں تفسیر ہوئی ہے جو فضا میں معلق ہوتے ہیں اور جب سورج کی شعاعیں کسی سوراخ سے تاریک کمرے میں پڑتی ہیں تو وہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں "ذرہ" کا "ایٹم" پر بھی اطلاق کرتے ہیں۔ اور ایٹم بم کو "القنبلة الذرية" کہتے ہیں۔ "ایٹم" اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ نہ تو وہ عام آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی دقیق ترین خوردبینوں کے ذریعے قابل مشاہدہ ہے، اور صرف اس کے آثار کا ہی مشاہدہ کرتے ہیں، اور اس کا حجم اور وزن علمی حساب کتاب کے ذریعے ہی ناپا تولا جاتا ہے، اور وہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ سوئی کی ایک نوک پر لاکھوں کی تعداد میں سما جاتے ہیں۔

ذرّہ کا مفہوم چاہے جو بھی ہو یہاں مراد سب سے چھوٹا وزن ہے۔

بہرحال یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو آدمی کی پشت میں لرزہ پیدا کر دیتی ہیں۔ اور اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ اس دن حساب کتاب حد سے زیادہ دقیق اور حساس ہوگا۔ اور قیامت میں ناپ تول کا ترازو اس قدر ظریف ہوگا، کہ وہ انسان کے چھوٹے سے چھوٹے اعمال کا وزن اور اس کا حساب کر لے گا۔

چند نکات

۱: قیامت کے حساب و کتاب میں دِقّت اور سخت گیری

نہ صرف اس سورہ کی آخری آیات سے، بلکہ قرآن کی مختلف آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں اعمال کی حساب رسی میں حد سے زیادہ دقت اور موشگافیاں ہوں گی۔ سورۂ لقمان کی آیہ ۱۶ میں آیا ہے: یا بنیّ انها ان تك مثقال حبة من خردل فتكن فی صخرة او فی السماوات او فی الارض یأت بها الله ان الله لطیف خبیر: "اے بیٹے! اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی (نیک یا بد عمل ہوگا) اور وہ پتھر کے اندر یا آسمان یا زمین کے کسی گوشہ میں چھپا ہوا ہوگا، تو خدا (قیامت میں) حساب رسی کے لیے اُسے لے آئے گا، بے شک خدا لطیف و خبیر ہے۔

"خردل" رائی کا دانہ، جو بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے، اور وہ چھوٹے ہونے میں ضرب المثل ہے۔

یہ تعبیریں اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ اس حساب رسی میں چھوٹے سے چھوٹے کاموں کا بھی محاسبہ ہوگا۔ ضمنی طور پر یہ آیات اس بات کی تنبیہ کرتی ہیں کہ نہ تو چھوٹے گناہوں کو کم اہمیت شمار کریں، اور نہ ہی چھوٹے نیک کاموں کو۔ وہ چیز جس کا

خدا حساب لے گا، چاہے وہ کچھ بھی ہو کم اہمیت نہیں ہے۔

اسی لیے بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض صحابہ تھوڑے مال کے خرچ کرنے کے سلسلہ میں بے اعتنا تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اجر و ثواب تو ان چیزوں پر دیا جاتا ہے جنہیں ہم دوست رکھتے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی چیزیں ایسی نہیں ہوتیں جن سے ہمیں کچھ لگاؤ اور محبت ہو، اور اسی طرح سے وہ چھوٹے چھوٹے گناہوں کے سلسلہ میں بھی بے اعتنا تھے، لہٰذا یہ آیات نازل ہوئیں، اور انہیں چھوٹی اور کم خیرات کرنے کی بھی ترغیب دی، اور چھوٹے چھوٹے گناہ کرنے سے ڈرایا۔

۲۔ ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان آیات کے مطابق انسان قیامت میں اپنے سب اعمال، چاہے وہ اچھے ہوں یا بُرے، چھوٹے ہوں یا بڑے، دیکھے گا۔ یہ معنی آیات "احباط" و "تکفیر" اور آیات "عفو" و "توبہ" کے ساتھ کیسے سازگار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ آیات "احباط" تو یہ کہتی ہیں کہ بعض عمل مثلاً "کفر" انسان کی تمام نیکیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ لئن اشرکت لیحبطن عملك (زمر۔ ۶۵) اور آیات "تکفیر" کے مطابق بعض اوقات نیکیاں بُرائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ ان الحسنات یذھبن السیئات (ھود ۱۱۴) اور عفو و توبہ کی آیات یہ کہتی ہیں کہ عفو الٰہی کے سائے میں، یا توبہ کرنے سے، گناہ محو ہو جاتے ہیں، یہ سارے مفہوم تمام نیک و بد اعمال کا مشاہدہ کرنے کے مسئلہ کے ساتھ کیسے مطابقت کرتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ: وہ دو اصول جو اُوپر والی آیات میں بیان ہوئے ہیں اور جو یہ کہتے ہیں کہ انسان اچھے اور بُرے کام کا ایک ایک ذرہ تک دیکھے گا، ایک قانون کلی کی صورت میں ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ ہر قانون میں کچھ مستثنیات ہو سکتے ہیں، لہٰذا آیات عفو و توبہ، اور احباط و تکفیر حقیقت میں اس قانونِ کلی میں استثنا کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ "احباط" و "تکفیر" کے سلسلہ میں درحقیقت موازنہ اور ایک عجز و انکسار رونما ہوتا ہے، اور یہ ٹھیک مطالبات اور قرضوں کے مانند ہے، جن میں ایک دوسرے سے منہا ہو جاتے ہیں، جس وقت انسان اس موازنہ کا نتیجہ دیکھتا ہے تو حقیقت میں اُس نے اپنے تمام اچھے اور بُرے اعمال کو دیکھ لیا ہے۔ یہی بات "عفو" و "توبہ" میں بھی جاری ہے۔ کیونکہ عفو لیاقت و شائستگی کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوتا، اور توبہ خود ایک نیک عمل ہے۔

بعض نے یہاں ایک اور جواب دیا ہے، جو صحیح نظر نہیں آتا، اور وہ یہ ہے کہ کافر اپنے اچھے اعمال کا نتیجہ اسی دنیا میں دیکھ لیں گے، جیسا کہ مومن اپنے بُرے اعمال کی سزا اسی جہان میں پا لیتے ہیں۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ زیرِ بحث آیات قیامت کے ساتھ مربوط ہیں نہ کہ دُنیا کے ساتھ، علاوہ ازیں یہ کوئی کلیہ نہیں ہے کہ ہر مومن و کافر اپنے اعمال کا نتیجہ دنیا میں دیکھے۔

۳۔ قرآن کی سب سے زیادہ جامع آیات

"عبداللہ بن مسعودؓ" سے نقل ہوا ہے کہ قرآن مجید کی سب سے زیادہ محکم آیات "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرًا یرہ و من

یعمل مثقال ذرۃ شرًّا یرہ " ہی ہیں۔ اور وہ انہیں "جامعہ" سے تعبیر کیا کرتے تھے، اور سچی بات یہ ہے کہ ان کے مطالب پر گہرا ایمان، اس بات کے لیے کافی ہے کہ انسان کو راہِ حق پر چلائے اور ہر قسم کے فساد و شر سے روکے۔

اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی: علمنی مما علمك الله جو کچھ خدا نے آپ کو تعلیم دی ہے اس میں سے مجھے بھی تعلیم دیجئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے اپنے اصحاب میں سے ایک کے سپرد کر دیا تا کہ وہ اُسے قرآن کی تعلیم دے۔ اور اس نے اُسے سورہ " اذا زلزلت الارض " کی آخر تک تعلیم دی۔ وہ شخص اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا: میرے لیے تو یہی کافی ہے۔

(اور ایک اور دوسری روایات میں آیا ہے کہ اس نے یہ کہا: " تکفینی هذه الأیة : " یہی ایک آیت میرے لیے کافی ہے؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اسے اس کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ ایک مرد فقیہ ہو گیا ہے۔ (اور ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: رجع فقیها : وہ فقیہ ہو کر لوٹا ہے) اس کی وجہ بھی واضح ہے، کیونکہ جو شخص یہ جانتا ہو کہ ہمارے اعمال، چاہے ایک ذرہ کے برابر ہوں، یا رائی کے ایک دانہ کے برابر، ان کا حساب لیا جائے گا، تو وہ آج ہی سے اپنے حساب و کتاب میں مشغول ہو جائے گا اور اس کا اس کی تربیت پر سب سے زیادہ اثر ہو گا۔[1]

اس کے باوجود ابو سعید خدری سے آیا ہے کہ جس وقت آیۂ فمن یعمل .... نازل ہوئی تو میں نے عرض کیا: اے رسولِ خدا کیا میں اپنے تمام اعمال کو دیکھوں گا؟ آپ نے فرمایا، ہاں! میں نے کہا، اُن بڑے بڑے کاموں کو؟ فرمایا: ہاں! میں نے کہا، چھوٹے چھوٹے کام بھی؟ فرمایا: ہاں! میں نے کہا وائے ہے مجھ پر میری ماں میری عزا میں بیٹھے۔ فرمایا: اے ابو سعید! تجھے بشارت ہو، کیونکہ نیکیاں دس گنا شمار ہوں گی جو سات سو تک ہو سکتی ہیں اور خدا جس شخص کے لیے چاہے گا اس سے بھی کئی گنا کر دے گا۔ لیکن ہر گناہ کے لیے صرف ایک ہی گناہ کی سزا ملے گی، یا خدا معاف کر دے گا اور جان لے کہ کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے نجات نہیں پائے گا۔ مگر یہ کہ خدا کا کرم اس کے شاملِ حال ہو۔ میں نے عرض کیا: اے رسولِ خدا کیا آپ بھی؟ فرمایا: ہاں میں بھی مگر یہ کہ خدا مجھے اپنی رحمت کا مشمول قرار دے۔[2]

خداوندا! جب تیرا پیغمبر اس عظمت و بزرگی کے باوجود صرف تیری بخشش اور عفو پر دل بستہ ہے تو پھر ہماری حالت تو واضح ہے۔

پروردگارا! اگر ہمارے اعمال ہماری نجات کا معیار ہوں، تو وائے ہے ہماری حالت پر، اور اگر تیرا کرم ہمارا یار و مددگار ہو تو پھر خوشا بحالِ ما۔

بارِ الٰہا! جس دن ہمارے سارے چھوٹے بڑے گناہ ہمارے سامنے مجسم ہو جائیں گے، اس دن کے لیے ہم صرف تیرے ہی لطف و کرم پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

☆

اختتام ترجمہ

تیئیسویں شب ماہِ مبارک رمضان ۱۴۰۸ھ
بوقت ۱۲ بجکر ۲۱ منٹ شب
بر مکان حقیر قم مقدس جمہوری اسلامی ایران

آمین یا رب العالمین
سورہ "زلزلہ" کا اختتام

---

[1] "تفسیر روح البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۵۔ یہی مضمون "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۶۰ میں بھی آیا ہے۔

[2] "درالمنثور" جلد ۶ ص ۳۸۱

سُورۂ والعٰدِیٰت

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا۔

❖ اس میں ۱۱ آیات ہیں۔

سُورہ "والعادیات" کے مطالب اور اس کی فضیلت

اِس بارے میں کہ یہ سُورہ "مکّہ" میں نازل ہوا ہے یا "مدینہ" میں مفسرین کے درمیان شدید اختلاف ہے۔ بہت سوں نے تو اُسے مکّی شمار کیا ہے جب کہ ایک جماعت اسے مدنی سمجھتی ہے۔

آیات کے مقطع کا مختصر اور چھوٹا ہونا اور قسموں پر تکیہ، اور اسی طرح مسئلہ معاد کے بارے میں بیان ایسے قرائن ہیں جو اس کے "مکّی" ہونے کی تائید کرتے ہیں۔

لیکن دوسری طرف سے اس سُورہ کی قسموں کا مضمون، جو جہاد کے مسائل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، جیسا کہ انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوگا، اسی طرح وہ روایات جو یہ کہتی ہیں کہ یہ سُورہ جنگِ "ذات السلاسل" کے بعد نازل ہوا ہے۔

(یہ وہ جنگ ہے جو ہجرت کے آٹھویں سال واقع ہوئی تھی، اور اس میں کفار کے بہت سے گروہ قیدی بنائے گئے تھے، اور انہیں محکم رسیوں سے باندھا گیا تھا، لہٰذا اس کا نام "ذات السلاسل" ہوگیا، جس کی تفصیل انشاء اللہ آیات کی تفصیل میں آئے گی)۔

یہ اس سُورہ کے مدنی ہونے پر گواہ ہے، یہاں تک کہ اگر ہم اس سورہ کے آغاز کی قسموں کو حاجیوں کے منیٰ و مشعر کی طرف جانے پر ناظر سمجھیں، تب بھی یہ مدینہ ہی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ مراسمِ حج اپنی اکثر فروعات کے ساتھ زمانۂ جاہلیّت کے عربوں میں بھی ـــــ سُنّتِ ابراہیمی کی اقتداء کرنے کی وجہ سے ـــــ رواج رکھتے تھے لیکن وہ خرافات کے ساتھ ایسے آلودہ ہوچکے تھے کہ یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ قرآن نے ان کی قسم کھائی ہو۔

ان تمام جہات کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم اس کے "مدنی" ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے سُورہ کے مطالب بھی واضح ہوگئے ہیں کہ آغاز میں کچھ بیدار کرنے والی قسموں کا ذکر کرتا ہے

اور اس کے بعد نوع انسانی کی چند کمزوریوں مثلاً کفر، بُخل اور دُنیا پرستی کو درمیان میں لے آتا ہے، اور انجام کار مسئلہ معاد پر ایک مختصر اور گویا اشارے اور بندوں پر خدا کے علمی احاطہ پر سُورہ کو ختم کرتا ہے۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من قرأها اعطی من الاجر عشر حسنات، بعدد من بات بالمزدلفة، وشهد جمعًا"[1]:

"جو شخص اس کی تلاوت کرے گا تو ان تمام حاجیوں کی تعداد سے (جو عید قربان کی رات) "مزدلفہ" میں توقف کرتے ہیں، اور وہاں حاضر رہتے ہیں، دس گنا زیادہ نیکیاں اُسے دی جائیں گی۔[2]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

"من قرأ والعاديات وادمن قرائتها بعثه الله مع امير المؤمنين (سلام الله عليه) يوم القيامة خاصه، وكان في حجره ورفقائه:

"جو شخص سُورہ والعادیات کو پڑھے گا، اور اس کی مداومت کرے گا، تو خدا اُسے قیامت کے دن خصوصیت کے ساتھ امیر المؤمنین (سلام اللہ علیہ) کے ہمراہ مبعوث کرے گا، اور وہ آپ کی جماعت میں اور آپ کے دوستوں کے درمیان ہوگا:[3]

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سُورہ والعادیات نصف قرآن کے برابر ہے۔[4]

یہ بات کہے بغیر ظاہر و واضح ہے کہ یہ تمام فضیلتیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو اس کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنالیں گے، اور اس کے تمام مطالب و مضامین پر ایمان رکھیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] "جمع" و "مشعر الحرام" کے ناموں میں سے ایک نام ہے اس بنا پر کہ لوگ وہاں جمع ہوتے ہیں، یا وہاں نماز مغرب و عشاء فاصلہ کے بغیر پڑھی جاتی ہے۔

[2] "مجمع البیان"، جلد ۱۰ ص ۵۲۷

[3] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۲۷

[4] "درالمنثور" جلد ۶ ص ۳۸۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

١۔ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ

٢۔ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ

٣۔ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ

٤۔ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ

٥۔ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ

٦۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ

٧۔ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ

٨۔ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۭ

٩۔ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ

١٠۔ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ

١١۔ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّخَبِيْرٌ ۚ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ ان فراٹے بھرتے ہوئے سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم (جو میدانِ جہاد کی طرف پیش رفت کرتے ہیں) ۔

۲۔ اور ان کی قسم جو (اپنے سموں سے پتھروں پر ٹاپ مارتے ہوئے) چنگاریاں نکالتے ہیں ۔

۳۔ اور صبح ہوتے ہی دشمن پر یلغار کر دیتے ہیں۔

۴۔ اور اس سے ہر طرف گرد و غبار ہی گرد و غبار کر دیتے ہیں ۔

۵۔ اور یکایک دشمن کے دل بادل میں گھس جاتے ہیں ۔

۶۔ بے شک انسان اپنے پروردگار کی نعمتوں کے سامنے ناشکرا اور بخیل ہے۔

۷۔ اور وہ خود بھی اس معنی پر گواہ ہے ۔

۸۔ وُہ مال کے ساتھ شدید لگاؤ اور محبت رکھتا ہے ۔

۹۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ اُس دن جو بھی قبروں میں ہیں وُہ سب زندہ ہو جائیں گے۔

۱۰۔ اور جو کچھ سینوں کے اندر (چھپایا ہوا) ہے، وہ آشکار اور ظاہر ہو جائے گا۔

۱۱۔ اس دن ان کا پروردگار ان سے مکمل طور پر باخبر ہے ۔

شانِ نزول

ایک حدیث میں آیا ہے کہ یہ سورہ جنگ " ذات السلاسل "کے بعد نازل ہوا، اور اس کا واقعہ اس طرح ہے ۔
ہجرت کے آٹھویں سال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ملی کہ بارہ ہزار سوار سرزمین " یالیس" میں جمع ہیں، اور انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ یہ عہد کیا ہے کہ جب تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام کو قتل نہ کرلیں اور مسلمانوں کی جماعت

کو منتشر نہ کر دیں آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کی ایک بہت بڑی جماعت کو بعض صحابہ کی سرکردگی میں ان کی جانب روانہ کیا، لیکن وہ کافی گفتگو کے بعد بغیر کسی نتیجہ کے واپس لوٹ آئے۔

آخر کار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو مہاجرین و انصار کے ایک گروہ کثیر کے ساتھ ان سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ دشمن کے علاقہ کی طرف روانہ ہوئے اور رات بھر میں سارا سفر طے کر کے صبحدم دشمن کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔ پہلے تو ان کے سامنے اسلام کو پیش کیا۔ جب انہوں نے قبول نہ کیا تو ابھی فضا تاریک ہی تھی کہ ان پر حملہ کر دیا اور انہیں درہم برہم کر کے رکھ دیا، ان میں سے کچھ لوگوں کو قتل کیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کر لیا اور بکثرت مال غنیمت کے طور پر حاصل کیا۔

سورۂ "والعادیات" نازل ہوئی حالانکہ ابھی سربازانِ اسلام مدینہ کی طرف لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دن نماز صبح کے لیے آئے تو اس سورہ کی نماز میں تلاوت کی۔ نماز کے بعد صحابہ نے عرض کیا، یہ تو ایسا سورہ ہے جسے ہم نے آج تک سنا نہیں ہے۔

فرمایا: ہاں! علیؑ دشمنوں پر فتح یاب ہوئے ہیں اور جبرئیل نے گزشتہ رات یہ سورہ لا کر مجھے بشارت دی ہے۔

کچھ دن کے بعد علیؑ غنائم اور قیدیوں کے ساتھ مدینہ میں وارد ہوئے۔[1]

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ واقعہ اس سورہ کے واضح مصادیق میں سے ایک ہے۔ یہ اس کا شانِ نزول نہیں ہے۔

تفسیر

بیدار مجاہدین کی قسم

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورہ بیدار کرنے والی قسموں سے شروع ہوا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: "ان فراٹے بھرتے ہوئے سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم (جو میدان جہاد کی طرف پیش رفت کرتے ہیں)۔" (والعادیاتِ ضبحًا)[2]

یا حاجیوں کے ان اونٹوں کی قسم جو ہانپتے ہوئے سرزمین عرفات سے مشعر الحرام اور مشعر سے منیٰ کی طرف چلتے ہیں۔

"عادیات" "عادیة" کی جمع ہے، جو "عدو" (بروزن صبر) کے مادہ سے ہے، اصل میں گزرنے اور جدا ہونے کے معنی میں ہے، چاہے دل سے ہو، جسے "عداوت" کہتے ہیں، یا خارجی حرکت اور چلنے سے ہو جسے "عدو" (دوڑنا) کہتے ہیں اور کبھی یہ معاملات میں ہوتی ہے جسے "عدوان" کہتے ہیں، اور یہاں وہی سرعت اور تیزی کے ساتھ دوڑنا مراد ہے۔

"ضبح" (بروزن مدح) تیزی اور سرعت کے ساتھ دوڑنے والے کے سانس کی آواز کے معنی میں ہے جو اس کے دوڑنے

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۲۱ ص ۶۶ سے آگے، "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۲۸ اور بعض دوسری کتب تاریخ۔

[2] قاعدہ کی رو سے "والعادیات عدوًا" کہنا چاہیئے، لیکن چونکہ عدو (دوڑنے) کا لازمہ سانس نکالنا ہے، لہٰذا اس کے بجائے "ضبحًا" کہا گیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ آیت میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ والعادیات یضبحن ضبحًا۔

کے وقت کانوں میں آتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے اس آیت کی تفسیر میں دو نظریے موجود ہیں۔

پہلا نظریہ یہ ہے کہ اس سے مراد ان گھوڑوں کی قسم ہے جو سرعت اور تیزی کے ساتھ میدانِ جہاد کی طرف آگے بڑھتے ہیں اور چونکہ جہاد ایک مقدس امر ہے اس لیے جانور بھی اس مقدس راستے میں اس طرح کی قدر و قیمت پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ ان کی قسم کھائی جائے۔

دوسری تفسیر ان اُونٹوں کی قسم ہے جو حج جیسے عظیم فریضہ میں مواقف اور اماکنِ مقدس میں سُرعت اور تیزی کے ساتھ چلتے ہیں، اس بنا پر وہ ایک تقدس کے حامل بن جاتے ہیں اور قسم کے لائق ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ " ابنِ عباسؓ " سے روایت ہے، کہ انہوں نے فرمایا :

" میں خانہ کعبہ کے پاس حجر اسمٰعیل میں تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے آیۂ والعادیات ضبحًا " کے بارے میں مجھ سے سوال کیا " میں نے کہا : " اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو راہِ جہاد میں حملہ کرتے ہیں اور رات کو اپنے آرام کرنے کی جگہ پر لوٹ آتے ہیں، اور وہ غازی لڑنے والے مجاہدین ہیں جو آگ روشن کرتے ہیں اور اپنے لیے کھانا پکاتے ہیں "

وہ شخص میرے پاس سے چلا گیا اور علی علیہ السلام کے پاس پہنچا، آپ اس وقت چاہِ زمزم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے آپ سے بھی اس آیت کے بارے میں سوال کیا۔

آپ نے فرمایا : کیا تو نے مجھ سے پہلے بھی کسی شخص سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا ہے ؟ اس نے عرض کیا :

ہاں ! میں نے ابن عباس سے پوچھا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو راہِ جہاد میں حملہ کرتے ہیں" آپ نے فرمایا : جاؤ اور اُسے میرے پاس بلا لاؤ۔

جب میں حضرتؑ کی خدمت میں آیا تو آپ نے فرمایا :

جو بات تم نہیں جانتے اس کے بارے میں لوگوں کو فتوے کیوں دیتے ہو۔ اسلام میں سب سے پہلا غزوہ جنگِ بدر تھا، اور ہمارے پاس دو گھوڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک گھوڑا "زبیر" کے پاس اور دوسرا گھوڑا "مقداد" کے پاس تو " عادیات " سے مراد گھوڑے کیسے ہو سکتے ہیں ؟ ایسا نہیں ہے۔ اس سے مراد وہ اُونٹ ہیں جو عرفات سے مشعر کی طرف اور مشعر سے منیٰ کی طرف جاتے ہیں۔ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں : جب میں نے یہ سُنا تو میں نے اپنا نظریہ بدل لیا اور امیرالمومنین علی علیہ السلام کے نظریہ کو قبول کر لیا۔ [1]

یہ احتمال بھی ہے کہ " عادیات " ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ مجاہدوں کے گھوڑوں کو بھی شامل ہے اور حاجیوں کے اونٹوں کو بھی، اور اُوپر والی روایت سے مراد یہ ہو کہ اس کے معنی کو گھوڑوں میں محدود نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ یہ معنی تمام مقامات پر صادق نہیں آتا۔ اس کا سب سے

---

[1] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۲۹۔ اس روایت کو قرطبی نے بھی اپنی تفسیر کی جلد ۱۰ ص ۷۲۴۵ میں نقل کیا ہے۔

زیادہ واضح مصداق حاجیوں کے اُونٹ ہیں۔

یہ تفسیر کئی جہات سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "قسم ہے ان کی جو آگ کی چنگاریاں نکالتے ہیں"۔ (فالموریات قدحًا)۔

مجاہدین کے وہ گھوڑے جو میدانِ جنگ کی طرف اتنی تیزی کے ساتھ جاتے ہیں کہ اُن کے سموں کے پتھروں پر ٹکرانے سے چنگاریاں نکلتی ہیں، یا وہ اُونٹ جو سُرعت کے ساتھ مواقفِ حج میں دوڑتے ہیں اور ان کے پاؤں کے نیچے سے کنکریاں اور ریت اُڑتی ہے اور ان کے دوسرے سنگریزوں کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔

یا وہ قبیلے اور گروہ جو مواقفِ حج میں کھانا پکانے کے لیے آگ جلاتے ہیں، یا ان لوگوں سے کنایہ ہے جو جنگ اور جہاد کی آگ بھڑکاتے ہیں، یا ان زبانوں کی طرف اشارہ ہے جو اپنے چبھنے والے بیان سے دشمن کے دل میں آگ لگا دیتے ہیں، یا بعض مفسرین کے قول کے مطابق اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی حاجات کو انجام دینے کے لیے کوشش کرتے ہیں اور اپنا مقصود حاصل کر لیتے ہیں جیسے کہ آگ چقماق کے پتھر سے باہر آتی ہے۔ لیکن یہ سارے احتمالات بعید نظر آتے ہیں اور آیت کا ظاہر وہی پہلی دو تفاسیر ہیں۔

"موریات" "ایراء" کے مادہ سے "موریة" کی جمع ہے جو آگ بھڑکانے کے معنی میں ہے اور "قدح" چنگاری نکالنے کے لیے پتھر یا لکڑی یا لوہے یا چقماق کو ایک دوسرے پر مارنے کے معنی میں ہے۔

اس کے بعد تیسری قسم میں فرماتا ہے: "اور صبح ہوتے ہی دشمن پر حملہ کرنے والوں کی قسم" (فالمغیرات صبحًا)۔

عربوں کی عادت۔ جیسا کہ طبرسی نے مجمع البیان میں لکھا ہے۔ یہ تھی کہ وہ رات کے وقت دشمن کے علاقے کے قریب جا کر گھات میں بیٹھ جاتے تھے تاکہ صبح سویرے ان پر حملہ کر دیں۔

ان آیات کی شانِ نزول (یا اس کے ایک واضح مصداق) میں یہ آیا ہے کہ لشکرِ اسلام علی علیہ السلام کی کمان میں رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میدانِ جنگ کی طرف بڑھتا چلا گیا اور دشمن کے قبیلہ کے قریب پہنچ کر گھات لگا کر بیٹھ گیا اور صبح سویرے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان پر حملہ کر دیا اور دشمن کے ردِ عمل دکھانے سے پہلے پہلے ان کی طاقت کو درہم برہم کر دیا۔

اور اگر ہم ان قسموں کو حاجیوں کے اُونٹوں کی طرف اشارہ سمجھیں تو پھر اس آیہ سے مراد اُونٹوں کے قافلوں کا عید کی صبح مشعر سے منیٰ کی طرف دوڑتے ہوئے آنا ہے۔

"مغیرات" "اغارة" کے مادہ سے "مغیرة" کی جمع ہے، جو ہجوم کرنے اور دشمن پر حملہ کرنے کے معنی میں ہے۔ چونکہ بعض اوقات یہ ہجوم اور حملہ مال لوٹنے کی غرض سے ہوتا ہے لہٰذا یہ لفظ بعض اوقات فارسی میں عام معنی یعنی غارت کرنے اور دوسروں کا مال چھیننے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس لفظ کے مادہ میں گھوڑے کے ساتھ ہجوم اور حملہ کرنا چھپا ہوا ہے، لیکن اس کے موارد استعمال اچھی طرح اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اگر ابتداء میں یہ قید موجود تھی بھی تو تدریجًا اب ختم ہو گئی ہے۔

اور یہ جو بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہاں "مغیرات" سے مراد وہ ہجوم کرنے والے طوائف و قبائل ہیں جو میدانِ جنگ کی طرف، یا عجلت اور تیزی کے ساتھ منیٰ کی طرف چلتے ہیں، بعید نظر آتا ہے کیونکہ آیہ "والعادیات ضبحًا" یقینی طور پر گھوڑوں یا اونٹوں کی

توصیف ہے نہ کہ ان کے سواروں کی، اور یہ آیت بھی اسی مطلب کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

اس کے بعد ان مجاہدین اور ان کی سواریوں کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "دشمن پر اس قدر تیزی کے ساتھ دوڑ کر جاتے ہیں کہ جس کی وجہ سے ہر طرف گرد و غبار ہی گرد و غبار کر دیتے ہیں": (فاثرن بہ نقعًا)[1]

یا یہ کہ حاجیوں کے اونٹوں کے مشعر سے منیٰ کی طرف ہجوم کے زیر اثر ہر طرف سے گرد و غبار اٹھتا ہے۔

"اثرن" "اثارہ" کے مادہ سے "غبار" یا "دھوئیں" کو پراگندہ کرنے کے معنی میں ہے۔ اور بعض اوقات ہیجان میں لانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اسی طرح فضا میں آواز کی لہروں کے پھیلنے کے معنی میں آیا ہے۔

"نقع" (بروزن نفع) غبار کے معنی میں ہے اور اس مادہ کی اصل پانی کے نیچے چلا جانا، یا کسی کے پانی کے نیچے چلے جانے کے معنی میں ہے اور چونکہ غبار میں ڈوب جانا بھی اس سے مشابہت رکھتا ہے لہٰذا اس لفظ کا اس پر اطلاق ہوا ہے۔ نقیع ساکن اور کھڑے ہوئے پانی کو کہا جاتا ہے۔

ان کی خصوصیات میں سے آخری خصوصیت کے بارے میں فرماتا ہے: "وہ اسی صبح دشمن کے درمیان پہنچ گئے": (فوسطن بہ جمعًا)[2]

انہوں نے غفلت کی حالت میں دشمن پر ایسی برق رفتاری کے ساتھ حملہ کیا کہ چند ہی لمحوں کے اندر صفوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا، ان کے قلب لشکر پر حملہ کر کے ان کی جمعیت کو تتر بتر کر دیا اور یہ اسی سرعت عمل، بیداری، آمادگی، شہامت اور شجاعت کا نتیجہ ہے۔

یا یہ حاجیوں کے "مشعر" سے "قلب" منیٰ میں ورود کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد دشمن کو محاصرے میں لے لینا ہے۔ لیکن یہ تفسیر اسی صورت میں صحیح ہو گی جب "فوسطن" کا جملہ "سین" کی تشدید کے ساتھ پڑھا جائے جب کہ مشہور قرأت اس طرح نہیں ہے۔ اس بنا پر صحیح وہی پہلا معنی ہی ہے۔

مجموعی طور پر اس سارے مضمون کو یکجا کر کے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان مذکورہ گھوڑوں کی قسم جو پہلے تو بڑی سرعت کے ساتھ فراٹے بھرتے سانس نکالتے میدان جہاد کی طرف پیش رفت کرتے ہیں، پھر ان کی سرعت میں ایسی تیزی آتی ہے کہ پتھروں پر ان کے سموں کی ٹاپوں سے چنگاریاں نکلتی ہیں، جو رات کی تاریکی کو چیر کر رکھ دیتی ہیں اور اس کے بعد جب وہ دشمن کے علاقے میں پہنچ جاتے ہیں تو ابھی وہ غفلت میں ہی ہوتے ہیں کہ فضا کے صاف اور روشن ہوتے ہی ان پر حملہ کر دیتے ہیں، ایسا حملہ، جس سے فضا میں گرد و غبار چھا جاتا ہے اور انجام کار وہ دشمن کی جمعیت کے قلب میں وارد ہو کر ان کی صفوں کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔

ان طاقتور اور پُر قدرت گھوڑوں کی قسم
ان شجاع اور بہادر سواروں کی قسم
مجاہدین کے گھوڑوں کے فراٹے بھرنے کی قسم

---

[1] "بہ" کی ضمیر "عدو" (دوڑنے) کی طرف لوٹتی ہے جس کا "والعادیات ضبحًا" کے جملہ سے استفادہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر "باء" یہاں "سببیت" کے معنی میں ہے، یعنی اس دوڑنے کے سبب سے گرد و غبار فضا کو پُر کر دیتا ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ اس زمانہ یا مکان کی طرف لوٹتی ہے جس میں یہ تاخت و تاز انجام پائی ہے۔ اس بنا پر "باء" ظرفیت کے معنی میں ہے، لیکن صحیح وہی پہلا معنی ہے۔

[2] "بہ" کی ضمیر کے مرجع اور "باء" کے معنی کے سلسلہ میں یہاں وہی بحث ہے جو پہلی آیت میں تھی۔

ان چنگاریوں کی قسم جو ان کے سموں سے نکلتی ہیں۔
غفلت کی حالت میں ان کے حملے کی قسم
گرد و غبار کے ان ذرات کی قسم جو فضا میں پھیل جاتے ہیں۔
اور انجام کار ان کے دشمن کی صفوں کے قلب میں وارد ہو کر انہیں درہم برہم کر کے
فتح یاب ہونے کی قسم۔

اگرچہ وہ تمام باتیں جو بیان کی گئی ہیں وہ ان قسموں کے معنی میں نہیں آئی ہیں، لیکن کلام کی ضمنی دلالت میں یہ سب جمع ہیں۔

اور یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاد اس قدر عظمت رکھتا ہے کہ مجاہدین کے گھوڑوں کا فراٹے بھرنا اور سانس لینا تک بھی لائق قسم ہے۔ اسی طرح پتھروں پر ان کی ٹاپوں سے نکلنے والی چنگاریاں اور اسی طرح وہ گرد و غبار جو وہ فضا میں اڑاتے ہیں، ہاں! ہاں! میدانِ جہاد کا گرد و غبار بھی قابلِ قدر اور باعظمت ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ان قسموں سے مراد احتمالاً وہ نفوس ہیں جو اپنے کمالات کو دوسروں کی طرف منتقل کر سکیں اور اپنے افکار سے علم و دانش کی چنگاریاں نکالیں اور ہوا و ہوس پر حملہ آور ہوں اور اپنے اندر اور دوسروں میں خدا کا شوق پیدا کریں۔ اور انجام کار ساکنینِ علیین کے قلب میں مقام حاصل کریں[1]

لیکن یہ بات واضح ہے کہ ان باتوں کو اُوپر والی آیات کی تفسیر کے عنوان سے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ وہ تشبیہات ہیں جو آیت کی تفسیر سے مناسبت کی وجہ سے ذہن میں آتی ہیں۔

ان عظیم قسموں کے بعد جواب قسم، یعنی وہ چیز جس کے لیے قسمیں کھائی گئی ہیں، پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"بے شک انسان اپنے پروردگار کی نعمتوں کے بارے میں ناشکرا اور بخیل ہے" (ان الانسان لربہ لکنود)۔

وہی غیر تربیت یافتہ انسان، وہی انسان جس کے دل پر معارفِ الٰہی اور انبیاء کی تعلیمات کے انوار نہیں چمکے، ـــــ اور وہی انسان جس نے خود کو خواہشاتِ نفسانی اور سرکش شہوتوں کا تابع بنا لیا ہے، یقیناً وہ "ناشکرا" اور "بخیل" ہے۔

"کنود" اس زمین کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز نہیں اُگتی۔ ناشکرے اور بخیل انسان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

مفسرین نے کنود کے لیے بہت سے معنی بیان کیے ہیں۔ "ابوالفتوح رازی" نے تقریباً پندرہ معانی اس سلسلہ میں نقل کیے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر اسی اصل معنی کے شاخ و برگ ہیں جو اُوپر بیان ہوا ہے۔ مزید معانی یہ ہیں:

۱۔ کنود اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی مصیبتوں کو تو بڑھا چڑھا کر بیان کرے لیکن نعمتوں کو بھول جائے۔

۲۔ کنود اس شخص کو کہتے ہیں جو خدا کی نعمتوں کو اکیلا ہی کھاتا ہے اور دوسروں کو روکتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"اتدرون من الکنود"
"کیا تم جانتے ہو کہ کنود کسے کہتے ہیں"؟!

---

[1] "تفسیر بیضاوی" ص ۴۶۵

لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں، تو آپ نے فرمایا :

" الکنود الذی یأکل وحدہ، و یمنع رفدہ و یضرب عبدہ "

۲۔ " کنود اس شخص کو کہتے ہیں جو اکیلے ہی اکیلے کھاتا ہے اور دُوسروں سے عطا و بخشش کو روکتا ہے اور اپنے ماتحت غلاموں کو مارتا ہے۔" [1]

۳۔ کنود وہ شخص ہے جو مشکلات و مصائب میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہمدردی نہیں کرتا۔

۴۔ کنود وہ ہے جس کی نیکیاں بہت ہی کم ہوں۔

۵۔ کنود وہ شخص ہے کہ جب اسے کوئی نعمت ملتی ہے تو وُہ اسے دوسروں کو نہیں دیتا اور اگر کسی مشکل میں گرفتار ہو جائے تو بے صبری دکھاتا اور بہت گڑگڑاتا ہے۔

۶۔ کنود وہ جو اللہ کی نعمتوں کو معصیت میں صَرف کرتا ہے۔

۷۔ کنود وہ شخص ہے جو خدا کی نعمتوں کا انکار کرتا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، یہ سب معانی اسی ناشکری اور بُخل کی شاخ و برگ اور مصادیق ہیں۔

ایسے موارد میں " انسان " کی تعبیر، بدکار، ہوا پرست، سرکش اور باغی انسانوں کے معنی میں ہے، اور بعض نے اس کی کافر انسان سے تفسیر کی ہے ورنہ یقیناً ہر انسان ایسا نہیں ہے کیونکہ بہت سے انسان ایسے ہیں کہ جن کی رُوح میں شکرگزاری اور عطا و بخشش گندھی ہوئی ہے، اور وہ ناشکری اور بُخل سے بیزار ہیں۔ اسی طرح وہ انسان جنہوں نے اللہ پر ایمان کے سائے میں خود خواہی اور خُود پرستی کو چھوڑ دیا ہے، اور پروردگار کے اسماء و صفات کی معرفت اور اخلاقِ الٰہی کی فضا میں آسمان پر بلند پرواز کر رہے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : " اور وہ خُود بھی اسی معنی پر گواہ ہے۔" (وانہ علیٰ ذالک لشہید)۔

کیونکہ انسان اپنے نفس کے بارے میں اچھی طرح آگاہ ہے اور اگر وہ اپنی اندرونی صفات کو ہر شخص سے چھپا سکتا ہو تو خدا اور اپنے وجدان سے مخفی نہیں رکھ سکتا، چاہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ " انہ " کی ضمیر " خدا " کی طرف لوٹتی ہے، یعنی خدا انسان میں کنود کی صفت کے وجود کا گواہ ہے۔

لیکن قبل و بعد کی آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جن میں اس سے مشابہ ضمیریں انسان کی طرف لوٹتی ہیں، یہ احتمال بہت ہی بعید نظر آتا ہے، اگرچہ بہت سے مفسرین نے اس تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کی اپنے گناہوں اور عیوب پر قیامت میں گواہی دینا ہے، جیسا کہ قرآن کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

اس تفسیر کے لیے بھی یہاں کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو اس دنیا میں بھی اس کے کفران اور بُخل پر گواہی کو شامل ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات انسان اپنی شناخت سے عاجز ہو جاتا ہے، اور اصطلاح کے مطابق اپنے وجدان کو دھوکا دیتا ہے اور

---

[1] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۳

شیطانی آرائش و زیبائش اُس کی مذموم صفات کو اس کی نظر میں خوبصورت بنا کر جلوہ گر کر دیتی ہیں۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ کفران و بُخل کے بارے میں مطلب اس قدر واضح ہے کہ اس کی پردہ پوشی نہیں کی جا سکتی اور اپنے وجدان کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: " وہ مادّی چیزوں اور مال سے شدید لگاؤ اور محبت رکھتا ہے"۔ (وانہ لحب الخیر لشدید)[1]

اور مال و دولت کے ساتھ اس کا یہی شدید اور کثرت سے لگاؤ اس کے بُخل، ناشکری اور کفران کا سبب بن جاتا ہے۔

البتہ " خیر" ایک وسیع معنی رکھتا ہے، جو ہر قسم کی نیکی کو شامل ہے۔ اور یقینی طور پر بہت سی نیکیوں اور اچھی چیزوں مثلاً علم و دانش، تقویٰ اور بہشت و سعادت سے لگاؤ اور محبت کوئی ایسا مذموم مطلب نہیں ہے کہ قرآن اُوپر والی تعبیر کے ساتھ اس کی مذمت کرے۔ اسی لیے مفسرین نے اس کی یہاں " مال" کے معنی سے تفسیر کی ہے، جس پر قرینۂ مقام اور گزشتہ آیت بھی گواہ ہے، اور قرآن کی بعض دوسری آیات بھی! اس کی گواہی دیتی ہیں)۔ مثلاً: سورہ بقرہ کی آیہ ۱۸۰، جس میں فرماتا ہے: "کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین" تم پر فرض ہے کہ اگر تم میں سے کوئی کچھ مال چھوڑ جائے تو وہ باپ، ماں اور نزدیکیوں کے لیے وصیت کرے۔

مسلّمہ طور پر " مال" پر " خیر" کا اطلاق اس بنا پر ہے کہ مال اپنی ذات کی حد تک ایک اچھی چیز ہے۔ اور وہ انواع و اقسام کی نیکیوں کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ لیکن ناشکرا اور بخیل انسان اس کو اس کے اصلی ہدف سے روک کر خود پسندی اور خود غرضی کی راہ میں استعمال کرتا ہے۔

اس کے بعد ایک استفہام انکاری کی صورت میں، جو تہدید کے ساتھ توأم ہے، فرماتا ہے: "کیا یہ ناشکرا، بخیل اور دنیا پرست انسان یہ نہیں جانتا کہ جب وہ سب کے سب جو قبروں میں ہیں وہ زندہ ہو جائیں گے"۔ (افلا یعلم اذا بعثر ما فی القبور)۔

اور جب وہ تمام چیزیں جو سینوں میں ہیں، جیسے کفر و ایمان، اخلاص و ریا، تکبّر و غرور، تواضع و انکسار اور اچھی اور بُری نیتیں، سب آشکار ہو جائیں گی۔ (وحصّل ما فی الصدور)۔

" اس دن ان کا پروردگار ان سے اور ان کے اعمال اور نیتوں سے آگاہ ہے"۔ اور اس کے مطابق ہی انہیں جزا و سزا دے گا۔ (ان ربھم بھم یومئذ لخبیر)۔

" بعثر" " بعثرۃ" (بروزن منقبۃ) کے مادّہ سے اصل میں زیر و زبر کرنے، باہر نکالنے اور استخراج کرنے کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ مُردوں کو زندہ کرنے کے وقت قبریں زیر و زبر ہوں گی، اور جو کچھ ان میں ہے وہ ظاہر ہو جائے گا، لہٰذا اُوپر والی آیات میں یہ تعبیر قیامت کے بارے میں استعمال ہوئی ہے۔

" ما فی القبور" کی تعبیر (اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ " ما" عام طور پر غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے) یا تو اس بنا پر ہے کہ اس میں یہ بات مدِّ نظر ہے کہ مُردے ابھی مٹی میں، یا یہ اُس ابہام کی بنا پر ہے جو اس پر حاکم ہے کہ معلوم نہیں کون سے اشخاص ہیں؟

" قبور" (قبروں) کی تعبیر اس سے کوئی منافات نہیں رکھتی کہ لوگوں کا ایک گروہ اصولاً قبر نہیں رکھتا مثلاً وہ لوگ جو دریا میں ڈوب جائیں،

---

[1] " لحب الخیر" کی " لام" ممکن ہے " لام تعدیہ" ہو یا لام علت، پہلے احتمال کی بنا پر اس کی تفسیر وہی ہے جو اُوپر بیان ہو چکی ہے، اور دوسرے احتمال کی بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے، انسان مال کی محبت کی وجہ سے بخیل ہے، لیکن مسلّمہ طور پر پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

یا ان کی قبر ایک مدت کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور اُن کی مٹی بکھر جاتی ہے کیونکہ اُن لوگوں کی اکثریت مدِنظر ہے جو قبر رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ممکن ہے کہ قبر یہاں ایک وسیع معنی رکھتی ہو، یعنی وہ جگہ جہاں لوگوں کی مٹی موجود ہو اگرچہ وہ عام قبر کی صُورت میں نہ ہو۔

"حصّل" "تحصیل" کے مادّہ سے اصل میں "چھلکے" سے "مغز" کو باہر نکالنے کے معنی میں ہے۔ اسی طرح معادن کو صاف کرنے اور سونے وغیرہ کو کان کے پتھر سے نکالنے پر بولا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ایک وسیع معنی یعنی مطلق استخراج کرنے اور الگ کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا، اور زیرِ بحث آیت میں اس خیر و شر اور نیکی و بُرائی کو جُدا کرنا مراد ہو جو دلوں میں چھُپی ہوئی ہے چاہے وہ ایمان و کفر ہو، یا صفات حسنہ و رذیلہ، یا اچھی اور بُری نیتیں، وہ سب کی سب اس دن ایک دوسرے سے جُدا اور ظاہر و آشکار ہو جائیں گی۔ اور ہر شخص کو ان کے مطابق جزا و سزا ملے گی۔

جیسا کہ سُورہ طارق کی آیہ ۹ میں آیا ہے: یوم تبلی السرائر: "اس دن سارے اندرونی بھید ظاہر و آشکار ہو جائیں گے"۔

"یومئذ" کی تعبیر اور اس معنی پر تکیہ کہ خدا "اس دن" ان کے اعمال اور ان کے دلوں میں چھُپے ہوئے بھیدوں سے آگاہ ہوگا حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا ہمیشہ ان مسائل سے آگاہ ہے "اس بنا" پر ہے کہ وہ دن روزِ جزا ہے، اور وہ انہیں ان کے اعمال و عقائد کی جزا دے گا۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق اس تعبیر کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص دوسرے سے تہدید کے طور پر کہے سأعرف لك لمرك "میں عنقریب تجھے تیرے عمل کا تعارف کراؤں گا" حالانکہ آج بھی اس قسم کا تعارف موجود ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اس کا نتیجہ اور بدلہ تجھے دوں گا۔

ہاں! خدا ہمیشہ اور ہر حالت میں اندر اور باہر کے اسرار سے مکمل طور پر آگاہ ہے، لیکن اس آگاہی کا اثر قیامت میں اجر و ثواب اور جزا و سزا کے وقت زیادہ ظاہر اور زیادہ آشکار ہو جائے گا۔ اور یہ تمام انسانوں کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ اگر واقعاً وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں تو یہ چیز ان کے اور گناہوں کے درمیان ایک طاقتور سد بن جائے گی۔ چاہے وہ گناہ آشکار ہوں یا پنہاں، اندرونی گناہ ہوں یا بیرونی، اور اس اعتقاد کا تربیت پر کیا اثر پڑتا ہے کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

چند نکات

اِس سُورہ کی قسموں اور اس کے ہدف کے درمیان ربط

اس سُورہ کے سلسلہ میں جو سوالات سامنے آتے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ مجاہدین کے گھوڑوں کی قسم اور "ان الانسان لربہ لکنود" کے جملہ کے درمیان کیا ربط ہے؟ کیونکہ قرآن کی آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ قسموں اور مقسم بہ (جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے) کے درمیان ایک قسم کا ربط موجود ہوتا ہے۔ اور اصولی طور پر قرآن کی فصاحت و بلاغت بھی اس قسم کے مطلب کا اقتضا کرتی ہے۔

زیرِ بحث آیات میں ممکن ہے اس طرح کا ربط ہو کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ ایسے ایثار کرنے والے انسان بھی موجود ہیں جو جہاد کے راستہ میں بے پروا ہو کر پیش رفت کرتے ہیں اور کسی قسم کی فداکاری میں کوتاہی نہیں کرتے، اور اپنی جان و مال خدا کی راہ میں دے دیتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ اتنے بخیل اور ناشکرے کیوں بن جاتے ہیں کہ نہ تو وہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں خدا کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی راہ

ہیں ایثار کرتے ہیں؟

یہ ٹھیک ہے کہ قسم تو گھوڑوں ہی کی کھائی گئی ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ وہ مجاہدین کے لیے ایک آلہ ہیں، اور حقیقت میں مجاہدین کے جہاد کی قسم کھائی گئی ہے۔ (اور اسی طرح اگر یہ حاجیوں اور خانہ خدا کے زائرین کے اُونٹوں کی قسم ہو)۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ربط اس طرح سے حاصل ہوتا ہے کہ یہ جانور حق تعالیٰ کی راہ میں سُرعت کے ساتھ جاتے ہیں۔ پس اے انسان تو کیوں اس کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا جب کہ تُو اشرف المخلوقات ہے اور اس کے زیادہ لائق ہے؟

لیکن پہلی مناسبت زیادہ واضح ہے۔

۲۔ کیا اِنسان طبعاً ناشکرا اور بخیل ہے؟

ممکن ہے کچھ لوگ ان الانسان لربہ لکنود کے جملے سے یہ مفہوم لیں کہ "کنود" کی حالت میں ہونا یعنی ناشکری اور بُخل کرنا سب انسانوں کی طبیعت کا جزء ہے تو پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ امر بیدار وجدان اور فطری شعور کے ساتھ، جو انسان کو شکرِ منعم اور ایثار و قربانی کی دعوت دیتا ہے، کیسے سازگار ہو سکتا ہے؟

اس قسم کا سوال، قرآن مجید کی بہت سی آیات میں، جو انسان کی کمزوریوں کے واضح نقاط کو بیان کرتی ہیں، سامنے آتا ہے۔

ایک جگہ انسان کو "ظلوم و جہول" شمار کیا گیا ہے۔ (احزاب - ۷۲)

دوسری جگہ "ھلوع" (کم ظرف) (معارج - ۱۹)

ایک دوسری جگہ "یؤس کفور" (مایوس و ناشکرا) (ھود - ۹)

ایک اور مقام پر طاغی اور سرکش۔ (علق - ۶) کے ساتھ متعارف ہوا ہے۔

کیا واقعاً ضعف و کمزوری کے یہ نقاط انسان کی طبیعت میں پوشیدہ ہیں، حالانکہ قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا نے آدم کو مکرم بنایا ہے اور سب مخلوق پر اُسے برتری دی ہے: ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلاً، (اسراء - ۷۰)

اس سوال کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان دو بُعد و جہات وجودی رکھتا ہے، اور اسی بنا پر وہ اپنے "قوس صعودی" میں "اعلیٰ علیین" تک پہنچ جاتا ہے اور اپنے "قوس نزولی" میں اسفل سافلین میں جا گرتا ہے۔

اگر وہ مربیانِ الٰہی سے تربیت پائے، عقل کے پیام سے ہدایت حاصل کرے اور اپنی اصلاح کرے تو وہ "فضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلاً" کا مصداق ہو جاتا ہے۔

اور اگر ایمان و تقویٰ سے منہ موڑ لے، اور اولیائے خدا کی رہنمائی سے باہر نکل جائے، تو پھر وہ "ظلوم" و "کفار" "یؤس" و "کفور" اور "ھلوع" و "کنود" کی صُورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس طرح ان آیات کے درمیان کسی قسم کا تضاد موجود نہیں ہے، البتہ ان میں سے ہر ایک کا انسان کے ایک بُعد اور جہت کے ساتھ تعلق ہے۔

ہاں! انسان کی فطرت کے اندر تمام نیکیوں، اچھائیوں اور افتخارات و فضائل کی اصل اور جڑ پوشیدہ ہے اور اسی طرح انسان ان فضائل کے نقطۂ مقابل کے لیے بھی آمادگی رکھتا ہے۔ اسی لیے عالم آفرینش کی کسی بھی مخلوق کے قوسِ صعودی و نزولی کے درمیان اس قدر فاصلہ اور دُوری نہیں ہے۔ (غور کیجیے)

۳۔ جہاد کی عظمت

قرآن مجید میں جہاد اور راہِ خدا کے مجاہدین کی عظمت کے بارے میں بہت ہی زیادہ گفتگو ہوئی ہے۔ لیکن شاید یہ مسئلہ کسی جگہ بھی اس عظمت کے ساتھ بیان نہیں ہوا کہ ان کے گھوڑوں کے ہنہنانے، ان کے سموں سے نکلنے والی چنگاریوں اور ان کے تیز دوڑنے سے اُٹھنے والا گرد و غبار تک بھی اس قدر باعظمت سمجھا جائے، کہ اس کی قسم کھائی جائے۔

خصوصاً ان کے سُرعت عمل پر، جو جنگوں میں کامیابی کا اہم ترین عامل ہے، تکیہ ہوا ہے، اور غفلت کی حالت میں جا لینے پر بھی، جو جنگ میں موفق ہونے کا ایک اور عامل ہے، تکیہ ہوا ہے۔

اور یہ سب جہاد کے پروگرام کے سلسلہ میں ایک تربیت اور تعلیم ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس سُورہ کے شانِ نزول میں بھی آیا ہے کہ علی علیہ السلام نے یہ حکم دیا تھا کہ رات کی تاریکی میں اپنی سواریوں کو تیار کرلیں، انہیں ضروری خوراک دیں، اُن پر زین کس لیں، اور مکمل طور پر (الرٹ) تیاری کی صُورت میں آجائیں، جب رات کی تاریکی کا پردہ ہٹا تو آپ نے فوراً اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز صبح ادا کی، اور بلا فاصلہ دشمن پر حملہ کر دیا، اور دشمن اس وقت بیدار ہوا جب مجاہدینِ اسلام کے گھوڑے ان کے سروں پر پہنچ گئے۔

غفلت کی حالت میں اس سریع حملہ سے تلف ہونے والوں کی تعداد بھی بہت کم رہی، اور جنگ کا خاتمہ بھی مختصر سے وقت میں ہوگیا، اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ سب باتیں اس سورہ کی آیات میں بہت ہی عمدہ طریقے سے بیان ہوئی ہیں۔

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ نہ تو گھوڑوں میں کوئی خصوصیت ہے اور نہ ہی بیابان کے پتھروں پر سموں کے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی چنگاریاں کوئی خصوصیت رکھتی ہیں، اور نہ ہی ان کے پاؤں سے اُٹھنے والا گرد و غبار، جو چیز خصوصیت رکھتی ہے وہ مسئلہ جہاد ہے، اور اس کے بعد اس کے آلات ہیں، جو موجودہ زمانہ کے تمام جنگی وسائل کو شامل ہیں، جیسا کہ سُورہ انفال کی آیہ ۶۰ میں "رباط الخیل" (قوی اور طاقتور گھوڑوں) کے بیان میں "قوۃ" اور "طاقت" کے بارے میں کلی طور پر گفتگو ہوئی ہے۔

خداوندا! ہمیں اپنی رضا اور خوشنودی کی راہ میں جہاد کرنے اور قربانی دینے کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! نفس سرکش ناشکری اور کفران کی طرف مائل رہتا ہے، ہمیں اس کے خطرات سے محفوظ فرما۔

بارِ الٰہا! تو ہر شخص کے اندرونی اور بیرونی اسرار سے آگاہ ہے اور ہمارے اعمال سے باخبر ہے۔ اپنے لطف و کرم اور عنایت و بخشش سے ہمارے ساتھ سلوک کر۔

آمین یا رب العالمین۔

اختتام سُورہ والعادیات

اختتام ترجمہ شب ۲۵ رمضان المبارک ایک بج کر ۲۱ منٹ شب
برمکان حقیر قم مقدس جمہوری اسلامی ایران

سُورَۃُ الْقَارِعَۃ

❖ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔

❖ اس میں ۱۱ آیات ہیں

سُورۂ "قارعہ" کے مطالب اور اس کی فضیلت

اِس سُورہ میں کُلی طور پر معاد اور اس کے مقدمات کے بارے میں گفتگو ہے۔ اِس میں چُبھنے والی تعبیریں ہیں، ہلا دینے والے بیان ہیں، اور صریح و واضح انذار اور تنبیہ ہے۔ اور آخر میں انسانوں کی دو گروہوں میں تقسیم کا بیان ہے۔

ایک گروہ تو وہ ہے جن کے اعمال عدلِ الٰہی کی میزان میں وزنی ہوں گے، اور ان کی جزا حق تعالیٰ کے جوارِ رحمت میں سراسر رضایت بخش زندگی ہے۔ اور دوسرا گروہ وہ ہے جن کے اعمال ہلکے اور کم وزن ہوں گے، ان کی سرنوشت جہنم کی جلانے والی آگ ہے۔

اِس سُورہ کا نام یعنی "قارعة" اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔

اِس کی فضیلت کے سلسلہ میں بس اتنا ہی کافی ہے کہ ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

"من قرأ القارعة آمنه الله من فتنة الدجال ان يؤمن به، و من قيح جهنم يوم القيامة ان شاء الله:

"جو شخص سورہ "قارعہ" کو پڑھے گا تو خداوند تعالیٰ اسے دجال کے فتنہ اور اس پر ایمان لانے سے محفوظ رکھے گا، اور اسے قیامت کے دن انشاء اللہ پیپ سے دُور رکھے گا۔[1]

❖ ❖ ❖

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰، ص ۵۳۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ اَلْقَارِعَةُ ۙ

۲۔ مَا الْقَارِعَةُ ۚ

۳۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۙ

۴۔ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ

۵۔ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۙ

۶۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ

۷۔ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۙ

۸۔ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ

۹۔ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۙ

۱۰۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ۙ

۱۱۔ نَارٌ حَامِيَةٌ ۚ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ وُہ چبھنے والا حادثہ ۔

۲۔ اور وُہ کیسا چُبھنے والا حادثہ ہے ؟

۳۔ اور تُو کیا جانے کہ وُہ چُبھنے والا حادثہ کیسا ہے ؟

۴۔ وُہ دن جس میں لوگ پراگندہ پروانوں کی طرح ہر طرف دوڑ رہے ہوں گے ۔

۵۔ اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اُون کی طرح ہو جائیں گے ۔

۶۔ (اس دن) جس کے اعمال کا ترازو وزنی ہوگا۔

۷۔ وُہ ایک پسندیدہ زندگی میں ہوگا۔

۸۔ لیکن جس کا ترازوئے اعمال ہلکا ہوگا۔

۹۔ اُس کی پناہ گاہ هاویه (جہنّم) ہوگی۔

۱۰۔ اور تُو کیا جانے کہ هاویه کیا ہے ؟

۱۱۔ ایک جلا ڈالنے والی آگ ہے ۔

تفسیر

چُبھنے والا حادثہ

اِن آیات میں، جو قیامت کا تعارف کراتی ہیں، پہلے ارشاد ہوتا ہے : " وہ چُبھنے والا حادثہ " (القارعة)۔

" اور وُہ کیسا چُبھنے والا حادثہ ہے "۔ (ماالقارعة)۔

" اور تُو کیا جانے کہ وُہ چُبھنے والا حادثہ کیا ہے ؟" (وماادراك ماالقارعة)۔

"قارعة" "قرع" (بروزن فرع) کے مادہ سے، کسی چیز کو کسی دوسری چیز پر اس طرح رگڑنے کے معنی میں سے کہ اس سے سخت آواز پیدا ہو، تازیانہ اور ہتھوڑے کو بھی اسی مناسبت سے "مقرعة" کہتے ہیں، بلکہ ہر اہم اور سخت حادثہ کو "قارعة" کہا جاتا ہے۔ (یہاں تانیث کا تاء ممکن ہے تاکید کی طرف اشارہ ہو۔

ان تعبیروں سے جو دوسری اور تیسری آیات میں آئی ہیں، جن میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک سے یہ فرماتا ہے کہ تو کیا جانے یہ سخت اور سرکوبی کرنے والا حادثہ کیا ہے؛ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ چبھنے والا حادثہ اس قدر عظیم ہے کہ اس کے ابعاد اور مختلف جہات ہر شخص کے ذہن میں نہیں آسکتے۔

بہر حال بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ "قارعة" قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے، لیکن انہوں نے ٹھیک طور سے یہ واضح نہیں کیا کہ کیا یہ تعبیر قیامت کے مقدمات کی طرف اشارہ ہے جس میں عالم دنیا درہم برہم ہو جائے گا، آفتاب و ماہتاب تاریک ہو جائیں گے، سمندروں میں آگ لگ جائے گی۔ اگر اس طرح ہو تو پھر اس حادثہ کے لیے "قارعة" کے نام کے انتخاب کی وجہ واضح ہے۔

دوم اس سے دوسرا مرحلہ مراد ہو، یعنی مُردوں کے زندہ ہونے اور عالم ہستی میں ایک نئی طرح ڈالنے کا مرحلہ، اور ٹکرانے اور چبھنے کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ اس دن وحشت و خوف اور ڈر دلوں سے ٹکرائیں گے اور ان کی سرکوبی کریں گے۔

وہ آیات جو اس کے بعد آئی ہیں اُن میں سے بعض تو جہان کے خراب و برباد ہونے کے حادثہ سے مناسبت رکھتی ہیں اور بعض مُردوں کے زندہ ہونے کے ساتھ، لیکن مجموعی طور سے پہلا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے، اگرچہ ان آیات میں دونوں حادثے یکے بعد دیگرے ذکر ہوئے ہیں (قرآن کی اور بہت سی دوسری آیات کے مانند جو قیامت کی خبر دیتی ہیں)۔

اس کے بعد اس عجیب و غریب دن کے تعارف میں کہتا ہے: "وہی دن جس میں لوگ پراگندہ، حیران و پریشان پروانوں کی طرح ہر طرف جائیں گے"۔ (یوم یکون الناس کالفراش المبثوث)۔

"فراش" "فراشة" کی جمع ہے، بہت سے اسے "پروانہ" کے معنی میں سمجھتے ہیں، بعض نے اس کی "ٹڈی دل" کے معنی میں تفسیر کی ہے، اور ظاہراً یہ معنی سورۂ قمر کی آیہ ۷ سے لیا ہے جو لوگوں کو اس دن پراگندہ ٹڈی دل سے تشبیہ دیتی ہے، (کانهم جراد منتشر) ورنہ اس کے لغوی معنی "پروانہ" ہی ہیں۔

بہر حال "پروانہ" کے ساتھ تشبیہ اس لیے ہے کہ پروانے اپنے آپ کو دیوانہ وار آگ پر پھینک دیتے ہیں۔ بدکار لوگ بھی اپنے آپ کو جہنم کی آگ میں ڈالیں گے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ پروانہ کے ساتھ تشبیہ ایک خاص قسم کی حیرت و سرگردانی کی طرف اشارہ ہے، جو اس دن تمام انسانوں پر غالب ہوگی۔

اور اگر "فراش" ٹڈی دل کے معنی میں ہو تو پھر مذکورہ تشبیہ اس لیے ہے کہ کہتے ہیں بہت سے پرندے اُڑتے وقت ایک معین راستہ میں اکٹھے پرواز کرتے ہیں، سوائے ٹڈی دل کے، جو گروہ کی صورت میں اُڑتے ہوئے بھی کوئی مخصوص راستہ نہیں رکھتے، بلکہ اُن میں سے ہر ایک کسی دوسری ہی طرف اُڑ رہا ہوتا ہے۔

پھر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حیرت و پراگندگی و سرگردانی اور دہشت و اضطراب جہان کے خاتمہ کے ہولناک حوادث کی وجہ سے ہوگا، یا قیامت اور حشر و نشر کے آغاز کی وجہ سے۔

اس سوال کا جواب ہمارے اسی بیان سے جو ہم نے اُوپر بیان کیا ہے واضح ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اس دن کی ایک اور خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کے مانند ہو جائیں گے"۔ (وتکون الجبال کالعھن المنفوش)۔

"عھن" (بروزن ذہن) رنگی ہوئی اُون کے معنی میں ہے۔

اور "منفوش" "نفش" (بروزن نقش) کے مادہ سے اون کو پھیلانے کے معنی میں ہے جو عام طور پر دھنکنے کے مخصوص آلات کے ذریعے اُون کو دھنکنے سے انجام پاتی ہے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کی مختلف آیات کے مطابق قربِ قیامت میں پہاڑ پہلے تو چلنے لگیں گے، پھر ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور انجام کار غبار کی صورت میں فضا میں اُڑنے لگیں گے۔ زیرِ بحث آیت میں ان کو رنگین اور دھنکی ہوئی اون سے تشبیہ دی گئی ہے، ایسی اُون جو تیز آندھی کے ساتھ چلے اور اس کا صرف رنگ ہی رنگ نمایاں ہو اور یہ پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے کا آخری مرحلہ ہوگا۔

ممکن ہے یہ تعبیر پہاڑوں کے مختلف رنگوں کی طرف اشارہ ہو کیونکہ رُوئے زمین کے پہاڑوں میں سے ہر ایک ایک خاص رنگ رکھتا ہے۔

بہر حال یہ جملہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اُوپر والی آیات قیامت کے پہلے مرحلوں، یعنی اس جہان کی ویرانی اور اختتام کے مرحلہ کی ہی بات کرتی ہیں۔

اس کے بعد حشر و نشر، مردوں کے زندہ ہونے اور ان کی دو گروہوں میں تقسیم کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "پس جس شخص کا ترازوئے عمل وزنی ہوگا ....." (فاما من ثقلت موازینہ)۔

"وہ ایک عمدہ اور پسندیدہ زندگی میں ہوگا"۔ (فھو فی عیشۃ راضیۃ)۔

"لیکن جس شخص کا ترازوئے اعمال ہلکا ہوگا ....." (واما من خفت موازینہ)۔

"تو اس کی پناہ گاہ جہنم ہے"۔ (فامہ ھاویۃ)۔

اور تو کیا جانے ھاویہ (دوزخ) کیا ہے؟ (وما ادراک ماھیہ)[1]

"ایک جلانے والی آگ ہے"۔ (نار حامیۃ)۔

"موازین" میزان کی جمع ہے جو تولنے کے ایک آلہ کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ پہلے تو مادی وزنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے، اس کے بعد معنوی موازین اور مقاسیس کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ اس دن انسان کے اعمال جسمانی اور قابلِ وزن موجودات کی صورت اختیار کر لیں گے اور واقعی طور پر انہیں اعمال کے

---

[1] "ماھیہ" اصل میں "ماھی" تھا۔ پھر "ھاء سکت" کا اس سے الحاق ہوا۔

تولنے والے ترازوؤں کے ساتھ تولیں گے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ خود نامۂ اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ اگر اس میں کچھ اعمال صالح لکھے ہوئے ہیں تو وہ سنگین اور بھاری ہوگا ورنہ وہ ہلکا یا بے وزن ہوگا۔

لیکن ظاہراً ان توجیہات کی ضرورت نہیں ہے۔ میزان یقینی طور پر ظاہری ترازو کے معنی میں نہیں ہے، جس میں مخصوص قسم کے پلڑے ہوتے ہیں، بلکہ اس کا ہر قسم کے تولنے کے وسیلہ اور ذریعہ پر اطلاق ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے۔

" ان امیرالمؤمنین والائمة من ذریته (ع) هم الموازین"

" امیرالمومنینؑ اور وہ ائمہ جو آپ کی ذریت میں ہیں، وہی تولنے کے ترازو ہیں"۔ [1]

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ جب لوگوں نے آپؑ سے میزان کے معنی کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے جواب میں فرمایا:

" المیزان العدل"

" تولنے کی ترازو وہی عدل ہے"

اس طرح اولیاء اللہ یا قوانین عدل الٰہی ہی وہ ترازو ہیں جن کے سامنے انسان اور ان کے اعمال کو پیش کیا جاتا ہے اور جس قدر وہ ان کے ساتھ مشابہت اور مطابقت رکھتے ہیں وہی ان کا وزن ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ میزان کے "ہلکا" اور "بھاری" ہونے سے مراد خود تولنے کے ترازوؤں کی سنگینی و سبکی نہیں ہے، بلکہ ان چیزوں کا وزن ہے جن کو ان سے تولتے ہیں۔

ضمنی طور پر "موازین" کی تعبیر جمع کی صورت میں اس بنا پر آئی ہے کہ اولیائے حق اور قوانین الٰہی میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ تولنے کی ایک میزان ہے۔ اس سے قطع نظر انسان کی صفات اور اعمال کا تنوع اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہر ایک کو ایک ترازو سے تولا جائے، اور تولنے کے نمونے اور ترازو مختلف ہوں۔

"راغب" "مفردات" میں کہتا ہے: "قرآن مجید میں میزان کبھی تو مفرد کی صورت میں آیا ہے اور کبھی جمع کی صورت میں، پہلی صورت میں اس کے لیے آیا ہے جو حساب کرتا ہے یعنی خدائے یکتا، اور دوسری صورت میں ان کے لیے ہے جن کا حساب ہوگا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ موازین "موزون" کی جمع ہے۔ یعنی وہ عمل جس کا وزن کرتے ہیں۔ اس بنا پر موازین کا ہلکا یا بھاری ہونا خود اعمال کے ہلکا اور بھاری ہونے کے معنی میں ہے، نہ کہ ترازوؤں کے ہلکا اور بھاری ہونے کے معنی میں۔ [2]

البتہ دونوں کا نتیجہ ایک ہے لیکن دو مختلف راستوں سے۔

اس سلسلہ میں ہم نے سورہ اعراف کی آیہ ۸، ۹ کے ذیل میں (جلد ۶ ص ۸۹) پر، اور اسی طرح سورۂ کہف کی آیہ ۱۰۵ کے

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۷، ص ۲۵۱

[2] اس معنی کو "زمخشری" نے "کشاف" میں اور "فخر رازی" نے "تفسیر کبیر" میں اور "ابوالفتوح رازی" نے اپنی تفسیر میں "موازین" کے معنی میں دو احتمالوں میں سے ایک احتمال کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔

ذیل میں (جلد ۱۴ ص۲۸۵) پر اور سورۂ مومنون کی آیہ ۱۰۲ کے ذیل میں (جلد ۱۴ ص ــــ) پر زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔

"عیشة راضیة" (خوش و خرم زندگی) کی تعبیر بہت ہی عمدہ اور ایک بلیغ تعبیر ہے، جو قیامت میں اہل بہشت کی پُرنعمت اور سراسر سکون و آرام کی زندگی کے لیے بیان ہوئی ہے۔ یہ زندگی اتنی پسندیدہ اور رضایت بخش ہے گویا کہ وہ خود راضی ہیں، یعنی بجائے اس کے کہ "مرضیة" کہا جائے، زیادہ سے زیادہ تاکید کے لیے "اسم مفعول" کی بجائے "اسم فاعل" استعمال ہوا ہے[1]

اور یہ عظیم امتیاز آخرت کی زندگی کے ساتھ ہی مخصوص ہے، کیونکہ دُنیا کی زندگی چاہے جتنی بھی مرفہ، پُرنعمت، امن و امان اور رضایت و خوشنودی کے ساتھ ہو، پھر بھی ناخوشی اور ناپسندیدگی کے عوامل سے خالی نہیں ہوتی۔ یہ صرف آخرت ہی کی زندگی ہے جو سراسر رضایت و خوشنودی آرام و سکون اور امنیت و دل جمعی کا سبب ہے۔

فامه هاوية "کے جملہ میں" ام "کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ" ام "ماں کے معنی میں ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ ماں اولاد کے لیے ایک ایسی پناہ گاہ ہے جس کی طرف مشکلات میں پناہ لیتے ہیں اور اس کے پاس رہتے ہیں، اور یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ہلکے وزن والے گنہگار، دوزخ کے علاوہ اور کوئی جگہ پناہ لینے کے لیے نہ پائیں گے۔ اس شخص کے حال پر وائے ہے جس کی پناہ گاہ دوزخ ہوگی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں "ام" کا معنی "مغز" (دماغ) ہے کیونکہ عرب سر کے مغز کو "ام الرأس" کہتے ہیں، تو اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ انہیں سر کے بل جہنم میں پھینکیں گے، لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے کیونکہ اس صورت میں بعد والی آیت "وما ادراك ماهيه" (تو کیا جانے کہ وہ کیا ہے) کا مفہوم درست نہیں رہے گا۔

"هاوية" "هوى" کے مادہ سے گرنے اور سقوط کرنے کے معنی میں ہے، اور وہ "دوزخ" کے ناموں میں سے ایک نام ہے کیونکہ گنہگار اس میں گریں گے اور یہ جہنم کی آگ کے عمق اور گہرائی کی طرف بھی اشارہ ہے۔

اور اگر ہم "ام" کو یہاں "مغز" کے معنی میں لیں، تو "هاوية" کا معنی گرنے والی ہوگا، لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح اور زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

"حامية" "حمی" (بروزن نفی) کے مادہ سے شدتِ حرارت کے معنی میں ہے، اور "حامية" یہاں جہنم کی آگ کی حد سے زیادہ حرارت اور جلانے کی طرف اشارہ ہے۔

بہرحال یہ جملہ جو یہ کہتا ہے تو کیا جانے کہ "هاوية" کیا ہے "هاوية" جلانے والی آگ ہے" اس معنی پر ایک تاکید ہے کہ قیامت کا عذاب اور جہنم کی آگ تمام انسانوں کے تصور سے بالاتر ہے۔

ایک نکتہ

میزان اعمال کی سنگینی کے اسباب

اس میں شک نہیں کہ تمام نیک اور صالح اعمال کی قدر و قیمت یکساں نہیں ہے اور یہ آپس میں بہت زیادہ فرق رکھتے ہیں،

---

[1] بعض نے "راضية" کو "ذات رضا" کے معنی میں بھی سمجھا ہے، یا تقدیر میں کچھ فرض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے مراد اس زندگی والوں کی رضایت ہے، لیکن ان تین تفاسیر میں سے وہی تفسیر اُوپر بیان ہوئی ہے جو سب سے زیادہ مناسب ہے۔

اور اسی وجہ سے مختلف اسلامی روایات میں کچھ اعمالِ خیر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور ان کو ہی قیامت میں میزانِ عمل کے بھاری ہونے کے اسباب شمار کیا گیا ہے۔

منجملہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپ نے لا الٰہ الا اللہ کی تفسیر میں فرمایا:

"یعنی بوحدانیته لا یقبل الاعمال الا بها، وهی کلمة التقوٰی یثقل الله بها الموازین یوم القیامة:

"لا الٰہ الا اللہ" خدا کی وحدانیت کی طرف اشارہ ہے اور کوئی عمل اس کے بغیر قبول نہیں ہوگا ــــ یہ وہ کلمۂ تقویٰ ہے جو عمل تولنے والے ترازو کو قیامت میں سنگین اور وزنی بنائے گا۔" [1]

ایک اور حدیث میں امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے خدا کی وحدانیت اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی شہادت کے بارے میں آیا ہے:

"خف میزان ترفعان منه و ثقل میزان توضعان فیه"

"تولنے کا وہ ترازو جس سے شہادتین کو اٹھا لیا جائے وہ ہلکا ہو جائے گا، اور وہ ترازو جس میں شہادتین کو رکھ دیا جائے وہ سنگین اور وزنی ہو جائے گا۔" [2]

اور ایک اور دوسری حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

"ما فی المیزان شیء اثقل من الصلوٰة علی محمدؐ و آل محمدؐ"

"میزانِ عمل میں کوئی چیز محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آلِ محمدؐ پر درود بھیجنے سے زیادہ سنگین نہیں ہے۔"

اور روایت کے ذیل میں آیا ہے کہ قیامت میں کچھ لوگ میزانِ عمل کے نیچے کھڑے ہوں گے جن کے اعمال کا پلڑا ہلکا ہوگا، پھر محمدؐ و آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود کو اس میں رکھ دیں گے تو وہ سنگین اور وزنی ہو جائے گا۔ [3]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

"من کان ظاهره ارجح من باطنه خف میزانه"

"جس شخص کا ظاہر اس کے باطن سے بہتر ہوگا قیامت میں اس کا میزانِ عمل ہلکا رہے گا۔" [4]

ہم اس بحث کو سلمان فارسیؓ کی ایک گفتگو پر ختم کرتے ہیں جو حقیقت میں وحی اور سنت کا خلاصہ ہے۔ اس حدیث میں آیا ہے:

---

[1] [2] "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۶۵۹ حدیث ۱۲، ۸

[3] وہی مدرک حدیث ۷

[4] "نورالثقلین" ج ۵ ص ۶۶۰ حدیث ۱۳

"کسی شخص نے تحقیر کے طور پر سلمان فارسیؓ سے کہا:
تُو کون ہے اور تیری حیثیت کیا ہے؟ تیری کچھ بھی قدر و قیمت نہیں ہے سلمانؓ نے جواب میں کہا:
" اما اولی و اولك فنطفة قذرة و اما اٰخری و اٰخرك فجيفة منتينة فاذا كان يوم القيامة ، ونصبت الموازين فمن ثقلت موازينه فهوالكريم و من خفت موازينه فهواللئيم " :
" لیکن! میرے اور تیرے وجود کا آغاز تو ایک گندے نطفہ سے ہوا ہے اور میرے اور تیرے وجود کا اختتام ایک بدبودار مردار ہے، اور جب قیامت کا دن ہوگا اور اعمال کے تولنے کے لیے ترازو نصب کیے جائیں گے تو جس شخص کے عمل کا ترازو سنگین اور بھاری ہوگا وہ شریف و بزرگوار ہے، اور جس کے عمل کا ترازو سبک اور ہلکا ہوگا وہ پست و ذلیل اور کمینہ ہوگا۔[1]

خداوندا! ہمارے عمل کے ترازو کو محمدؐ و آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے ذریعے سنگین اور وزنی کردے۔
پروردگارا! "عیشة راضیة" کا حصول تیرے لطف و کرم کے بغیر آسان نہیں ہے۔ پس تو خود ہی اس راہ میں ہماری مدد فرما!
بارِ الٰہا! تیری دوزخ کی آگ بہت ہی سخت جلانے والی ہے اور ہم میں اس کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ اسے اپنے رحم و کرم کے پانی سے ہمارے لیے خاموش کردے۔

❖ ❖ ❖

آمین یارب العالمین

سورہ "قارعة" کا اختتام

---

[1] "نورالثقلین" جلد ۵، ص ۶۶۰ حدیث ۱۴

سُورَۃُ التَّکَاثُر

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا۔

❖ اس میں ۸ آیات ہیں۔

سُورۂ "تکاثر" کے مطالب اور اس کی فضیلت

بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا ہے۔ اس بنا پر اس میں تفاخر کے بارے میں جو گفتگو آئی ہے وہ اصولی طور پر قبائلِ قریش کے ساتھ مربوط ہے جو موہوم امور کی بنا پر ایک دوسرے پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے۔

لیکن۔ جیسا کہ مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں لکھا ہے۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوا ہے اور اس میں تفاخر کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہودیوں یا انصار کے دو قبیلوں کے بارے میں ہے، لیکن اِس سُورہ کا مکّی سُورتوں سے زیادہ مشابہت رکھنے کی وجہ سے مکّی ہونا زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

اس سُورہ کے مطالب میں مجموعی طور سے پہلے تو ایسے لوگوں کی، جو موہوم مطالب کی بنیاد پر ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرتے تھے، سرزنش اور ملامت ہے۔ اس کے بعد قیامت و معاد اور جہنم کی آگ کے مسئلہ پر تنبیہ ہے اور آخر میں نعمتوں کے بارے میں سوال اور باز پُرس کے مسئلہ میں تنبیہ کی گئی ہے۔

اس سُورہ کا نام اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔

اس کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"ومن قرأها لم يحاسبه الله بالنعيم الذي أنعم عليه في دار الدنيا و اعطى من الاجر كانما قرء الف اية"[1]

"جو شخص اس کو پڑھے گا تو خدا اس سے ان نعمتوں کا حساب نہیں لے گا جو اُس نے اُسے دارِ دُنیا میں دی ہیں اور اسے اس قدر اجر و ثواب عطا کرے گا گویا کہ اس نے قرآن کی ہزار آیتوں کی تلاوت کی ہے۔"[2]

اور ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے کہ "اس سورہ کا واجب اور مستحب نمازیں پڑھنا شہداء کی شہادت کا ثواب رکھتا ہے۔"[3]

واضح ہو کہ یہ سب ثواب ان لوگوں کے لیے ہیں جو اسے پڑھیں اور اسے اپنی زندگی کا پروگرام بنائیں اور دل جان سے اپنے آپ کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۳۲

[2] "وہی مدرک" (تلخیص کے ساتھ)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ
۲۔ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ
۳۔ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ
۴۔ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ
۵۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ؕ
۶۔ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ
۷۔ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ
۸۔ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۧ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خُدا کے نام سے

۱۔ تفاخر و تکاثر نے تمہیں اپنے حال میں مشغول رکھا۔ (اور اس نے تمہیں خدا سے غافل کر دیا)۔
۲۔ یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت کے لیے گئے۔ (اور تم نے اپنے مُردوں کی قبریں شمار کیں)۔
۳۔ ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم نے خیال کر لیا ہے، تم جلدی ہی (اصل حقیقت کو) جان لوگے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ
۲۔ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ
۳۔ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ
۴۔ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ
۵۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ؕ
۶۔ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ
۷۔ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ
۸۔ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۧ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خُدا کے نام سے

۱۔ تفاخر و تکاثر نے تمہیں اپنے حال میں مشغول رکھا۔ (اور اس نے تمہیں خدا سے غافل کر دیا)۔
۲۔ یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت کے لیے گئے۔ (اور تم نے اپنے مُردوں کی قبریں شمار کیں)۔
۳۔ ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم نے خیال کر لیا ہے، تم جلدی ہی (اصل حقیقت کو) جان لوگے۔

۴۔ ہرگز ایسا نہیں ہے جیسا کہ تمہارا خیال ہے، یہ جلدی ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

۵۔ اس طرح نہیں ہے جس طرح تم خیال کرتے ہو، اگر تم آخرت کا علم الیقین رکھتے ہوتے (تو ان موہومات اور فخر و مباہات کے پیچھے نہ لگتے)۔

۶۔ تم یقیناً جہنم کو دیکھو گے۔

۷۔ پھر (اس میں وارد ہو کر) اس کو عین الیقین کے ساتھ مشاہدہ کرو گے۔

۸۔ پھر اس دن تم سب سے ان نعمتوں کے بارے میں جو تمہیں دی گئی تھیں، سوال کیا جائے گا۔

شانِ نزول

جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سورہ ان قبائل کے بارے میں نازل ہوا ہے جو ایک دوسرے پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے اور اپنی جمعیت، افراد کی کثرت یا مال و دولت کی زیادتی کے باعث ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے، یہاں تک کہ اپنے قبیلہ کے افراد کی تعداد کو بڑھانے کے لیے قبرستان میں جاتے تھے اور ہر قبیلہ کی قبریں شمار کرتے تھے۔

البتہ بعض مفسرین تو اس کو مکہ میں قریش کے دو قبیلوں کے بارے میں سمجھتے ہیں، اور بعض مدینہ میں انصارِ پیغمبرؐ کے بارے میں اور بعض یہودیوں کے دوسرے لوگوں پر فخر کرنے کے بارے میں۔ اگرچہ اس کا مکمل ہونا صحیح نظر آتا ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ شانِ نزول چاہے جو کچھ بھی ہو آیت کے مفہوم کو ہرگز محدود نہیں کرتی۔

تفسیر

تکاثر و تفاخر کی مصیبت

ان آیات میں پہلے ملامت بھرے لہجہ میں فرماتا ہے: "تفاخر اور ایک دوسرے پر کثرت رکھنے کے خیال نے تمہیں خدا اور قیامت سے غافل کر کے اپنی طرف مشغول کر دیا ہے" (الھاکم التکاثر)۔

"یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت اور دیدار کے لیے بھی گئے اور تم نے اپنے مردوں کی قبروں کو شمار کیا" (حتّٰی زرتم المقابر)۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ " تکاثر " اور " تفاخر " نے انہیں اس طرح سے اپنی طرف مشغول کر لیا ہے کہ وہ قبروں میں وارد ہونے کے لمحہ تک جاری و ساری ہے۔

لیکن پہلا معنی " زرتم المقابر " کی تعبیر، اور اسی طرح شانِ نزول اور نہج البلاغہ کے خطبہ کے ساتھ، جس کی طرف انشاء اللہ بعد میں اشارہ ہوگا، زیادہ سازگار ہے۔

" الھاکم " " لھو " کے مادہ سے، چھوٹے چھوٹے کاموں میں مشغول ہو جانا، اور اہم مقاصد اور کاموں سے غافل رہنے کے معنی میں ہے۔ " راغب " " مفردات " میں کہتا ہے " لھو " اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو اپنی طرف مشغول رکھتے ہوئے اس کے اہداف و مقاصد سے اسے باز رکھتی ہے۔

" تکاثر " " کثرت " کے مادہ سے، تفاخر اور مباہات اور ایک دوسرے پر اپنی بڑائی جتلانے کے معنی میں ہے۔[1]

" زرتم " " زیارۃ " اور " زور " (بروزن قول) کے مادہ سے اصل میں سینہ کے اُوپر والے حصہ کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد ملاقات کرنے اور رُوبرو ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اور " زور " (بروزن قر) سینہ کے اُوپر والے حصہ کے ٹیڑھا ہو جانے کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ جھوٹ ایک قسم کا حق سے انحراف ہے اس لیے اس پر " زور " (بروزن نور) کا اطلاق ہوتا ہے۔

" مقابر " " مقبرۃ " کی جمع ہے جو میت کی قبر کی جگہ کے معنی میں ہے اور یہاں قبروں کی زیارت کرنا یا تو (بعض تفاسیر کے مطابق) موت سے کنایہ ہے یا شمار کرنے اور فخر و مباہات کرنے کے لیے قبروں کے پاس جانے کے معنی میں ہے (جو اس کی مشہور تفسیر کے مطابق ہے)۔

اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے دوسرا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے اور اس کے شواہد میں سے ایک امیرالمؤمنین علی علیہ السلام کا وہ کلام ہے جو اس سلسلہ میں نہج البلاغہ میں آیا ہے، جو آپ نے " الھاکم التکاثر حتّٰی زرتم المقابر " کے بعد فرمایا ہے:

" یالہ مرامًا ما ابعدہ؛ وزورًا ما اغفلہ؛ وخطرًا ما افظعہ؛ لقد استخلوا منھوای مدّکر وتناوشوھم من مکان بعید افبمصارع آبائھم یفخرون؛ ام بعدید الھلکی یتکاثرون؛ یرتجعون منھم اجسادًا خوت، وحرکات سکنت، ولان یکونوا عبرًا احق من ان یکونوا مفتخرًا!":

"تعجب ہے وُہ مقصد سے کتنے زیادہ دُور ہیں اور کیسے غافل زیارت کرنے والے ہیں؛ اور کیسا موہوم اور رُسوا کرنے والا

---

[1] فارسی کے روز مرّہ کے استعمالات میں " تکاثر " دولت جمع کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، حالانکہ یہ معنی لغت کی اصل کے اعتبار سے نہیں ہے۔ لیکن بعض روایات میں جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے، اس قسم کا استعمال ہوا ہے۔

افتخار ہے؛ ایسے افراد کی بوسیدہ ہڈیوں کی یاد میں بڑے ہوئے ہیں جو سالہاسال سے مٹی ہو چکے ہیں اور وہ یاد بھی کیسی؛ اتنے دُور دراز کے فاصلہ پر ایسے لوگوں کی یاد میں پڑے ہیں جو ان کی حالت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ کیا وہ اپنے آباؤ اجداد کی نابودی کی جگہ پر فخر کرتے ہیں یا اپنے مُردوں اور معدومین کی تعداد کو شمار کرکے خُود کو بہت زیادہ سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے جسموں کی بازگشت کے خواہاں ہیں جن کا تار و پود بکھر چکا ہے اور جن کی حرکتیں ختم ہو چکی ہیں، یہ بوسیدہ جسم اگر عبرت کا باعث ہوں تو وہ اس سے زیادہ سزاوار ہیں کہ موجب افتخار ہوں۔[1]

یہ خطبہ جس کے صرف ایک حصّہ کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اس قدر ہلا دینے والا گویا و صریح ہے کہ "ابن ابی الحدید معتزلی" کہتا ہے کہ: مَیں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کی تمام اُمتیں قسم کھاتی ہیں کہ مَیں نے پچھلے پچاس سال سے لے کر آج تک اس خطبہ کو ایک ہزار بار پڑھا ہے، اور ہر بار میرے دل میں ایک نیا لرزہ و خوف اور ایک نئی پند و نصیحت پیدا ہوئی ہے، اور اس نے میری رُوح کے اندر ایک شدید اثر چھوڑا ہے اور میرے اعضاء و جوارح لرزنے لگے، اور کبھی ایسا نہیں ہوا، کہ میں اس میں غور و فکر کروں اور اس حال میں اپنے خاندان، عزیزوں اور دوستوں کی موت کو یاد نہ کروں، اور ٹھیک میرے سامنے یہ بات مجسّم ہو جاتی تھی کہ مَیں وہی ہوں جس کی امام نے وضاحت کی ہے۔

اس سلسلے میں کتنے ہی واعظوں، خطباء، سُخن وروں اور فصیح افراد نے گفتگو کی ہے، اور مَیں نے انہیں کان لگا کر سُنا ہے اور ان کی باتوں میں غور و فکر کیا ہے، کسی ایک میں بھی میں نے کلام امامؑ والی تاثیر نہیں پائی۔

یہ تاثیر جو ان کا کلام میرے دل میں چھوڑتا ہے، یا تو اس کا سرچشمہ وہ ایمان ہے جو اس کا کہنے والا رکھتا ہے، یا اس کے یقین و اخلاص والی نیّت اس بات کا سبب بن گئی ہے کہ وہ اس طرح ارواح میں نفوذ کرے اور دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔[2]

"ابن ابی الحدید" اپنی گفتگو کے ایک اور حصّہ میں کہتا ہے:

"ینبغی لو اجتمع فصحاء العرب قاطبة فی مجلس و تلی علیهم ان یسجدوا له!":

"یہ خطبہ اس لائق ہے کہ، اگر فصحائے عرب سب کے سب کسی مجلس میں جمع ہوں اور یہ خطبہ ان کے سامنے پڑھا جائے، تو وہ اس کے سامنے سجدہ کریں۔"

اور اسی مقام پر امیرالمومنین علی علیہ السّلام کی فصاحت کے بارے میں معاویہ کی گفتگو کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ یہ کہتا ہے:

"واللّٰه ما سنّ الفصاحة لقریش غیره":

"خُدا کی قسم قریش کے لیے علیؑ کے سوا کسی نے فصاحت و بلاغت کی بُنیاد نہیں رکھی۔"

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۱۔

[2] "شرح نہج البلاغہ" "ابن ابی الحدید" جلد ۱۱ ص ۱۵۳

بعد والی آیت میں ان لوگوں کو اس بات کے ساتھ سختی سے تہدید کرتے ہوئے فرماتا ہے: " ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم گمان کرتے ہو، اور تم اس کے ذریعے ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرتے ہو۔ تم عنقریب اپنے اس موہوم تفاخر کا نتیجہ دیکھ لوگے۔" (کلا سوف تعلمون)۔

پھر دوبارہ مزید تاکید کے لیے کہتا ہے: " پھر بھی اس طرح نہیں ہے جس طرح تم خیال کرتے ہو۔ عنقریب تم جان لوگے۔" (ثم کلا سوف تعلمون)۔

مفسرین کی ایک جماعت نے ان دونوں آیتوں کو ایک ہی مطلب کی تکرار اور تاکید سمجھا ہے اور یہ دونوں ہی سربستہ طور پر اُن عذابوں کی خبر دیتی ہیں، جو ان متفاخر متکبرین کے انتظار میں ہے۔

جب کہ بعض دوسروں نے پہلی آیت کو عذاب قبر اور عذاب برزخ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جس سے انسان موت کے بعد رُوبرو ہوگا اور دوسری کو عذاب قیامت کی طرف۔

ایک حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"مازلنا نشك فی عذاب القبر حتّٰی نزلت الهاکم التکاثر، الی قوله کلا سوف تعلمون، یرید فی القبر، ثم کلا سوف تعلمون بعد البعث"

" ہم میں سے ایک گروہ ہمیشہ عذاب قبر کے بارے میں شک کیا کرتا تھا یہاں تک کہ سورہ " الهاکم التکاثر" نازل ہوئی، یہاں تک کہ فرماتا ہے: "کلا سوف تعلمون" اس سے مراد عذاب قبر ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے: "ثم کلا سوف تعلمون" اس سے مراد قیامت کا عذاب ہے۔"[1]

تفسیر کبیر فخر رازی میں یہ مطلب علی علیہ السلام کے ایک صحابی " زر بن حبیش" سے نقل ہوا ہے۔ جو کہتا ہے کہ:

" ہم عذاب قبر کے بارے میں شک کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ ہم نے علی علیہ السلام سے سُنا کہ آپؑ فرماتے ہیں:

" یہ آیت عذاب قبر پر دلیل ہے۔"[2]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: " ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم ایک دوسرے پر فخر کرنے والے خیال کرتے ہو۔ اگر تمہارا آخرت پر ایمان ہوتا اور علم الیقین کے ساتھ اُسے جان لیتے، تو ہرگز ایسا کام نہ کرتے اور ان باطل مسائل پر فخر و مباہات کرنے سے باز آتے۔ (کلا لو تعلمون علم الیقین)[3]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۴۴

[2] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۴۸۷

[3] بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر لفظ "کلا" تاکید کے لیے ہوتا ہے اور "حقاً" کے معنی میں ہوتا ہے، یہ بات طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ " العرب تؤکد بکلا وحقاً" عرب لفظ کلا اور حقا سے تاکید کرتے ہیں۔

پھر دوبارہ تاکید اور مزید ڈرانے کے لیے اضافہ کرتا ہے : تم یقینی طور پر جہنم کو دیکھو گے" (لترون الجحیم)۔

" پھر اس میں داخل ہو کر عین الیقین کے ساتھ اس کا مشاہدہ کرو گے" (ثم لترونها عین الیقین)۔

" پھر اس دن تم سے ان نعمتوں کے بارے میں، جو تمہیں دی گئی تھیں، سوال کیا جائے گا" (ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم)۔

اس دن تمہیں اس بات کی وضاحت کرنی پڑے گی کہ تم نے ان خداداد نعمتوں کو کس طریقہ سے صَرف کیا ہے ؟ اور ان سے تم نے خدا کی اطاعت کے لیے مدد لی ہے یا اس کی معصیت کے لیے، یا ان نعمتوں کو ضائع کر کے ہرگز ان کا حق ادا نہیں کیا ہے ؟

چند نکات

۱۔ تفاخر کا سَرچشمہ

اُوپر والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تفاخر اور ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرنے کے عوامل اصل میں ایک دینی جزا و سزا کے بارے میں جہالت و نادانی اور معاد کے بارے میں ایمان کا نہ ہونا ہے۔

اس کے علاوہ انسان کا اپنی پیدائش کے آغاز سے لے کر انجام تک، اپنی کمزوریوں اور مصیبتوں سے بے خبر رہنا بھی کبر و غرور اور تفاخر کے عوامل میں سے ایک عامل ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید اس تفاخر و تکاثر کو توڑنے کے لیے گزشتہ اقوام کی سرگزشت کو مختلف آیات میں بیان کرتا ہے کہ یہ قومیں اتنے امکانات اور فراواں قدرت رکھنے کے باوجود اتنے سادہ اور عام قسم کے وسائل کے ذریعے کس طرح سے نابُود ہو گئیں۔

ہواؤں کے چلنے سے آسمانی بجلی (صاعقہ) کے کوندنے سے، زمین کے ایک زلزلہ سے، حد سے زیادہ بارش کے برسنے سے، خلاصہ یہ ہے کہ پانی، ہوا اور مٹی سے اور بعض اوقات "سجیل" (کنکریوں) اور چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے نابود ہو گئے۔

اِن حالات میں یہ سب تفاخر و غرور کس لیے ہے ؟

اس بات کے لیے دوسرا عامل وہی ضعف و حقارت کا احساس ہے جو ناکامیوں اور شکستوں سے پیدا ہوتا ہے کہ کچھ افراد اپنی شکستوں کی پردہ پوشی کے لیے تفاخر و مباہات کی پناہ لیتے ہیں۔ اسی لیے ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے :

"ما من رجل تکبّر او تجبّر الّا لذلة وجدها فی نفسه "

" کوئی شخص تکبّر اور فخر و مباہات نہیں کرتا مگر اس ذلّت کی وجہ سے جسے وہ اپنے نفس کے اندر پاتا ہے"[1]

لہٰذا جب وہ یہ احساس کرتا ہے کہ وہ حد کمال کو پہنچ گیا ہے، تو پھر وہ تفاخر کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔

---

[1] "اصول کافی" جلد ۲ ص ۲۳۶ باب الکبر حدیث ۱۷

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے :

" ثلاثة من عمل الجاهلية ، الفخر بالانساب ، والطعن فی الاحساب والاستسقاء بالانواء "

" تین چیزیں ایسی ہیں جو زمانۂ جاہلیت کے عمل میں سے ہیں، نسب پر فخر کرنا، لوگوں کی شخصیت اور خاندانی شرافت میں طعن کرنا اور ستاروں کے ذریعے بارش طلب کرنا "[1]

ایک اور حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام سے آیا ہے :

" اهلك الناس اثنان : خوف الفقر، وطلب الفخر "

" دو چیزوں نے لوگوں کو ہلاک کیا : فقر و فاقہ کا خوف (جو انسان کو ہر طریقہ اور ہر ذریعہ سے مال جمع کرنے پر اُبھارتا ہے) اور ایک دوسرے پر فخر کرنا "[2]

اور حقیقتاً حرص، بُخل ، دُنیا پرستی اور تباہ کرنے والی رقابتوں اور بہت سے اجتماعی مفاسد کے اہم ترین عوامل میں سے ایک یہی فقر و فاقہ کا بلاوجہ خوف اور افراد و قبائل اور اُمتوں کے درمیان ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرنا اور برتری کا اظہار کرنا ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

" ما اخشی علیکم الفقر، ولکن اخشی علیکم التکاثر "

" مَیں تم پر فقر و فاقہ سے نہیں ڈرتا، لیکن مَیں تمہارے تکاثر و تفاخر سے ڈرتا ہوں "[3]

" تکاثر " جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے اصل میں تفاخر کے معنی میں ہے ، لیکن بعض اوقات یہ زیادہ طلب اور مال جمع کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے :

" التکاثر، (فی) الاموال جمعها من غیر حقها، ومنعها من حقها، وشدها فی الاوعیة "

" تکاثر، غیر شرعی طریقہ سے مال جمع کرنا ، اور اس کا حق ادا نہ کرنا اور اُسے صندوقوں اور خزانوں میں جمع کرنا ہے "[4]

ہم اس وسیع بحث کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک پُر معنی حدیث پر ختم کرتے ہیں، جو آپ نے " الھاکم التکاثر " کی تفسیر میں بیان فرمائی ہے :

" یقول ابن آدم مالی مالی ، ومالك من مالك الا ما اکلت فافنیت او

---

[1] " بحارالانوار " جلد ۷۳، ص ۲۹۱

[2] " بحارالانوار " جلد ۷۳، ص ۲۹۰ حدیث ۱۲

[3] " الدرالمنثور " جلد ۶ ص ۳۸۷

[4] " نورالثقلین " جلد ۵ ص ۶۶۲ حدیث ۸

لبست فابليت او تصدقت فامضيت .

" انسان کہتا ہے : میرا مال ، میرا مال ، حالانکہ تیرا مال تو صرف وہ غذا ہے جو تو کھاتا ہے، وہ لباس جو تُو پہنتا ہے اور وہ صدقات ہیں جو تو راہِ خدا میں دیتا ہے ۔ "[1]

اور یہ ایک بہت ہی عمدہ نکتہ ہے کہ اس فراواں مال میں سے ہر شخص کا حصہ، جسے وہ جمع کرتا ہے، اور اس کے حلال و حرام ہونے کے بارے میں کبھی تھوڑی سی دیر کے لیے بھی غور و فکر نہیں کرتا ، اس تھوڑے سے کھانے پینے ، پہننے اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے ، اور ہم جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے وہ بہت ہی کم، حقیر اور نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور کیا ہی اچھا ہو کہ وہ راہِ خدا میں خرچ کرنے میں اپنا حصہ زیادہ کرے ۔

۲۔ یقین اور اس کے مراحل

یقین " " شک " کا نقطۂ مقابل ہے، جیسا کہ علم ، جہالت کا نقطۂ مقابل ہے، اور کسی چیز کے واضح اور ثابت ہونے کے معنی میں آیا ہے۔ اور اختیار و روایات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کے مطابق ایمان کے اعلیٰ مرحلہ کو یقین کہا جاتا ہے ۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا :

" ایمان اسلام سے ایک درجہ بالاتر ہے ، اور تقویٰ ایمان سے ایک درجہ بالاتر ہے اور یقین تقویٰ سے ایک درجہ بالاتر ہے۔ اس کے بعد آپؑ نے فرمایا :

" ولم يقسم بين الناس شيء اقل من اليقين "

" لوگوں میں یقین سے کمتر کوئی چیز تقسیم نہیں ہوئی ہے "۔

راوی نے سوال کیا : یقین کیا ہے ؟ امامؑ نے فرمایا :

" التوكل على الله، والتسليم لله ، والرضا بقضاء الله ، والتفويض الى الله "

" یقین کی حقیقت اللہ پر توکل کرنا ، اللہ کی پاک ذات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ، قضائے الٰہی پر راضی رہنا اور اپنے تمام کاموں کو خدا کے سپرد کر دینا ہے "[2]

مقام تقویٰ و ایمان و اسلام سے مقام یقین کی برتری ایک ایسی چیز ہے جس پر دوسری روایات میں بھی تاکید ہوئی ہے[3] ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے :

" من صحة يقين المرأ المسلم ان لا يرضى الناس بسخط الله ولا يلومهم على ما لم يؤته الله ... ان الله بعدله وقسطه جعل الروح

---

[1] " صحیح مسلم " (مطابق نقل مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۵۲۴)

[2] " بحار الانوار " جلد ۷۰ ص ۱۳۸ حدیث ۴

[3] " بحار الانوار " جلد ۷۰ ص ۱۳۵ ۔ ۱۳۷ ۔

والراحة فی الیقین والرضا وجعل الهم والحزن فی الشک والسخط ،

"مرد مسلمان کے یقین کے صحیح ہونے کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وُہ خدا کو ناراض کرکے لوگوں کو راضی نہ کرے اور جو کچھ خُدا نے اُسے نہیں دیا اس پر لوگوں کو ملامت نہ کرے (انہیں اپنی محرومیوں کا ذمہ دار نہ ٹھہرائے) خدا نے اپنے عدل و انصاف کی بنا پر راحت و آرام ، یقین و رضا میں رکھا ہے ، اور غم و اندوہ کو شک اور ناراضی میں قرار دیا ہے"[1]!

ان تعبیرات اور دوسری تعبیروں سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جب انسان یقین کے مقام تک پہنچ جاتا ہے تو ایک خاص قسم کا سکون و آرام اس کے سارے دل و جان میں سرایت کر جاتا ہے ۔

لیکن اس کے باوجود یقین کے لیے کئی مراتب ہیں جن کی طرف اُوپر والی آیات اور سُورۂ واقعہ کی آیہ (انّ هٰذا لهو حق الیقین) میں اشارہ ہوا ہے ، اور وہ تین مرحلہ ہیں[2]

۱۔ علم الیقین : یہ ہے کہ انسان مختلف دلائل سے کسی چیز پر ایمان لائے ، اس شخص کے مانند جو دھوئیں کو دیکھ کر آگ کے ہونے پر ایمان لے آتا ہے ۔

۲۔ عین الیقین : اس مقام پر حاصل ہوتا ہے جب انسان مشاہدہ کے مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے ، اور اپنی آنکھ سے مثلاً کسی آگ کو دیکھ لے ۔

۳۔ حق الیقین : اور وہ اس شخص کے مانند ہے جو آگ میں داخل ہو جائے ، اور اس کی سوزش اور حرارت کو لمس کرے ، اور یہ یقین کا بالاترین مرحلہ ہے ۔

محقق طوسی اپنی ایک گفتگو میں کہتے ہیں : "یقین" وہی پُختہ ، اور ثابت اعتقاد ہے ، جس کا زوال ممکن نہیں ہے اور حقیقت میں وہ دو علموں سے مرکب ہے ۔ ایک معلوم کے متعلق علم ، اور دوسرا یہ علم کہ اس علم کے خلاف محال ہے ، اور اس کے کئی مراتب ہیں ۔ "علم الیقین" و "عین الیقین" و "حق الیقین"[3]

حقیقت میں پہلا مرحلہ عمومی پہلو رکھتا ہے اور دوسرا مرحلہ پرہیزگاروں کے لیے ہے اور تیسرا مرحلہ خواص اور مقربین کے ساتھ مخصوص ہے ۔

اسی سے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں صحابہ نے عرض کیا : ہم نے سُنا ہے کہ عیسٰی علیہ السلام کے بعض اصحاب پانی پر چلتے تھے ؟! آپ نے فرمایا :

"لو کان یقینه اشد من ذالك لمشی علی الهواء" :

"اگر اس کا یقین اس سے زیادہ پختہ اور محکم ہوتا تو وہ ہوا پر چلتا"!

---

[1] "بحارالانوار" جلد ۷۰ ص ۱۴۳

[2] "مطابق نقل بحارالانوار" جلد ۷۰ ص ۱۴۳

مرحوم " علامہ طباطبائی " اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد مزید کہتے ہیں : تمام چیزیں خداوند سُبحان پر یقین اور عالم تکوین کے اسباب کی تاثیر کے استقلال کو محو کرنے کے محور کے گرد گھومتی ہیں، اس بنا پر انسان کا قدرت مطلقہ الٰہیہ پر اعتقاد ایمان جتنا زیادہ ہوگا، اشیاء عالم اُسی نسبت سے اُس کے سامنے مطیع و منقاد ہو جائیں گی۔[1]

اور عالم آفرینش میں یقین اور خارق العادت تصرف کے رابطہ کی یہی رمز ہے۔

۳۔ سَب لوگ دوزخ کا مشاہدہ کریں گے

" لترون الجحیم " کے جملہ کی دو تفسیریں ہیں. پہلی یہ کہ اس سے مُراد آخرت میں دوزخ کا مشاہدہ کرنا ہے جو کفار کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور یا یہ تمام جن و انس کے لیے عام ہے، کیونکہ قرآن کی بعض آیات کے مطابق سب کو ہی جہنّم کے پاس سے گُزرنا پڑے گا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد اسی عالم دنیا میں شہودِ قلبی ہے ، اور اس صُورت میں یہ جُملہ قضیہ شرطیہ کا جواب ہے فرماتا ہے : " اگر تم " علم الیقین " رکھتے ہوتے تو " جہنّم " کو اسی عالم میں دل کی آنکھ سے مشاہدہ کر لیتے " کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بہشت دوزخ اَب بھی خلق شدہ موجود ہیں، اور وجودِ خارجی رکھتی ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ پہلی تفسیر بعد والی آیات کے ساتھ، جو روزِ قیامت کی بات کر رہی ہیں، زیادہ مناسب ہے۔ اس بنا پر یہ ایک قطعی اور غیر مشروط قضیہ ہے۔

۴۔ قیامت میں کون سی نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا ؟

اس سورہ کی آخری آیت میں آیا ہے کہ یقینی طور پر تم سب سے قیامت کے دن نعمتوں کے بارے میں بازپُرس ہوگی۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس نعمت سے مراد " سلامتی " اور " فراغتِ خاطر " ہے، اور بعض اسے " تندرستی " اور " امن و امان " سمجھتے ہیں، اور بعض نے تمام ہی نعمتوں کو اس آیت کا مشمول سمجھا ہے۔

ایک حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام سے آیا ہے :

" النعیم الرطب ، والماء البارد "

" نعیم سے مراد تازہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی ہے "۔

جب کہ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ " ابوحنیفہ " نے " امام جعفر صادق علیہ السلام " سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا تو امام علیہ السلام نے اس کے سوال کو اسی کی طرف پلٹا کر فرمایا : تیرے نظریہ کے مطابق نعیم سے کیا مراد ہے " ؟ اس نے عرض کیا : غذا ہے اور کھانا اور ٹھنڈا پانی ہے " آپؑ نے فرمایا : اگر خدا قیامت کے دن تجھے اپنی بارگاہ میں اس لیے کھڑا کرے کہ وہ ہر اس لقمہ کا جو تو نے کھایا ہے، اور ہر اُس گھونٹ کا جو تُو نے پیا ہے، تجھ سے سوال کرے، پھر تو تجھے

---

[1] " المیزان " جلد ۲ ص ۲۰۰ (سورۂ مائدہ کی آیہ ۱۰۵ کے ذیل میں)۔

وہاں بہت زیادہ دیر تک ٹھہرنا پڑے گا"! اس نے عرض کیا: پھر نعیم کیا ہے"؟

آپ نے فرمایا: "وہ ہم اہل بیت ہیں کہ خدا نے ہمارے وجود کے ذریعے اپنے بندوں کو نعمت عطا کی ہے اور ان کے درمیان اختلاف کے بعد اُلفت بخشی ہے، ان کے دلوں کو ہماری وجہ سے آپس میں جوڑ دیا ہے اور انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنایا جب کہ وہ ایک دوسرے کے دُشمن تھے۔ اور ہمارے ہی ذریعے سے انہیں اسلام کی طرف ہدایت کی ہے"۔۔۔۔ ہاں! نعیم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیتؑ ہی ہیں"۔[1]

ان روایات کی تفسیر، جو ظاہراً مختلف ہیں، جو تمام مواہب الٰہی کو، چاہے وہ معنوی ہوں جیسے دین، ایمان، اسلام و قرآن اور ولایت یا انواع و اقسام کی انفرادی و اجتماعی نعمتیں ہوں، ان سب کو شامل ہے۔

البتہ جو نعمتیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں مثلاً نعمتِ "ایمان و ولایت" تو ان کے بارے میں زیادہ سوال ہوگا کہ ان کا حق ادا ہوا ہے یا نہیں؛ اور ظاہراً وہ روایات جو اس آیت کے مادّی نعمتوں کے شمول کی نفی کرتی ہیں وہ اس معنی میں ہیں کہ تمہیں اہم تر مصادیق کو چھوڑ کر بہت ہی چھوٹے مصادیق کی طرف نہیں جانا چاہیئے۔ اور حقیقت میں یہ لوگوں کو خدائی نعمتوں اور مواہب کے مراتب کے سلسلے میں ایک تنبیہ ہے کہ ان کے لیے ان سے بہت ہی سخت قسم کی باز پُرس ہوگی۔

اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ان نعمتوں کے بارے میں سوال نہ ہو حالانکہ یہ بہت ہی بڑے سرمائے ہیں جو نوع بشر کے اختیار میں دیے گئے ہیں۔ اور انہیں ان میں سے ہر ایک کی بڑی باریکی کے ساتھ قدردانی کرنی چاہیئے اور ان کا شکر بجا لانا چاہیئے۔ اور انہیں ان کے صحیح موارد میں صَرف کرنا چاہیئے۔

خداوندا! تو اپنی بے انتہا نعمتوں کو، خصوصاً ایمان و ولایت کی نعمت کو ہمیشہ ہمیشہ ہم پر جاری رکھ۔

پروردگارا! ہمیں ان تمام نعمتوں کے حق کی ادائیگی کی توفیق مرحمت فرما۔

بارِ الٰہا! ہم پر ان عظیم نعمتوں میں اضافہ کرتا رہ، اور انہیں ہرگز ہم سے سلب نہ کرنا۔

❖ ❖ ❖

آمین یا ربّ العالمین

سورہ تکاثر کا اختتام

اختتام ترجمہ

۱۱ منٹ کم ایک بجے شب

۲۶ رمضان ۱۴۰۸ھ

برمکان حقیر قم مقدسہ ایران

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۳۵

سُورَۂ وَالعَصر

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا۔

❖ اس میں ۳ آیات ہیں۔

سُورۂ "والعصر" کے مطالب اور اس کی فضیلت

مشہور یہ ہے کہ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا ہے اگرچہ بعض نے مدنی ہونے کا احتمال بھی ظاہر کیا ہے لیکن سُورہ کی آیات کے چھوٹے چھوٹے مقاطع اور اس کا لب ولہجہ اس کے مکّی ہونے کا شاہد ہے۔

بہرحال اس سُورہ کی جامعیت اس حد تک ہے کہ بعض مفسّرین کے قول کے مطابق قرآن کے تمام علوم و مقاصد کا خلاصہ اس سورہ میں موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سُورہ نے مختصر ہونے کے باوجود انسان کی سعادت و خوش بختی کا ایک مکمل اور جامع پروگرام پیش کیا ہے۔

سب سے پہلے "عصر" کی معنی خیز قسم سے شروع ہوتا ہے، جس کی تفسیر عنقریب پیش کی جائے گی۔ اس کے بعد تمام انسانوں کے زیاں کار اور خسارے میں ہونے کی گفتگو ہے جو تدریجی زندگی کی فطرت میں پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد صرف ایک گروہ کو اس اصل کلی سے جُدا کرتا ہے، جو ذیل کی چار خصوصیات والے پروگرام کے حامل ہیں:

۱۔ ایمان۔ ۲۔ عملِ صالح۔ ۳۔ ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرنے والے۔

۴۔ ایک دُوسرے کو صبر کی وصیت کرنے والے، اور حقیقتاً یہ چار اصول اسلام کے اعتقادی و عملی، اور انفرادی و اجتماعی پروگراموں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ اس سُورہ کی فضیلت کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السّلام سے ایک حدیث میں آیا ہے:

"من قرأ "والعصر" فی نوافله بعثه الله یوم القیامة مشرقاً وجهه ضاحکاً سنّه قریرة عینه حتّی یدخل الجنّة"

"جو شخص سُورۂ "والعصر" کو نافلہ نمازوں میں پڑھے گا، خدا اُسے قیامت کے دن اس حالت میں اُٹھائے گا کہ اس کا چہرہ نورانی، لب خنداں، اور اس کی آنکھ خدا کی نعمتوں سے روشن اور ٹھنڈی ہوگی یہاں تک کہ وہ جنّت میں داخل ہوگا۔"[1]

اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یہ سب اعزاز و افتخار اور سرور و شادمانی اس شخص کے لیے ہے، جو اپنی زندگی میں ان چار اصولوں پر عمل کریگا، نہ کہ صرف پڑھنے پر ہی قناعت کرلے۔

---

[1] "تفسیر مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۴۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ وَالْعَصْرِ ۝
۲۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝
۳۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خُدا کے نام سے

۱۔ قَسم ہے عصر کی ۔
۲۔ کہ سب انسان خسارے میں ہیں ۔
۳۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیے ہیں ، ایک دُوسرے کو حق کی وصیّت و نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر و استقامت کی وصیّت کی ۔

تفسیر

نجات کی صرف ایک راہ

اِس سُورہ کی ابتدا میں ہم ایک نئی قَسم سے رُوبرو ہو رہے ہیں ، فرماتا ہے : " عصر کی قسم " (والعصر) ۔

"عصر" کا لفظ اصل میں نچوڑنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد اس کا وقت عصر پر اطلاق ہونے لگا کیونکہ اس میں روزانہ کے پروگراموں اور کاموں کو لپیٹ کر مختصر کر دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد یہ لفظ مطلق "زمانہ" اور تاریخ بشر کے دور یا زمانے کے ایک حصہ، جیسے ظہورِ اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قیام کے زمانے، اور اسی قسم کے دوسرے زمانوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی لیے اس قسم کی تفسیر میں مفسرین نے بہت زیادہ احتمال دیے ہیں۔

۱۔ بعض تو اسے اسی وقت "عصر" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، اس قرینہ سے کہ قرآن کی بعض دوسری آیات میں دن کے آغاز کی قسم کھائی گئی ہے مثلاً: "والضحیٰ" (سورہ ضحیٰ آیہ ۱) یا "والصبح اذا اسفر" (مدثر۔ ۳۴)

یہ قسم اس اہمیت کی بنا پر ہے جو دن کے اس موقع کو حاصل ہے کیونکہ یہ وقت انسانوں کی حیات اور نظامِ زندگی کے خاتمے کا وقت ہوتا ہے، دن کے کام اپنے انجام کو پہنچتے ہیں، پرند و چرند اپنے اپنے آشیانوں اور ٹھکانوں کو لوٹتے ہیں، سورج اُفقِ مغرب میں اپنا سر چھپا لیتا ہے اور فضا بتدریج تاریک ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہ اختتام اور تغیر انسان کو خدا کی لا یزال قدرت کی طرف ــ جو اس نظام پر حاکم ہے ــ متوجہ کرتا ہے اور حقیقت میں یہ توحید کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور پروردگار کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے جو قسم کے لائق ہے۔

۲۔ بعض دوسروں نے اسے تمام زمانے اور تاریخ بشریت کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جو درسہائے عبرت، ہلا دینے والے حوادث اور بیدار کرنے والے واقعات سے پُر ہے، اور اسی بنا پر ایسی عظمت رکھتا ہے کہ خدا کی قسم کے لائق ہے۔

۳۔ اور بعض نے زمانے کے ایک خاص حصہ کو، جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قیام کا زمانہ یا مہدی علیہ السلام کے قیام کا زمانہ۔ جو تاریخ بشر میں خصوصیت اور مخصوص عظمت کا حامل ہے، مراد لیا ہے اور قسم کو اسی کے بارے میں سمجھتے ہیں۔[1]

۴۔ بعض نے اس لفظ کے لغوی ریشہ اور جڑ بنیاد کی طرف بھی خصوصی توجہ دی ہے اور اس قسم کو ان مشکلات اور دشواریوں کے بارے میں سمجھتے ہیں جو انسانوں کی طویل زندگی میں رونما ہوتے ہیں، انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہیں، انہیں خدائے عظیم کی یاد دلاتے ہیں اور روحِ استقامت کی پرورش کرتے ہیں۔

۵۔ بعض اسے کامل انسانوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو عالمِ ہستی اور جہانِ خلقت کا نچوڑ ہیں۔

۶۔ اور آخر میں بعض اسے "نمازِ عصر" کے بارے میں سمجھتے ہیں، اس خصوصی اہمیت کی بنا پر جو اُسے باقی نمازوں میں حاصل ہے کیونکہ وہ "صلاۃ وسطی" جس کے لیے قرآن میں خاص قسم کی تاکید کی گئی ہے، نمازِ عصر کو سمجھتے ہیں۔

اگرچہ اُوپر والی تفاسیر آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تضاد نہیں رکھتیں۔ اور ممکن ہے کہ وہ سب ہی آیت کے معنی میں جمع ہوں، اور ان تمام اہم امور کی قسم کھائی گئی ہو، لیکن ان سب میں سے، سب سے زیادہ مناسب، عصر کو زمانہ اور تاریخ بشر کے

---

[1] ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے کہ والعصر ان الانسان لفی خسر کی تفسیر میں فرمایا: العصر عصر خروج القائم عصر سے مراد حضرت مہدی (سلام اللہ علیہ) کے قیام کا زمانہ ہے۔ (نور الثقلین جلد ۵۔ ص ۶۶۶ حدیث ۵)

معنی میں لینا ہی نظر آتا ہے۔

کیونکہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآن کی قسمیں ہمیشہ اس مطلب کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے۔ اور مسلّمہ طور سے انسانوں کی زندگی میں زیان وخسارہ ان کی عمر کے زمانے کے گزرنے کا نتیجہ ہے، یا پیغمبر خاتمؐ کے قیام کا زمانہ۔ کیونکہ اس سورہ میں بیان کیے گئے چار اصولوں کا پروگرام اسی زمانہ میں نازل ہوا ہے۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے آیاتِ قرآنی کی عظمت اور اس کے مفاہیم کی وسعت اچھی طرح سے واضح ہوگئی ہے کہ ان میں سے ایک ہی لفظ کس حد تک پُرمعنی اور عمیق و گوناں گوں تفاسیر کے لائق ہے۔

بعد والی آیت میں اس چیز کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے یہ اہم قسم کھائی گئی ہے، فرماتا ہے: "یقینی طور پر تمام انسان خسارے میں ہیں" (ان الانسان لفی خسر)۔

وہ اپنے وجودی سرمائے کو، خواہ چاہیں یا نہ چاہیں، کھو بیٹھتے ہیں، عمر کی گھڑیاں، دن، مہینے اور سال تیزی کے ساتھ گزرتے چلے جاتے ہیں، معنوی اور مادی قوتیں تحلیل ہوجاتی ہیں اور طاقت و قدرت گھٹتی چلی جاتی ہیں۔

ہاں! انسان اس شخص کے مانند ہے جس کے پاس عظیم سرمایہ ہو اور اس کی مرضی اور خواہش کے بغیر اس سرمایہ کا ایک حصہ ہر روز اُس سے لے لیتے ہوں۔ یہ دنیا کی زندگی کا مزاج ہے، ہمیشہ کم ہوتے چلے جانے والا مزاج۔

ایک دل میں حرکت کرنے کی ایک معین استعداد ہوتی ہے، اور جب وہ استعداد اور طاقت ختم ہوجاتی ہے تو دل خود بخود رُک جاتا ہے، حالانکہ اس میں کوئی عیب، بیماری یا علت نہیں ہوتی، اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ وہ کسی بیماری کی وجہ سے پہلے ہی فیل نہ ہوجائے۔ انسانی وجود کے باقی کارخانوں، اور اس کی مختلف استعدادوں کے سرمایوں کا بھی یہی حال ہے۔

"خسر" (بروزن عسر) اور خسران" جیسا کہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے: سرمایہ کے کم ہونے کے معنی میں ہے۔ کبھی تو اس کی انسان کی طرف نسبت دی جاتی ہے اور یہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کو نقصان ہوگیا، اور بعض اوقات خود عمل کی طرف نسبت دی جاتی ہے اور یہ کہتے ہیں کہ اس کی تجارت میں نقصان ہوگیا۔ یہ لفظ عام طور پر خارجی سرمایوں مثلاً مال و مقام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات اندرونی سرمایوں، مثلاً صحت و سلامتی، عقل و ایمان اور ثواب کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور یہ وہی چیز ہے جسے خداوندِ عالم نے "خسران مبین" (واضح خسارہ) کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے: ان الخاسرین الذین خسروا انفسھم واھلیھم یوم القیامۃ الا ذالک ھو الخسران المبین" واقعی زیاں کار لوگ تو وہ ہیں جو قیامت میں اپنے وجود اور اپنے گھر والوں کے وجود کا سرمایہ ہاتھ سے دے بیٹھیں گے۔ جان لو کہ خسرانِ مبین (واضح خسارہ) یہی ہے۔ (زمر - ۱۵)۔[1]

فخر رازی اس آیت کی تفسیر میں ایک بات نقل کرتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ بزرگوں میں سے ایک کہتے ہیں کہ اس سورہ کا معنی میں نے ایک برف فروش شخص سے سیکھا ہے جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا: ارحموا من یذوب رأس مالہ ارحموا من یذوب رأس مالہ! اس شخص پر رحم کرو جس کا سرمایہ پگھلا جارہا ہے، اس شخص پر رحم کرو جس کی پونجی پگھل رہی ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا یہ ہے معنی ان الانسان لفی خسر کا: اس پر زمانہ گزرتا چلا جاتا ہے اور اس کی عمر ختم ہوجاتی ہے اور

---

[1] "مفرداتِ راغب" مادہ "خسر"

وہ کوئی ثواب حاصل نہیں کرتا ، اور وہ اس حال میں خسارے میں ہے۔ [1]

بہر حال اسلام کی جہاں بینی کے لحاظ سے دنیا ایک بازارِ تجارت ہے ، جیسا کہ ایک حدیث میں امام ہادی علی بن محمد النقی علیہ السلام سے آیا ہے :

" الدنیا سوق ربح فیھا قوم وخسر اٰخرون "

" دنیا ایک بازار ہے جس میں ایک گروہ نے نفع کمایا اور دوسری جماعت خسارے میں رہی "[2]

زیرِ بحث آیت کہتی ہے کہ اس عظیم بازار میں سبھی لوگ خسارے میں رہتے ہیں ، سوائے ایک گروہ کے جس کا پروگرام بعد والی آیت میں بیان ہوا ہے۔

ہاں ! اس عظیم خسارے اور قہری و جبری نقصان سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے ، صرف ایک ہی راہ جس کی طرف اس سورہ کی آخری آیت میں اشارہ ہوا ہے ، فرماتا ہے : " سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اعمالِ صالح انجام دیے ہیں ، اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت اور صبر و استقامت کی نصیحت کرتے ہیں " (الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر) ۔

دوسرے لفظوں میں جو چیز اس عظیم نقصان کو روک سکتی ہے اور اسے عظیم نفع میں تبدیل کر سکتی ہے ، یہ ہے کہ اس سرمائے کو ہاتھ سے دینے کے مقابلہ میں زیادہ گراں بہا اور زیادہ قیمتی سرمایہ حاصل کرے ، جس سے نہ صرف اس سرمایہ کی خالی جگہ پُر ہو گی بلکہ اس سے سینکڑوں اور ہزارہا گنا زیادہ اور بہتر ہو جائے گی۔

ہر وہ سانس جو انسان لیتا ہے ، اس سے موت کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے ، جیسا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام اپنی اس نورانی عبارت میں فرماتے ہیں :

" نفس المرء خطاہ الی اجلہ "

" انسان کا سانس موت کی طرف اس کا ایک قدم ہے " [3]

اس بنا پر انسان کے دل کی ہر حرکت اسے اختتام عمر سے ایک قدم اور زیادہ نزدیک کر دیتی ہے۔ اس طرح سے اس قطعی نقصان کے مقابلہ میں کوئی ایسا کام کرنا چاہیئے جس سے خالی جگہ پُر ہو جائے۔

ایک گروہ عمر اور زندگی کا نفیس سرمایہ ہاتھ سے دے دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں تھوڑا یا زیادہ مال ، معمولی گھر یا خوبصورت محل فراہم کر لیتا ہے۔

ایک گروہ اس تمام سرمائے کو ، مقام و منصب تک پہنچنے کے لیے ضائع کر دیتا ہے۔

اور کچھ لوگ اسے عیش و نوش اور جلدی گزر جانے والی لذتوں میں صَرف کر دیتے ہیں۔

---

[1] " تفسیر فخر رازی " جلد ۳۲ ص ۸۵

[2] " تحف العقول " ص ۳۶۱ (کلمات امام ہادی علیہ السلام)

[3] " نہج البلاغہ " کلمات قصار جلد ۷۴

مسلّمہ طور سے ان میں سے کوئی سی چیز بھی اس عظیم سرمایہ کی قیمت نہیں ہو سکتی، اس کی قیمت صرف اور صرف خدا کی رضا اور اس کا مقام قرب ہے۔

یا جیسا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"انه لیس لانفسکم ثمن الا الجنة فلا تبیعوها الا بها"

"تمہارے وجود کی قیمت جنّت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس کو اس سے کمتر کسی چیز کے بدلے میں بیچ دو"[1]

یا جیسا کہ ماہِ رجب کی دُعا میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

"خاب الوافدون علی غیرك وخسر المتعرضون الا لك"

"جو تیرے غیر کے پاس جائیں گے وہ مایوس ہو جائیں گے اور تیرے سوا دوسروں کی طرف رجوع کرنے والے خسارے میں رہیں گے"۔

اور قیامت کے ناموں میں سے ایک نام "یوم التغابن" بلا وجہ نہیں ہے، جیسا کہ سُورہ تغابن کی آیہ ۹ میں آیا ہے: ذالك یوم التغابن" "اس دن پتہ چل جائے گا کہ گھاٹے میں کون لوگ ہیں"۔

حسنِ مطلب اور لطفِ مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف تو انسانی وجود کے سرمایوں کا خریدار خداوندِ عظیم ہے: "ان اللہ اشتری من المؤمنین ... ..." (توبہ - ۱۱۱)

دوسری طرف وہ تھوڑے سے سرمایوں کو بھی خرید لیتا ہے: فمن یعمل مثقال ذرّة خیرًا یره (زلزال - ۷)

اور تیسری طرف اس کے مقابلہ میں وہ بہت زیادہ قیمت لگاتا ہے۔ کبھی دس گنا کبھی سات سو گنا اور کبھی اس سے بھی زیادہ۔ "فی کل سنبلة مائة حبة واللہ یضاعف لمن یشاء" (بقرہ - ۲۶۱) اور جیسا کہ دُعا میں وارد ہوا ہے، یا من یقبل الیسیر ویعفو عن الکثیر: "اے وہ خُدا جو تھوڑے سے حسنات اور نیکیوں کو بھی قبول کر لیتا ہے اور بہت زیادہ گناہوں کو بخش دیتا ہے"۔

اور چوتھی طرف سے، باوجود اس کے کہ یہ تمام سرمائے خود اُسی نے انسان کو دیے ہیں، وہ اس قدر بزرگوار ہے کہ پلٹ کر انہیں کو زیادہ گراں قیمت پر خرید لیتا ہے۔

ایک نکتہ

خوش بختی کا چار نکاتی پروگرام

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے اس عظیم خسارے کے لیے ایک جامع پروگرام پیش کیا ہے، جس میں چار اصولوں پر تکیہ ہوا ہے:

پہلی اصل: اس پروگرام میں مسئلہ "ایمان" ہے جو انسان کی تمام کارکردگیوں کی بُنیاد ہے، کیونکہ انسان کی عملی جدوجہد اس کی

[1] "نہج البلاغہ" کلماتِ قصار جملہ ۴۵۶

فکری و اعتقادی بُنیادوں سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے۔ وہ حیوانات کے افعال کی طرح نہیں ہوتیں جن کی حرکات فطری و طبعی اسباب کی بناء پر ہوتی ہیں۔

دُوسرے لفظوں میں انسان کے اعمال اس کے عقائد و افکار کی ایک مجسم صُورت ہوتے ہیں، اور اسی بناء پر خدا کے تمام انبیاء ہر چیز سے پہلے اُمتوں کی اعتقادی بُنیادوں کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ اور وہ خصُوصیت کے ساتھ شرک سے ۔جو انواع و اقسام کے رذائیل، بدبختیوں اور پراگندگیوں کا سرچشمہ ہے ۔ مبارزہ کرتے تھے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "ایمان" یہاں مطلق طور پر ذکر ہوا ہے تاکہ ایمان کے تمام کے تمام پہلوؤں کو شامل کیا جائے، یعنی خدا اور اس کی صفات پر ایمان سے لے کر قیامت و حساب و کتاب، جزا و سزا، کتبِ آسمانی، خدا کے انبیاء اور ان کے اوصیاء کے ایمان تک۔

دوسری اصل: میں ایمان کے بارآور اور پُرثمر درخت کے پھل اور نتیجہ کو پیش کرتے ہوئے "اعمالِ صالح" کی بات کرتا ہے۔ کیسی وسیع اور مطالب سے پُر تعبیر ہے، ہاں! "صالحات" وہی سارے کے سارے شائستہ اعمال، نہ صرف عبادات، نہ صرف انفاق فی سبیل اللہ، نہ صرف راہِ خدا میں جہاد، نہ صرف علم و دانش کا حصول، بلکہ ہر وہ شائستہ کام جو تمام میدانوں میں نفوس کے تکامل و ارتقاء، اخلاق کی پرورش، قرب الی اللہ اور انسانی معاشرے کی پیش رفت کا وسیلہ ہو۔

یہ تعبیر چھوٹے سے چھوٹے کاموں سے لے کر۔ جیسے لوگوں کے راستہ سے ایک رکاوٹ ڈالنے والے پتھر کو ہٹانا۔ کروڑوں انسانوں کو گمراہی و ضلالت سے نجات دلانے اور دینِ حق و عدالت کی سارے جہان میں نشر و اشاعت کرنے تک کو شامل ہے۔

اور اگر ایک حدیث میں "اعمالِ صالح" کی امام جعفر صادق علیہ السلام سے، "مواسات اور دینی بھائیوں سے مساوات کرنے" سے تفسیر ہوئی ہے، تو وہ واضح و روشن مصداق کے قبیل سے ہے۔

ممکن ہے کہ بعض اوقات اعمالِ صالح بعض غیر مومن انسانوں سے بھی سرزد ہوں، لیکن مسلّمہ طور پر وہ مضبُوط و پائیدار اور وسعت رکھنے والے نہیں ہوتے، کیونکہ وہ خدائی عمیق اور گہرے اسباب سے سرچشمہ حاصل نہیں کرتے۔ لہٰذا ان میں جامعیت نہیں ہوتی۔

قرآن نے یہاں "صالحات" کو خصوصیت کے ساتھ جمع کی صُورت میں بیان کیا ہے، ایسی جمع جو "الف و لام" کے ساتھ ہے اور عموم کے معنی رکھتی ہے۔ اور یہ اس حقیقت کو بیان کر رہی ہے کہ ایمان کے بعد اس طبعی و فطری خسارے سے روکنے والا راستہ تمام اعمالِ صالح کو انجام دیتا ہے نہ کہ صرف ایک یا چند اعمالِ صالح پر قناعت کرنا، اور واقعاً اگر ایمان عمیق اور گہرے طور پر انسان کے دل میں جاگزیں ہو جائے تو وہ ایسے ہی آثار ظاہر کیا کرتا ہے۔

ایمان کوئی ایسا فکر اور اعتقاد نہیں ہوتا جو رُوح کے گوشوں میں تو موجود ہو لیکن اس میں کسی قسم کی تاثیر موجود نہ ہو۔ ایمان تو انسان کے سارے وجود کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

ایمان اس پُرنور چراغ کے مانند ہے جو کسی کمرے کے اندر روشن ہے، جو نہ صرف اس کمرے کی فضا کو روشن کرتا ہے بلکہ اس کی روشنی اس کمرے کے تمام دریچوں سے باہر نکلتی ہے اور جو شخص اس کے باہر سے گزرے وہ اچھی طرح سے سمجھ لیتا ہے کہ اس میں ایک پُرنور چراغ روشن ہے۔

اسی طرح سے جب ایمان کا چراغ انسان کے دل کی سرائے میں روشن ہوتا ہے تو اس کا نور انسان کی زبان، آنکھ، کان اور ہاتھ پاؤں سے منعکس ہوتا ہے، ان میں سے ہر ایک کی حرکت بتاتی ہیں کہ دل میں ایک نور موجود ہے جس کی شعاعیں باہر نکل رہی ہیں۔

اسی بنا پر قرآن کی آیات میں عام طور پر: عمل صالح "ایمان" کے ساتھ "لازم و ملزوم" کے عنوان سے آیا ہے۔

سورۂ نحل کی آیہ ۹۷ میں آیا ہے: من عمل صالحًا من ذکر او انثٰی وھو مؤمن فلنحیینہ حیٰوۃ طیبۃ "جو بھی عمل صالح انجام دے، مرد ہو یا عورت، لیکن ہو وہ صاحب ایمان، تو ہم اُسے پاکیزہ حیات کے ساتھ زندہ کریں گے۔

اور سورۂ مؤمنون کی آیہ ۹۹۔۱۰۰ میں آیا ہے، اس عالم سے جُدائی کے بعد بدکاروں کو اس بات پر افسوس ہوگا کہ انہوں نے اعمال صالح کیوں انجام نہیں دیے۔ لہٰذا بہت ہی زیادہ امداد کے ساتھ عمل صالح کو انجام دینے کے لیے بازگشت کا تقاضا کریں گے: ربّ ارجعون لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت

اور سورۂ مومنون کی آیہ ۵۱ میں آیا ہے کہ خدا اپنے رسولوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ "پاک و پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور عمل صالح بجالاؤ" یاایھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحًا"

اور چونکہ ایمان و عملِ صالح سوائے اس صورت کے ہرگز جاری نہیں رہتے کہ ایک طرف تو معاشرے میں حق کی طرف دعوت اور اس کی معرفت کے لیے کام کیا جائے اور دوسری طرف سے اس دعوت کی انجام دہی کی راہ میں صبر و استقامت کی دعوت ہو، اس لیے ان دو اصولوں کے بعد دُوسرے دو اصولوں کی طرف اشارہ فرماتا ہے، جو حقیقت میں دو بُنیادی اصول "ایمان" اور "عمل صالح" کے اجزا کے ضامن ہیں۔

تیسری اصل میں "تواصی بہ حق" کے مسئلہ یعنی حق کی طرف سب کو عمومی دعوت دینے کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ سب لوگ حق کو باطل سے اچھی طرح پہچان لیں اور ہرگز اسے فراموش نہ کریں اور زندگی کی راہ میں اُس سے منحرف نہ ہوں۔

"تواصوا" "تواصی" کے مادہ سے، جیسا کہ "راغب" نے "مفردات" میں بیان کیا ہے، اس معنی میں ہے کہ بعض افراد دوسرے بعض افراد کو نصیحت کریں۔

اور "حق" "واقعیت" یا واقعیت سے مطابقت کے معنی میں ہے۔ کتاب "وجوہ قرآن" میں قرآن مجید میں اس لفظ کے بارہ معانی اور موارد استعمال ذکر ہوئے ہیں، مثلاً خدا، قرآن، اسلام، توحید، عدل، آشکار ہونا، اور واجب ہونا وغیرہ، لیکن وُہ سب ہی اسی ریشہ اور جڑ کی طرف لوٹتے ہیں جو ہم نے اُوپر بیان کی ہے۔

بہرحال "تواصوا بالحق" کا جملہ بہت ہی وسیع معنی رکھتا ہے، جو امر بہ معروف اور نہی از منکر کو بھی شامل ہے، اور جاہل کو تعلیم دینے اور اس کو ہدایت کرنے، غافل کو تنبیہ کرنے، شوق دلانے اور ایمان و عمل صالح کی تبلیغ کرنے کو بھی۔

یہ بات ظاہر و واضح ہے کہ جو لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں انہیں خُود بھی حق کا طرف دار اور اس کا عامل ہونا چاہیئے۔

چوتھی اصل میں "صبر" و استقامت اور اس کی نصیحت و وصیت کرنے کا مسئلہ پیش ہوا ہے، کیونکہ معرفت اور آگاہی کے بعد ہر شخص عمل کی راہ میں ہر قدم پر موانع سے رُوبرو ہوتا ہے۔ اگر استقامت اور صبر نہ ہو تو وہ ہرگز احقاق حق نہیں کر سکتا اور کوئی عملِ صالح انجام نہیں دے سکتا، یا اپنے ایمان کی حفاظت نہیں کر سکتا۔

ہاں! احقاقِ حق، اور اجرائے حق اور معاشرے میں حق کی ادائیگی، ایک عمومی فعالیت اور پختہ وعظیم استقامت یعنی موانع کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کے سوا ممکن نہیں ہے۔

"صبر" بھی یہاں ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو اطاعت پر صبر کرنے کو بھی شامل ہے، گناہ پر اُبھارنے والی چیزوں پر صبر کرنے، اور مصائب اور ناگوار حوادث پر صبر کرنے اور توانائیوں، سرمایوں اور ثمرات کو کھو بیٹھنے کے مقابلہ میں صبر کرنے کو بھی۔[1]

ان چار اصولوں کے بارے میں جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے ــ اور جو حقیقت میں انسانوں کی زندگی اور سعادت کا جامع ترین پروگرام ہے ــ اس کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ روایات میں یہ کیوں آیا ہے کہ "جب اصحاب پیغمبرؐ ایک دوسرے کے پاس جاتے تھے، تو ایک دوسرے سے جُدا ہونے سے پہلے سُورہ "والعصر" کی تلاوت کیا کرتے تھے، اور اس چھوٹی سی سُورت کے عظیم مطالب کو بیان کیا کرتے تھے اور پھر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے ہوئے اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے۔"[2]

اور حقیقتاً اگر مسلمان آج بھی اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ان چار اصولوں پر عمل پیرا ہو جائیں تو ان کی مشکلات اور بے سرسامانیاں حل ہو جائیں، پس ماندگی کی تلافی ہو جائے، کمزوریاں اور ناکامیاں کامیابیوں سے بدل جائیں، اور دُنیا جہان کے شریروں کے شر ان سے منقطع ہو جائیں۔

خداوندا! ہمیں صبر و استقامت اور حق و صبر کی ایک دوسرے کو وصیت و نصیحت کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! ہم سب خسارے میں ہیں اور اس خسارے کی تلافی تیرے لُطف و کرم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

بارِ الٰہا! ہم ان چاروں احکام پر، جو تُو نے اس سُورہ میں دیے ہیں، عمل کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اس کی توفیق عطا فرما۔

آمین یا ربّ العالمین

سُورہ والعصر کا اختتام

ترجمہ کا اختتام

بروز اتوار ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ

بوقت ۹ بجے صبح

بر مکان حقیر قم المقدسہ ایران

---

[1] ہم نے "صبر کی حقیقت اور اس کے مراحل اور شعبوں کے بارے میں جلد اوّل میں سُورہ بقرہ کی آیہ ۱۵۳ کے ذیل میں مفصل بحث کی ہے۔

[2] "درالمنثور" جلد ۶ ص ۳۹۲

سُورَۂ ھُمَزَة

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا۔

❖ اس میں ۹ آیات ہیں۔

سُورۂ ھمزۃ کے مطالب اور فضیلت

یہ سُورہ جو مکی سورتوں میں سے ہے ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے جو مال جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں اور ان کے نزدیک انسانی وجود کی تمام اقدار کا خلاصہ یہی ہے پھر وہ ان لوگوں کو جن کے ہاتھ اس سے خالی ہوتے ہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

یہ مغرور دولت جمع کرنے والے اور خُود پسند حیلہ گر، بادۂ کبر و نخوت سے ایسے مست ہو جاتے ہیں کہ دُوسروں کی تحقیر، عیب جوئی، استہزاء اور عیبت کرنے سے لذت اُٹھاتے ہیں اور اس سے تفریح کرتے ہیں۔

اور سُورہ کے آخر میں ان کی دردناک سرنوشت کی بات کرتا ہے کہ وہ کیسی حقارت آمیز صُورت میں دوزخ میں پھینکے جائیں گے اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہر چیز سے پہلے ان کے دل پر مسلط ہو جائے گی، اور ان کی رُوح و جان کو، جو اس سارے کبر و نخوت اور ان سب شرارتوں کا مرکز تھا، آگ میں ڈال دیا جائے گا، بھڑکتی ہوئی دوامی اور طولانی آگ۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت میں ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من قرأ سورة الهمزة اعطى من الاجر عشر حسنات بعدد من استهزأ بمحمد (ص) واصحابه"

"جو شخص اس سُورہ کی تلاوت کرے گا اُسے ان لوگوں کی تعداد سے، جنہوں نے محمدؐ اور ان کے اصحاب کا مذاق اُڑایا تھا، دس گنا حسنات دیے جائیں گے۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے: "جو شخص اس کو واجب نماز میں پڑھے گا، تو اس سے فقر و فاقہ دُور ہو جائے گا، اور روزی اس کا رُخ کرے گی اور قبیح اور بُری موت اس سے دُور ہو جائے گی۔"[2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۳۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝

۲۔ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝

۳۔ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝

۴۔ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝

۵۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝

۶۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝

۷۔ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝

۸۔ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝

۹۔ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ ہر عیب جو اور تمسخر کرنے والے کے لیے وائے ہے۔

۲۔ وہی جو مال کو جمع کر کے گنتا رہا، (جائز و ناجائز کا حساب کیے بغیر)

۳۔ وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس کے اموال اُس کے دوام کا سبب بن جائیں گے۔

۴۔ جیسا کہ وُہ خیال کرتا ہے ایسا نہیں ہے، عنقریب اُسے حطمہ (ریزہ ریزہ کرنے والی آگ) میں پھینک دیا جائے گا۔

۵۔ اور تُو کیا جانے کہ حُطمہ کیا ہے؟

۶۔ خدا کی بھڑکتی ہوئی آگ۔

۷۔ ایسی آگ جو دِلوں سے نکلتی ہے۔

۸۔ یہ آگ ان کے اُوپر دربستہ صُورت میں ہے۔

۹۔ کشیدہ اور طولانی ستونوں میں۔

شانِ نزول

مفسّرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اس سُورہ کی آیات "ولید بن مغیرہ" کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، جو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پسِ پُشت تو آپ کی غیبت کیا کرتا تھا اور آپ کے سامنے طعن و تشنیع اور استہزاء کیا کرتا تھا۔

اور بعض دوسرے مفسّرین نے اسے رؤسائے شرک اور اسلام کے جانے پہچانے دوسرے کینہ ور لوگوں مثلاً، اُخنس بن شریق" و "اُمیہ بن خلف" و "عاص بن وائل" کے بارے میں سمجھا ہے۔

لیکن اگر ہم ان شان ہائے نزول کو قبول بھی کر لیں تو بھی آیات کے مفہوم کی عمومیت ختم نہیں ہوتی، بلکہ وہ ان تمام لوگوں کو شامل ہے جو ان صفات کے حامل ہیں۔

تفسیر

عیب جوئی اور غیبت کرنے والوں کے لیے وائے ہے۔

یہ سُورہ ایک چُبھنے والی تہدید کے ساتھ شروع ہوتا ہے، فرماتا ہے: "ہر عیب جو اور تمسخر اُڑانے والے کے لیے وائے ہے

(ویل لکل همزة لمزة).

وہ لوگ جو زبان کے ڈنک، ہاتھ اور پاؤں کی حرکات اور چشم و ابرو کے اشاروں سے، پیٹھ پیچھے اور رُوبرو دوسروں کا مذاق اُڑاتے ہیں، یا ان کی عیب جوئی اور غیبت کرتے ہیں، یا انہیں طعن و تشنیع اور تہمت کے تیروں کا ہدف بناتے ہیں۔

"همزة" و "لمزة" دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں[1]

پہلا "همز" کے مادّہ سے اصل میں "توڑنے" کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ عیب جو اور غیبت کرنے والے دُوسروں کی شخصیت کو توڑتے ہیں اس لیے ان پر "همزه" کا اطلاق ہوتا ہے۔

اور "لمزة" "لمز" (بروزن رمز) کے مادّہ سے اصل میں غیبت کرنے اور عیب جوئی کرنے کے معنی میں ہے اس بارے میں کہ کیا یہ دونوں لفظ ایک ہی معنی میں ہیں اور غیبت کرنے والوں اور عیب جوئی کرنے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، یا ان دونوں کے درمیان کوئی فرق ہے؟ مفسرین نے بہت سے احتمال دیے ہیں، بعض نے انہیں ایک ہی معنی میں لیا ہے اور اس بنا پر ان دونوں کا اکٹھا ذکر تاکید کے لیے ہے۔

لیکن بعض نے یہ کہا ہے کہ "همزة" غیبت کرنے والے کے معنی میں ہے اور "لمزة" عیب جوئی کرنے والے کے معنی میں۔

اور بعض دوسروں نے "همزة" ان اشخاص کے معنی میں سمجھا ہے جو ہاتھ اور سر کے اشارہ سے عیب جوئی کرتے ہیں اور "لمزه" ان اشخاص کے معنی میں جو زبان سے یہ کام انجام دیتے ہیں۔

اور بعض نے "پہلے" کو رُوبرو عیب جوئی کرنے اور "دوسرے" کو پیٹھ پیچھے عیب جوئی کرنے کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

اور بعض نے پہلے کو آشکارا عیب جوئی اور دوسرے کو پنہاں اور آنکھ اور ابرو کے اشارہ سے عیب جوئی کے معنی میں سمجھا ہے۔

اور بعض اوقات یہ کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ہی اس شخص کے معنی میں ہیں جو لوگوں کو بُرے اور چبھنے والے القاب سے یاد کرتا ہے۔

اور آخر میں "ابن عباسؓ" کی ایک روایت میں آیا ہے کہ وہ ان دونوں کی تفسیر میں اس طرح کہا کرتے تھے:

"هو المشاؤون بالنميمة، المفرقون بين الاحبة، الناعتون للناس بالعيب"[2]

"یہ وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کرتے ہیں اور دوستوں کے درمیان جُدائی ڈالتے ہیں اور لوگوں میں عیب نکالتے ہیں"۔[2]

گویا ابن عباسؓ نے اس بات کا اس حدیث سے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے استفادہ کیا ہے،

---

[1] مبالغہ کا صیغہ مشہور چھ اوزان کے علاوہ دوسرے اوزان پر بھی آتا ہے، منجملہ ان کے ایک یہی وزن ہے، جس کی عربی زبان میں نظائر بھی موجود ہیں، مثلاً: "ضحکة" جو بہت زیادہ ہنسنے والے کے معنی میں ہے۔

[2] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۹۲۔

جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

" الا انبئکم بشرارکم ؟ قالوا : بلی یا رسول اللہ (ص) قال :
المشاؤون بالنمیمة ، المفرقون بین الاحبة ، الباغون للبرآء المعایب "

کیا میں تمہیں شریر ترین افراد کی خبر نہ دوں ؟ انہوں نے کہا : "ہاں ! اے رسول خدا (ص)
فرمایا : وہ لوگ جو بہت زیادہ چغل خوری کرتے ہیں، دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں
اور پاکیزہ و بے گناہ افراد کے عیوب کی جستجو میں رہتے ہیں [1]

لیکن ارباب لغت کے کلمات کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ ایک ہی معنی میں ہیں اور ایک وسیع معنی رکھتے ہیں، جو ہر قسم کی عیب جوئی ، غیبت ، طعن و تشنیع اور علائم و اشارات اور زبان کے ذریعے ٹھٹھہ کرنے اور مذاق اڑانے اور چغل خوری اور بدگوئی کو شامل ہے ۔

بہر حال اس گروہ کے بارے میں " ویل " کی تعبیر ایک تہدید شدید ہے ۔ اور اصولی طور پر آیاتِ قرآنی نے اس قسم کے افراد کے لیے سخت تنقید اور اعتراض کیا ہے اور ان کے لیے ایسی تعبیریں استعمال کی ہیں کہ ان جیسی کسی بھی گناہ کے لیے نظر نہیں آتیں. مثلاً جب کور دل منافقین کو مومنین کا مذاق اڑانے کی بنا پر عذاب الیم کی تہدید کرتا ہے تو فرماتا ہے : استغفر لھم او لا تستغفر لھم ان تستغفر لھم سبعین مرة فلن یغفر اللہ لھم : " تو ان کے لیے استغفار کر اور چاہے نہ کر، اگر تو ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کرے گا تو بھی خدا انہیں نہیں بخشے گا " (توبہ - ۸۰)

اسی معنی کے مشابہ، ان منافقین کے بارے میں، جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استہزاء کرتے اور مذاق اڑاتے تھے ، سورہ منافقین کی آیہ ۵ میں آیا ہے ۔

اصولی طور پر اسلام کی نظر میں اشخاص کی عزت اور حیثیت بہت ہی محترم ہے ۔ اور ہر وہ کام جو لوگوں کی تحقیر و تذلیل کا سبب ہو بہت بڑا گناہ ہے ۔ ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے :

" اذل الناس من اھان الناس "

" لوگوں میں سب سے زیادہ ذلیل شخص وہ ہے جو لوگوں کی توہین و تذلیل کرے " [2]

ہم نے اس سلسلہ میں سورۂ حجرات کی آیہ ۱۱ ، ۱۲ کے ذیل میں (جلد ۲۲ . ص ... ۱۷۱۳ ... پر) زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اس کے بعد اس قبیح عمل (عیب جوئی و استہزاء) کے سرچشمہ کو (جو عام طور پر مال و دولت سے پیدا ہونے والے کبر و غرور کے سبب سے ہوتا ہے) پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے : " وہی شخص جو مال کو جمع کر کے گنتا رہا ، (حلال و حرام کا خیال رکھے بغیر) (الذی جمع مالاً وعدّدہ) .

اُسے مال و دولت کے ساتھ اتنی محبت ہے ، کہ وہ ہمیشہ انہیں گنتا رہتا ہے اور درہم و دینار کی چمک اور دوسری قسم کے

---

[1] " اصول کافی " جلد ۲ باب النمیمة حدیث ۱

[2] " بحار الانوار " جلد ۷۵ ، ص ۱۴۲

سکوں سے لذت حاصل کرتا ہے، اور خوش ہوتا ہے۔ ہر درہم و دینار اس کے لیے ایک بُت ہے، وُہ نہ صرف اپنی شخصیت بلکہ تمام شخصیتوں کو انہیں میں منحصر سمجھتا ہے اور یہ ایک طبیعی و فطری اَمر ہے کہ اس قسم کا گمراہ اور دیوانہ و احمق آدمی فقیر و نادار مومنین کا ہمیشہ مذاق اُڑایا کرتا ہے۔

"عدّدہ" اصل میں "عدد" کے مادّہ سے اُسے شمار کرنے اور گننے کے معنی میں ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ "عدہ" (بروزن غدہ) کے مادّہ سے ہے جو ان اموال کو آمادہ کرنے اور مشکلات اور بُرے دن کے لیے ذخیرہ کرنے کے معنی میں ہے۔

اور بعض نے اس کی تفسیر روک رکھنے اور بچانے کے ساتھ بھی کی ہے۔

لیکن پہلا معنی سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بہر حال یہ آیت ان مال جمع کرنے والوں کے بارے میں ہے جو مال کو ایک وسیلہ کے طور پر نہیں بلکہ ایک ہدف اور مقصد کے طور پر دیکھتے ہیں اور اس کے جمع کرنے میں کسی قسم کی قید و شرط کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اسے حلال و حرام اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرکے، شرمناک طریقے سے یا پست و رذیلانہ طریقے سے، جمع کرتے ہیں۔ اور صرف اسی کو عظمت و شخصیت کی نشانی سمجھتے ہیں۔

وہ مال و دولت کو انسانی کی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے نہیں چاہتے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مال و دولت میں جتنا اضافہ ہوتا جاتا ہے ان کی حرص اور طمع بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ورنہ معقول حدود میں اور جائز طریقے سے حاصل شدہ مال و دولت نہ صرف مذموم نہیں ہے بلکہ بعض اوقات قرآن مجید نے اسے "فضل اللہ" کے عنوان سے تعبیر کیا ہے، جہاں فرماتا ہے: وابتغوا من فضل اللہ (جمعہ۔ ۱۰) اور دوسری جگہ اُسے خیر سے تعبیر کرتا ہے: کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ: تم پر واجب ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچے تو اگر اس نے کچھ خیر چھوڑی ہے تو اس کے لیے وصیت کرے۔

ایسا مال یقینی طور پر نہ تو طغیان و سرکشی کا باعث ہوتا ہے، نہ ہی تفاخر کا سبب بنتا ہے اور نہ ہی وہ دوسروں کے استہزاء کا موجب ہوتا ہے: لیکن وہ مال جو معبود بنا لیا گیا ہے اور وہی اصلی ہدف و مقصد بن چکا ہے، اور وہ اپنے مالکوں کو "قارون" کی طرح طغیان و سرکشی کی دعوت دیتا ہے، وہ ننگ و عار ہے۔ ذلت ہے اور مصیبت و نکبت ہے اور خدا سے دُوری اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں رہنے کا باعث ہے۔

عام طور پر اس مال کو زیادہ مقدار میں جمع کرنا بہت زیادہ آلودگیوں کے سوا ممکن نہیں ہے۔

اس لیے ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے آیا ہے، آپؑ نے فرمایا:

"لایجتمع المال الا بخمس خصال: بخل شدید، وامل طویل، وحرص غالب، وقطیعۃ رحم، وایثار الدنیا علی الآخرۃ":

"پانچ خصلتوں کے بغیر مال کسی کے پاس جمع نہیں ہو سکتا۔ (۱) بُخلِ شدید (۲) طویل آرزوئیں

۱۔ حرص غالب ۲۔ قطع رحمی ۳۔ اور دنیا کو آخرت پر مقدم رکھنا۔

جو لوگ سخی ہوتے ہیں اور لمبی لمبی آرزوؤں میں گرفتار نہیں ہوتے، حلال و حرام کا خیال رکھتے ہیں، اپنے اقربا کی مدد کرتے ہیں، عام طور پر ایسوں کے پاس مال جمع نہیں ہوتا، چاہے ان کی آمدنی زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "دولت جمع کرنے والا مال پرست انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اس کے اموال اس کی ہمیشگی کا سبب ہیں" (یحسب ان مالہ اخلدہ)[1]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "اخلد" یہاں "فعل ماضی" کی صورت میں آیا ہے، یعنی وہ یہ گمان کرتا ہے، کہ اس کے اموال نے اسے ایک جاودانی اور دائمی موجود بنا دیا ہے، نہ تو موت اس کے پاس پھٹک سکتی ہے، اور نہ ہی بیماریاں اور دنیا کے حوادث اس کے لیے کوئی مشکل پیدا کر سکتے ہیں، کیونکہ اس کی نظر میں مشکل کشا صرف مال و دولت ہے، اور یہ مشکل کشا اس کے پاس حاضر ہے۔

یہ تصور کتنا غلط اور خام خیالی ہے؟ اس قدر مال و دولت جو قارون کے قبضہ و اختیار میں تھا، کہ اس کے خزانوں کی چابیاں کئی طاقتور مرد بڑی مشکل سے اُٹھا سکتے تھے، لیکن عذاب الٰہی کے حملہ کے وقت وہ اس کی موت کو ایک گھڑی کے لیے مؤخر نہ کر سکے اور خدا نے اُسے اور اس کے خزانوں کو ایک ہی لمحہ میں مختصر سے زلزلہ کے ساتھ زمین میں دھنسا دیا: "فخسفنا بہ و بدارہ الارض" (قصص۔ ۸۱)

وہ اموال جن کا کامل نمونہ فراعنہ مصر کے پاس تھا، لیکن بمصداق "کم ترکوا من جنات وعیون و زروع و مقام کریم و نعمۃ کانوا فیھا فاکھین": "وہ کتنے زیادہ باغات اور چشمے کھیتیاں اور عمدہ و قیمتی محلات، اور دوسری فراواں نعمتیں جن میں وہ ناز و نعمت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے، اپنے پیچھے چھوڑ گئے" (دخان۔ ۲۵ تا ۲۷) لیکن یہ سب کے سب آسانی کے ساتھ ایک ہی ساعت میں دوسروں کے ہاتھ میں پہنچ گئے: "کذالک و اورثناھا قوما اٰخرین" (دخان۔ ۲۸)

اور اسی لیے کیونکہ قیامت میں پردے ہٹ جائیں گے، اور انہیں اپنی عظیم غلطی کا علم ہو جائے گا، تو وہ پکار اٹھیں گے: ما اغنیٰ عنی مالیہ ھلک عنی سلطانیہ: "میرے مال و دولت نے مجھے ہرگز بے نیاز نہیں کیا، اور میری قدرت طاقت و اقتدار بھی میرے پاس نہ رہے۔ (حاقہ۔ ۲۸۔ ۲۹)

اصولی طور پر انسان فنا و نیستی سے متنفر ہے۔ اور وہ ہمیشگی اور دوام کا طرف دار ہے، اور یہی اندرونی لگاؤ ہماری معاد کے مباحث میں مدد کرتا ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ انسان ہمیشگی اور دوام کے لیے پیدا ہوا ہے، ورنہ جاوداں ہونے کے ساتھ لگاؤ کی فطری خواہش اس میں نہ ہوتی۔

لیکن یہ مغرور و خود غرض اور دنیا پرست انسان اپنی ہمیشگی کو ایسے امور میں سمجھنے لگتا ہے جو ٹھیک اس کی فنا و نیستی کا

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۶۶۸ حدیث ۷

[2] "مالہ" ممکن ہے کہ "مال" ضمیر غائب کی طرف مضاف ہو، یا "ما" موصولہ اور اس کے صلہ سے مرکب ہو، "اخلدہ" کا جملہ جو کہ فعل ماضی ہے مضارع کے معنی میں ہے۔ یا خلود کے موجبات و اسباب کے معنی میں ہے۔

سبب ہیں، مثلاً وہ مال و مقام کو، جو عام طور پر اس کی بقا کے دشمن ہیں، دوام کا ذریعہ شمار کرنے لگتا ہے۔

اس بیان سے واضح ہوگیا کہ مال کے ذریعے دوام اور ہمیشگی کا تصور، مال کے جمع کرنے کی ایک دلیل ہے۔ اور ان دل کے اندھوں کی نظر میں مال کا جمع ہو جانا بھی دوسروں پر استہزاء اور تمسخر کرنے کا ایک عامل شمار ہوتا ہے۔

قرآن اس گروہ کے جواب میں فرماتا ہے: ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ گمان کرتا ہے، (کلّا)۔

بلکہ وہ عنقریب انتہائی ذلت و خواری کے ساتھ پاش پاش کرنے والی آگ میں پھینک دیے جائیں گے۔ (لینبذن فی الحطمة)۔

اس کے بعد حطمہ کی اس طرح تفسیر کرتا ہے: "اور تو کیا جانے کہ حطمہ کیا ہے" (وما ادراك ما الحطمة)۔

"وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے" (نار اللّٰہ الموقدة)۔

"وہ آگ جو دلوں سے نکلے گی اور اس کے ابتدائی شعلے دلوں میں ظاہر ہوں گے"۔ (التی تطلع علی الافئدة)

"لینبذن" "نبذ" (بروزن سبز) کے مادہ سے "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق، اصل میں کسی چیز کو اس کی حقارت اور بے قدری کی وجہ سے دُور پھینکنے کے معنی میں ہے۔

یعنی خدا ان مغرور، خود خواہ، اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والوں کو اس دن ذلیل اور بے قدر و قیمت موجودات کی صورت میں جہنم کی آگ میں پھینکے گا، تاکہ وہ اپنے کبر و غرور کا نتیجہ دیکھ لیں۔

"حطمہ" "حطم" کے مادہ سے مبالغہ کا صیغہ ہے جو کسی چیز کو درہم برہم کرنے کے معنی میں ہے، اور یہ اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ بڑی سختی کے ساتھ ان کے اعضاء و جوارح کو توڑ کر رکھ دے گی، لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "حطمہ" ساری جہنم کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے حد سے زیادہ گرم اور بھڑکتے ہوئے حصّہ کا نام ہے[1]۔

اس معنی کو سمجھنا کہ آگ جلانے کی بجائے اعضا کو توڑ دے گی، شاید گزشتہ زمانوں میں تو مشکل ہو، لیکن موجودہ زمانہ میں بم کے پھٹنے کی لہروں کی تاثیر کی شدت کا مسئلہ ہم سب پر واضح ہو چکا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک خوفناک بم کے پھٹنے سے پیدا ہونے والی لہریں، نہ صرف انسانوں کو بلکہ لوہے کے محکم گارڈروں اور عمارتوں کے بڑے بڑے ستونوں کو بھی توڑ دیتی ہیں، یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔

"نار اللّٰہ" (خدائی آگ) کی تعبیر اس کی عظمت کی دلیل ہے اور "موقدة" کی تعبیر اس کے ہمیشہ کے لیے روشن ہونے کی دلیل ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ آگ دُنیا کی آگ کے برخلاف، جو پہلے چمڑے کو جلاتی ہے، اور اس کے بعد بدن کے اندر نفوذ کرتی ہے، سب سے پہلے دلوں میں شعلہ ور ہوگی اور اندر کو جلائے گی۔ پہلے دل کو جلائے گی پھر دماغ اور ہڈیوں کو اور اس کے بعد باہر کی طرف سرایت کرے گی۔

یہ کس قسم کی آگ ہے جس کا پہلا شعلہ انسان کے دل میں ظاہر ہوگا؟ یہ کیسی آگ ہے جو باطن کو ظاہر سے پہلے جلائے گی؟ قیامت کی ہر چیز عجیب و غریب ہے اور اس کا اس جہان کی باتوں کے ساتھ بہت زیادہ فرق ہے، یہاں تک کہ اس کی جلانے

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۱۷، ۱۹ حدیث ۶۰، ۶۴

والی آگ کی گرفت میں بھی ایک الگ خاصیت ہے۔

ایسا کیوں نہ ہو؛ جب کہ ان کے دل ہی تو کفر اور کبر و نخوت کا مرکز تھے، اور وہ حُبِّ دنیا اور مال و دولت کی محبت کا محور بنے ہوئے تھے۔

خدا کے قہر و غضب کی آگ ہر چیز سے پہلے ان کے دلوں پر کیوں مسلط نہ ہو، جب کہ انہوں نے اس دنیا میں مومنین کے دل کو تمسخر، عیب جوئی، غیبت اور تحقیر و تذلیل کے ساتھ جلایا تھا۔ لہٰذا عدالتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے اعمال جیسا ہی کیفرِ کردار دیکھیں۔

اس سُورہ کی آخری آیت میں فرماتا ہے: "یہ جلانے والی آگ ان پر دروازہ بند صُورت میں ہوگی"۔ (انھا علیھم مؤصدۃ)۔

مؤصدۃ "ایصاد" کے مادّہ سے، دروازہ بند کرنے اور اس کو محکم کرنے کے معنی میں ہے، اسی لیے ان کمروں کو جو پہاڑوں کے اندر اموال جمع کرنے کے لیے بناتے ہیں "وصید" کہتے تھے۔

حقیقت میں جیسا کہ وہ اپنے اموال کو مضبُوط صندوقوں اور دربست خزانوں میں محفوظ کرکے رکھا کرتے تھے، خدا بھی انہیں دوزخ کے دَربست عذاب میں جس سے خلاصی اور نجات پانے کی کوئی راہ نہ ہوگی، قید کرے گا۔

اور آخر میں فرماتا ہے:

"انہیں کھینچے ہوئے اور طولانی ستونوں میں رکھا جائے گا" (فی عمد ممدّدۃ)۔

"عمد" "عمود" جیسا کہ لکڑی اور لوہے کے قطعات (شہتیر) ہوتے ہیں، اور "ممددۃ" کھینچے ہوئے اور طولانی کے معنی میں ہے۔

مفسّرین کی ایک جماعت نے اس تعبیر کو لوہے کی بڑی بڑی میخوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جن کے ساتھ جہنم کے دروازے محکم طور پر جڑے ہوئے ہوں گے، اس طرح کہ ان سے نکلنے کی بالکل کوئی راہ نہ ہوگی۔ اس بنا پر یہ گزشتہ آیت پر ایک تاکید ہے جو یہ کہتی ہے کہ جہنم کے دروازوں کو ان پر بند کر دیں گے، اور وہ ہر طرف سے محصور ہو کر رہ جائیں گے۔

بعض نے اسے عذاب و مجازات کے وسائل کی ایک قسم کی طرف بھی اشارہ سمجھا ہے، اس چیز کے مانند جو ہمارے ہاں "ہتھکڑی اور بیڑی" کے ساتھ معروف ہے، اور وہ لکڑی یا لوہے کا ایک وزنی ٹکڑا ہوتا ہے جس میں پاؤں کے ناپ کے برابر دو سُوراخ ہوتے ہیں، اس میں پاؤں کو رکھ دیتے ہیں اور اس کے اُوپر کے سُوراخ سے پکڑ کر اس میں تالہ لگا دیتے ہیں۔ اس طرح اس آدمی میں چلنے کی طاقت نہیں رہتی تھی، اور یہ ان شکنجوں کی سزا ہوگی جو وہ بے گناہ لوگوں کو دیا کرتے تھے۔

بعض نے ایک تیسری تفسیر بھی آخری انکشافات کی مدد سے اس کے لیے بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جہنم کے جلانے والے شعلے کشیدہ اور طولانی ستونوں کی طرح ان پر مسلط ہو جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ آخری انکشافات میں یہ ثابت ہوا ہے کہ رکیں (رونگٹے) کی مخصوص شعاعیں، دوسری شعاعوں کے برخلاف جو مخروطی صُورت میں پھیلتی ہیں، وہ استوانی صُورت میں ٹھیک ستون کی طرح منتشر ہوتی ہیں، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ شعاعیں انسان کے سارے وجود میں نفوذ کر جاتی ہیں، یہاں تک کہ اس کے دل پر بھی مسلط ہو جاتی ہیں، اور اسی بنا پر داخلی اعضاء کا ایکسرے لینے کے لیے اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ سے

ایسی شعاعیں اٹھیں گی جو اُوپر والی شعاعوں سے ملتی جلتی ہوں گی[1]

لیکن ان تفاسیر میں سب سے زیادہ مناسب وہی پہلی تفسیر ہے۔ (البتہ ان تفاسیر میں بعض کی بنا پر "فی عمد ممددة" کا جملہ دوزخ کی حالت کو بیان کرتا ہے اور دوسری بعض کی بنا پر دوزخیوں کی حالت کو)

چند نکات

۱۔ کبر و غرور بڑے بڑے گناہوں کا سرچشمہ ہے

"اپنے آپ کو بڑا خیال کرنا ایسی عظیم بلا ہے جو بہت سے گناہوں کی اصل اور بُنیاد قرار پاتی ہے۔ خدا سے غفلت نعمتوں کا کفران، عیاشی اور ہوس بازی میں غرق ہونا، دوسروں کی تحقیر و تذلیل، مومنین کا مذاق اُڑانا، اسی صفتِ رذیلہ کے منحوس اور بُرے اثرات ہیں۔ کم ظرف لوگ جب کسی مقام و منصب یا کسی اچھی منزل پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ ایسے کبر و غرور میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ کسی دوسرے کے لیے کسی قدر و قیمت کے قائل ہی نہیں ہوتے۔ اور یہی چیز ان کے معاشرے سے جُدا ہونے اور معاشرے کے ان سے الگ ہونے کا سبب بن جاتی ہے۔

وہ اپنے ہی تصورات و خیالات کی دنیا میں ڈُوبے رہتے ہیں اور خُود کو باقیوں سے علیحدہ کوئی دوسری مخلوق خیال کرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقربانِ خدا میں بھی شمار کرنے لگتے ہیں، اور اسی وجہ سے دوسروں کی عزّت و آبرو بلکہ ان کی جان تک بھی ان کی نظر میں بے قدر و قیمت ہو جاتی ہے، اور وہ "غمز" و "لمز" یا دوسروں کی عیب جوئی اور مذمّت میں مشغول ہو جاتے ہیں اور یوں اپنے خیال میں وہ اپنی عظمت میں اضافہ کرتے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں اس قسم کے افراد کو عقرب (بچھو) سے تشبیہ دی گئی ہے، اور اگرچہ بچھو کا ڈنک مارنا کسی کینہ کی وجہ سے نہیں ہوتا، لیکن ان کا ڈنک مارنا کینہ پروری کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"میں نے شبِ معراج دوزخیوں کے ایک گروہ کو دیکھا کہ ان کے پہلوؤں سے گوشت الگ کر کے انہیں کھلاتے تھے۔ میں نے جبرئیل سے پُوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ تو انہوں نے کہا:

"هؤلاء الهمازون من امتك، اللمازون!":

"یہ آپ کی اُمّت میں سے عیب جوئی کرنے والے اور استہزا کرنے والے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے، ہم نے سُورہ حجرات کی آیات کے ذیل میں اس سلسلہ میں تفصیلی بحث کی ہے۔

---

[1] "طنطاوی" زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۔ مال جمع کرنے کی حرص

مال و دولت کے بارے میں افراط و تفریط کے لحاظ سے مختلف نظریے پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو اس کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اُسے تمام مشکلات کا حل سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس نظریہ کے طرف داروں نے اپنے اشعار میں اس سلسلہ میں خُوب دادِ سُخن دی ہے، منجملہ ایک شاعرِ عرب کہتا ہے :

" فصاحة سحبان و خط ابن مقلة

وحكمة لقمان وزهد بن ادهم

اذا اجتمعت فی المرء والمرء مفلس

فليس له قدر بمقدار درهم"

"(عرب کے معروف فصیح) " سحبان کی فصاحت" اور (معروف خطاط) "ابنِ مقلہ" کا خط اور " لقمان" کی حکمت اور " ابراہیم بن اُدھم" کا زہد اگر کسی انسان میں جمع ہو جائے اور مفلس و نادار ہو، تو اس کی قدر و قیمت ایک درھم کے برابر بھی نہیں ہوگی"!

لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے اگر یہ گروہ ہمیشہ مال جمع کرنے میں مشغول رہے اور ایک آن کے لیے بھی راحت و آرام سے نہ بیٹھے اور اس کے لیے کسی بھی قید و شرط کا قائل نہ ہو اور حلال و حرام ان کی نظر میں یکساں ہو جائے۔

اِس گروہ کے نقطۂ مقابل میں وہ گروہ ہے جو مال و دولت کے لیے کم سے کم قدر و قیمت کا بھی قائل نہیں ہے۔ وہ فقر و فاقہ کی تعریف کرتا ہے اور اس کی عظمت و بلندی کا قائل ہے، یہاں تک کہ وہ مال کو تقویٰ اور قربِ خدا میں مزاحم سمجھتے ہیں۔

لیکن ان دونوں نظریات کے مقابلہ میں (جو افراط و تفریط رکھتے ہیں) قرآن مجید اور اسلامی روایات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مال اچھی چیز ہے، لیکن چند شرائط کے ساتھ :

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ ذریعہ اور وسیلہ ہو نہ کہ ہدف اور مقصد۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنا "اسیر" نہ بنائے بلکہ انسان اس کا "امیر" ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اُسے مشروع اور حلال طریقہ سے حاصل کیا جائے اور وہ رضائے خدا کے لیے صَرف ہو۔

اس قسم کے مال سے محبت نہ صرف یہ کہ وہ دنیا پرستی نہیں ہے، بلکہ آخرت سے محبت کی ایک دلیل ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے :

"جس وقت آپ نے ذھب و فضہ (سونا اور چاندی) پر لعنت کی، تو آپ کے ایک صحابی نے تعجب کیا، اور اس بارے میں سوال کیا تو امامؑ نے فرمایا :

" ليس حيث تذهب اليه انما الذهب الذی ذهب بالدين والفضة التی افاضت الكفر":

" (ذھب) سونے سے مراد وُہ چیز ہے جو دین کو ختم کردے اور فضہ (چاندی) سے مراد وہ چیز ہے جو کُفر و بے ایمانی کا سرچشمہ بنے۔ [1]

ایک اور حدیث میں حضرت امیرالمومنین علیہ السّلام سے آیا ہے :

" السکر اربع سکرات سکر الشراب وسکر المال، وسکر النوم، وسکر الملک ".

" نشہ اور مستی چار قسم کی ہوتی ہے :

۱۔ شراب کی مستی۔ ۲۔ مال کی مستی۔ ۳۔ نیند کی مستی۔ ۴۔ اقتدار کی مستی "! [2]

ایک اور حدیث میں امام جعفرصادق علیہ السّلام سے آیا ہے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا، میرے ماں باپ آپ پر قربان، مجھے کچھ وعظ و نصیحت فرمائیے، تو آپ نے فرمایا :

" ان کان الحسنات حقًّا فالجمع لما ذا ؟ وان کان الخلف من اللہ عزوجل حقًّا فالبخل لما ذا ؟! ".

" اگر حسنات حق ہیں اور ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر مال کا جمع کرنا کس لیے ؟ (کیوں اُسے راہِ خدا میں خرچ نہ کریں) اور اگر بدلہ دینا اور تلافی کرنا اللہ کی طرف سے حق ہے، تو پھر بُخل کس لیے ؟ [3]

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آخر عمر تک مال جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں اور انجام کار دُوسروں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کا حساب تو انہیں دینا پڑے گا اور اس سے فائدہ دوسرے لوگ اُٹھائیں گے۔ اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ لوگوں نے امیرالمومنین علیؑ سے سوال کیا، من اعظم الناس حسرۃ ؟ : لوگوں میں سب سے زیادہ حسرت و ندامت کس کو ہوگی ؟ آپؑ نے فرمایا :

" من رأی مالہ فی میزان غیرہ وادخلہ اللہ بہ النار وادخل وارثہ بہ الجنۃ "

" وہ شخص جو اپنے اموال کو دوسروں کے اعمال تولنے کی ترازو میں دیکھے، خدا اُسے تو اس کے اموال کی وجہ سے دوزخ میں داخل کرے، اور اس کے وارث کو اس کی وجہ سے جنّت میں داخل کرے "۔ [4]

---

[1] " بحارالانوار " جلد ۷۳، ص ۱۴۱ حدیث ۱۷

[2] " بحارالانوار " جلد ۷۳، ص ۱۴۲

[3] " توحید صدوق " مطابق نقل " نورالثقلین " جلد ۵ ص ۶۶۸ حدیث ۸۔

[4] " بحارالانوار " جلد ۷۳، ص ۱۴۲

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے آیہ " کذالک یریھم اللہ اعمالھم حسرات علیھم" (اسی طرح سے خدا ان کے اعمال کو ان کے لیے حسرت بنا دے گا) کی تفسیر میں فرمایا :

" ھو الرجل یدع المال لا ینفقہ فی طاعۃ اللہ بخلا ثم یموت فیدعہ لمن یعمل بہ فی طاعۃ اللہ او فی معصیتہ "

" یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو مال چھوڑ جاتا ہے اور بخل کی وجہ سے اُسے راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتا۔ پھر وہ مرجاتا ہے، اور اُسے ایسے شخص کے لیے چھوڑ جاتا ہے جو اُسے اللہ کی اطاعت یا اس کی معصیت میں خرچ کرتا ہے"

اس کے بعد امام نے مزید فرمایا :

" اگر وہ خدا کی اطاعت میں خرچ کرے گا تو وہ اُسے دوسرے کی میزان عمل میں دیکھ کر حسرت کرے گا کیونکہ وہ مال تو اس کی ملکیت تھا، اور اگر وہ خدا کی معصیت و نافرمانی میں صرف کرے گا، تو وہ گناہ کرنے میں اس کی تقویت کا سبب بنا۔ اس پر بھی اُسے عقوبت اور حسرت ہوگی"[1]

ہاں! انسان مال کو مختلف انداز میں استعمال کرتے ہیں، کبھی تو اُس سے ایک خطرناک بُت بنا لیتے ہیں، اور کبھی عظیم سعادت کا وسیلہ۔

اس گفتگو کو ہم " ابن عباسؓ سے منقول ایک پُرمعنی حدیث پر ختم کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں :

" ان اول درھم و دینار ضربا فی الارض نظر الیھما ابلیس فلما عاینھما احتضنھما فوضعھما علی عینیہ، ثم ضمھما علی صدرہ، ثم صرخ صرخۃ، ثم ضمھما الی صدرہ، ثم قال : انتما قرۃ عینی ! و ثمرۃ فؤادی ما ابالی من بنی آدم اذا احبوکما ان لا یسبدوا و ثنا ! حسبی من بنی آدم ان یحبوکما" : [2]

" جب دُنیا میں درھم و دینار کا سب سے پہلا سکہ بنایا گیا تو ابلیس نے اُن پر نگاہ کی، جب انہیں دیکھا تو اس نے ان دونوں کو اُٹھا لیا اور دونوں کو اپنی آنکھوں پر رکھا، پھر انہیں سینہ سے لگا لیا۔ پھر وہ والہانہ طور پر چیخا اور دوبارہ انہیں سینہ سے لگا لیا اور کہنے لگا : تم (اے درھم و دینار) میری آنکھوں

---

[1] وہی مدرک حدیث ۲۰

[2] وہی مدرک ص ۱۳۷ حدیث ۳

کی روشنی ہو، تم میرے دل کا میوہ ہو۔ اگر انسان تمہیں دوست بنالیں تو پھر میرے لیے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ بُت پرستی نہ کریں۔ بس میرے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ تم سے محبت کرنے لگیں، (کیونکہ تم سب بتوں سے بڑھ کر بُت ہو)۔[1]

خداوندا ! ہمیں مال و غضب، دنیا و شہوات کی مستی سے محفوظ فرما۔

پروردگارا ! ہمیں شیطان کے تسلط اور درہم و دینار کی بندگی سے رہائی عطا فرما۔

بار الٰہا ! جہنم کی آگ سخت توڑنے والی ہے اور تیرے لطف و کرم کے بغیر اس سے نجات ممکن نہیں ہے۔ ہمیں اپنے لطف کا مشمول قرار دے۔

❖ ❖ ❖

آمین یا رب العالمین۔

سورۂ ھُمزۃ کا اختتام

---

[1] وہی مدرک ص ۱۳۷ ۔ حدیث ۳

سُورَۂ اَلفِیل

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا
❖ اِس میں ۵ آیات ہیں۔

سُورۂ "فیل" کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سُورہ ـــ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے ـــ ایک مشہور تاریخی داستان کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے سال واقع ہوئی تھی اور خدا نے خانہ "کعبہ" کو کفار کے اس عظیم لشکر کے شر سے محفوظ رکھا تھا، جو سرزمین یمن سے ہاتھیوں پر سوار ہو کر آیا تھا۔

یہ سُورہ اس عجیب داستان کی یاد دلاتا ہے جو مکّہ کے بہت سے لوگوں کو یاد تھی، کیونکہ وہ ماضی قریب میں ہی واقع ہوئی تھی۔

اِس داستان کی یادآوری مغرور اور ہٹ دھرم کفار کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ یہ جان لیں کہ وہ خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کچھ بھی قدرت نہیں رکھتے۔ وہ خدا جس نے ہاتھیوں کے اس عظیم لشکر کو ان چھوٹے چھوٹے پرندوں اور ان نیم بند کنکریوں (حجارة من سجیل) سے ریزہ ریزہ کر دیا۔ وہ اُن ہٹ دھرم متکبرین کو سزا دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

نہ تو ان کی قدرت ہی "ابرھہ" کی قدرت سے زیادہ تھی اور نہ ہی ان کے لشکر اور افراد کی تعداد کبھی اس حد تک پہنچی تھی۔ یعنی تم لوگ جنہوں نے اس واقعہ کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے، غرور و تکبّر کی سواری سے نیچے کیوں نہیں اُترتے؟

اِس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت میں امام جعفر صادق علیہ السّلام سے آیا ہے:

"جو شخص سُورہ فیل کو نماز واجب میں پڑھے گا قیامت میں ہر پہاڑ اور ہموار زمین اور ہر ڈھیلہ اس کی گواہی دے گا کہ وہ نماز گزاروں میں سے ہے اور ایک منادی ندا دے گا کہ تم نے میرے بندے کے بارے میں سچ کہا ہے، میں تمہاری گواہی کو اس کے نفع یا نقصان میں قبول کرتا ہوں۔ میرے بندے کو حساب کے بغیر جنّت میں داخل کر دو، کیونکہ

وہ ایسا شخص ہے جسے میں دوست رکھتا ہوں اور اس کے عمل کو بھی دوست رکھتا ہوں۔[1]

یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ یہ سب فضیلت و ثواب اور عظیم جزا اس شخص کے لیے ہے جو ان آیات پڑھ کر غرور و تکبّر کی سواری سے نیچے اُتر آئے اور رضائے الٰہی کی راہ میں قدم رکھ دے۔

❖ ❖ ❖

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۳۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝

۲۔ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝

۳۔ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝

۴۔ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝

۵۔ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے اصحابِ فیل (ابرھہ کے لشکر کو جو کعبہ کو نابُود کرنے کے ارادے سے آیا تھا) کے ساتھ کیا کیا۔

۲۔ کیا ان کے منصوبہ کو خاک میں نہیں ملا دیا؟

۳۔ اور ان کے اُوپر گروہ در گروہ پرندے بھیجے۔

۴۔ جو اُن کے اُوپر چھوٹی چھوٹی کنکریاں برسا رہے تھے۔

۵۔ اور اس طرح انہیں کھائے ہُوئے بھوسہ کی مانند بنا دیا۔

شانِ نزول

ایک حدیث میں امام علی بن الحسین علیہ السلام سے آیا ہے کہ :

" ابوطالبؑ ہمیشہ اپنی تلوار کے ذریعے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ فرماتے ہیں : (ایک دن) ابوطالب نے کہا : اے بھتیجے ! کیا آپ سب لوگوں کے لیے مبعوث ہوئے ہیں یا صرف اپنی قوم کے لیے بھیجے گئے ہیں"؟

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : " نہیں ! میں تمام انسانوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں، وہ گورا ہو یا کالا، عربی ہو یا عجمی۔ اسی ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے ، میں تمام انسانوں کو چاہے وہ گورے ہوں یا کالے اس دین کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اور ان تمام لوگوں کو جو پہاڑوں کی چوٹی پر بستے ہیں یا دریاؤں میں رہتے ہیں اس دین کی طرف بلاتا ہوں ، اور میں فارس و روم کی تمام زبانوں کو دعوت دیتا ہوں۔

جب یہ گفتگو قریش کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے تعجب کیا اور کہا ، کیا آپ اپنے بھتیجے کی باتوں کو نہیں سنتے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ خدا کی قسم اگر فارس و روم کے لوگ یہ بات سن لیں گے تو ہمیں ہماری سرزمین سے باہر نکال کھڑا کریں گے اور خانہ کعبہ کے پتھروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے الگ الگ کر دیں گے۔ اس موقع پر خدا نے آیہ شریفہ وقالوا ان نتبع الھدی معک نتخطف من ارضنا اولم نمکن لھم حرمًا امنًا یجبٰی الیہ ثمرات کل شیء : " انہوں نے کہا : اگر ہم تیرے ساتھ مل کر ہدایت کو قبول کرلیں تو ہمیں ہماری سرزمین سے باہر نکال دیں گے ، کیا ہم نے انہیں ، امن کے اس حرم میں ، جس کی طرف ہر طرح کے پھل لاتے ہیں ، جگہ نہیں دی" (قصص ۔ ۵۷) نازل ہوئی۔

اور ان کے اس قول کے بارے میں کہ وہ خانہ کعبہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے سورۂ فیل نازل کی۔ (اور انہیں گوش گزار کیا کہ کوئی شخص بھی اس قسم کے کام کی قدرت نہیں رکھتا)[1]۔

اصحابِ فیل کی داستان

مفسرین اور مورخین نے اس داستان کو مختلف صورتوں میں نقل کیا ہے اور اس کے وقوع کے سال میں بھی اختلاف ہے لیکن اصل داستان ایسی مشہور ہے کہ یہ اخبار متواتر میں شمار ہوتی ہے اور ہم اسے مشہور روایات کے مطابق " سیرۃ ابن ھشام" و " بلوغ الارب" و " بحارالانوار" و " مجمع البیان " سے خلاصہ کر کے نقل کرتے ہیں۔

یمن کے بادشاہ " ذونواس " نے نجران کے عیسائیوں کو جو اس سرزمین کے نزدیک بستے تھے ، اس لیے بہت تنگ کر رکھا تھا کہ وہ اپنا دین مسیحیت چھوڑ دیں۔ قرآن نے اس واقعہ کو سورۂ " بروج " میں اصحاب الاخدود کے عنوان سے بیان کیا ہے۔

---

[1] " روضۃ الواعظین " (مطابق نقل " نورالثقلین " جلد ۵ ص ۶۶۹ حدیث ۸)

اور ہم نے اسے اسی سُورہ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اس عظیم جُرم کے بعد "دوس" نامی ایک شخص ان میں سے اپنی جان بچا کر نکل گیا اور وہ قیصر روم کے پاس، جو دینِ مسیحیت پر تھا، جا پہنچا، اور اس کے سامنے یہ سارا ماجرا بیان کیا۔

چونکہ "روم" اور "یمن" کے درمیان فاصلہ زیادہ تھا لہٰذا اس نے حبشہ کے بادشاہ "نجاشی" کو خط لکھا کہ وہ "ذونواس" سے نصارائے نجران کا انتقام لے، اور اس خط کو اسی شخص کے ہاتھ "نجاشی" کے پاس روانہ کیا۔

"نجاشی" نے ایک بہت بڑا لشکر جو ستر ہزار افراد سے زیادہ پر مشتمل تھا "ارياط" نامی شخص کی کمان میں یمن کی طرف روانہ کیا۔ "ابرھہ" بھی اس لشکر کے افسروں میں سے ایک تھا۔

"ذونواس" کو شکست ہوئی، اور "ارياط" یمن کا حکمران ہوگیا۔ کچھ مدت کے بعد "ابرھہ" نے ارياط کے خلاف بغاوت کر دی، اور اس کا خاتمہ کرنے کے بعد اس کی جگہ پر بیٹھ گیا۔

اِس واقعہ کی نجاشی کو خبر پہنچی تو اس نے "ابرھہ" کی سرکوبی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ابرھہ نے اپنی نجات کے لیے اپنے سر کے بال منڈوا کر یمن کی کچھ مٹی کے ساتھ مکمل تسلیم کی نشانی کے طور پر نجاشی کے پاس بھیج دیے، اور وفاداری کا اعلان کیا۔

نجاشی نے جب یہ دیکھا تو ابرھہ کو معاف کر دیا، اور اُسے اس کے منصب پر برقرار رکھا۔

اس موقع پر "ابرھہ" نے اپنے حُسنِ خدمت کو ثابت کرنے کے لیے ایک اہم اور بہت ہی خوبصورت گرجا تعمیر کرایا، جس کی اس زمانہ میں کُرۂ زمین پر کوئی مثل و نظیر نہ تھی۔ اور اس کے بعد جزیرہ عرب کے لوگوں کو خانہ کعبہ کی بجائے اس گرجے کی طرف دعوت دینے کا مصمم ارادہ کر لیا، اور یہ پختہ اِرادہ کر لیا کہ اس جگہ کو عرب کے حج کا مرکز بنا کر مکہ کی اہم مرکزیت کو وہاں مُنتقل کر دے۔

اِس مقصد کے لیے اس نے ہر طرف عرب کے قبائل اور سرزمینِ حجاز میں بہت سے مبلّغ بھیجے۔ عربوں نے، جو مکہ اور کعبہ کے ساتھ شدید لگاؤ رکھتے تھے اور اُسے ابراہیمؑ خلیل کے آثار میں سے جانتے تھے، اس سے خطرہ محسوس کیا۔

بعض روایات کے مطابق ایک گروہ نے وہاں جا کر مخفی طور پر اس گرجے کو آگ لگا دی، اور دوسری روایت کے مطابق بعض نے اُسے مخفی طور پر گندہ اور ملوث کر دیا۔ اور اس طرح سے انہوں نے اس عظیم دعوت کے مقابلہ میں شدید ردِّ عمل کا مظاہرہ کیا، اور "ابرھہ" کے عبادت خانے کو بے اعتبار اور حقیر بنا دیا۔

ظاہر ہے اِس پر "ابرھہ" کو بہت غصہ آیا اور اس نے خانۂ کعبہ کو کُلی طور پر ویران کرنے کا پُختہ اِرادہ کر لیا۔ اُس کا خیال تھا اِس طرح وہ اِنتقام بھی لے لے گا اور عربوں کو نئے معبد کی طرف متوجہ بھی کر دے گا۔ چنانچہ وہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ، جن میں سے کچھ لوگ ہاتھیوں پر سوار تھے، مکہ کی طرف روانہ ہوا۔

جب وہ مکہ کے قریب پہنچا تو اُس نے کچھ لوگوں کو مکہ والوں کے اُونٹ اور دوسرے اموال لوٹنے کے لیے بھیجا۔ ان میں سے دو سو اُونٹ "عبدالمطلبؑ" کے بھی لُوٹ لیے گئے۔

"ابرھہ" نے کسی آدمی کو مکہ کے اندر بھیجا اور اس سے کہا کہ رئیسِ مکہ کو تلاش کر کے اس سے کہنا کہ "ابرھہ"

یمن کا بادشاہ کہتا ہے کہ : مَیں جنگ کرنے کے لیے نہیں آیا۔ مَیں تو صرف اس لیے آیا ہوں کہ اس خانہ کعبہ کو ویران کردوں۔ اگر تم جنگ نہ کرو تو مجھے تمہارا خون بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔

" ابرھہ " کا قاصد مکہ میں داخل ہوا اور رئیس دشریف مکہ کے بارے میں دریافت کیا۔ سب نے "عبدالمطلب" کی طرف راہنمائی کی۔ اس نے " عبدالمطلب " کے سامنے ماجرا بیان کیا۔ " عبدالمطلب " نے بھی یہی جواب دیا کہ ہم میں تم سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہے، رہا خانہ کعبہ تو خدا خود اس کی حفاظت کرے گا۔

" ابرھہ " کے قاصد نے عبدالمطلب سے کہا کہ تمہیں میرے ساتھ اس کے پاس چلنا پڑے گا۔ جب عبدالمطلب اس کے دربار میں داخل ہوئے تو وہ آپ کے بلند قد، حسین چہرے اور حد سے زیادہ رُعب اور دبدبہ کو دیکھ کر سخت متاثر ہوا، یہاں تک کہ " ابرھہ " ان کے احترام میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور زمین پر بیٹھ گیا اور " عبدالمطلب " کو اپنے پہلو میں بٹھالیا، کیونکہ وُہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھائے۔ اس کے بعد اس نے اپنے مترجم سے کہا کہ ان سے پُوچھ کہ ان کی کیا حاجت ہے ؟

آپ نے مترجم سے کہا : میری حاجت یہ ہے کہ میرے دو سو اُونٹ تیرے لشکری لُوٹ کرلے گئے ہیں، تو انہیں حکم دے کہ وہ میرا مال واپس کردیں۔

" ابرھہ " کو ان کے اس مطالبہ پر سخت تعجب ہوا اور اس نے اپنے مترجم سے کہا : ان سے کہو : جب مَیں نے تمہیں دیکھا تھا، تو میرے دل میں تمہاری بہت زیادہ عظمت پیدا ہوئی تھی، لیکن جب نے یہ بات کہی تو میری نظر میں تمہاری توقیر گھٹ گئی۔ تم اپنے دو سو اُونٹوں کے بارے میں تو بات کرتے ہو لیکن " کعبہ " کے بارے میں جو تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا دین ہے، اور مَیں اُسے ویران کرنے کے لیے آیا ہوں، بالکل کوئی بات نہیں کرتے۔

" عبدالمطلب " نے کہا :

" انا رب الابل، وان للبیت ربا سیمنعہ " :

" مَیں اُونٹوں کا مالک ہوں، اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے، وہ اس کی حفاظت خُود کرے گا "

(اس بات نے ابرھہ کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ سوچ میں پڑ گیا)۔

" عبدالمطلب " مکہ کی طرف آئے، اور لوگوں کو اطلاع دی کہ وہ پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو جائیں۔ اور آپ خُود ایک گروہ کے ساتھ خانہ کعبہ کے پاس آئے تاکہ دُعا کریں اور مدد طلب کریں۔ آپ نے خانہ کعبہ کے دروازے کی زنجیر میں ہاتھ ڈال کر اپنے یہ مشہور اشعار پڑھے :

لاھُمّ ان المرء یمنع رحلہ فامنع رحالک

لا یغلبن صلیبھم و محالھم ابدًا محالک

جروا جمیع بلادھم والفیل کی یسبوا عیالك

لاھم ان المرء یمنع رحله فامنع عیالك

وانصر علی آل الصلیب و عابدیه الیوم آلك[1]

"خدایا ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے گھر کی حفاظت فرما۔"

"ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی دن ان کی صلیب اور ان کی قدرت تیری قدرتوں پر غلبہ حاصل کرے۔"

"اور اپنے شہروں کی تمام توانائیاں اور ہاتھی ساتھ لے کر آئے ہیں تاکہ تیرے حرم کے ساکنوں کو قیدی بنالیں۔"

"خدایا ہر شخص اپنے گھر والوں کا دفاع کرتا ہے تُو بھی اپنے حرم امن کے رہنے والوں کا دفاع کر۔"

"اور آج اس حرم کے رہنے والوں کی آل صلیب اور اس کی عبادت کرنے والوں کے برخلاف مدد فرما۔"

اس کے بعد عبدالمطلب اطراف مکّہ کے ایک درّہ کی طرف آئے ، قریش کی ایک جماعت کے ساتھ وہاں پناہ لی اور اپنے ایک بیٹے کو حکم دیا کہ وہ کوہ ابوقبیس کے اُوپر جاکر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔

آپ کا بیٹا بڑی تیزی کے ساتھ آپ کے پاس آیا اور کہا : بابا جان ! سمندر (دریائے احمر) کی طرف سے ایک سیاہ بادل آتا ہوا نظر آرہا ہے۔ عبدالمطلب خوش ہوگئے اور پکار کر کہا :

"یا معشر قریش ! ادخلوا منازلکم فقد اتاکم الله بالنصر من عنده"

"اے جمعیت قریش اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاؤ کیونکہ خدا کی نصرت تمہاری مدد کے لیے آرہی ہے۔ یہ تو اس طرف کی بات تھی۔"

دوسری طرف سے ابرھہ اپنے مشہور ہاتھی پر سوار جس کا نام "محمود" تھا، اپنے کثیر لشکر کے ساتھ کعبہ کو تباہ کرنے کے لیے اطراف کے پہاڑوں سے مکّہ کی طرف اُترا، لیکن وہ اپنے ہاتھی پر جتنا دباؤ ڈالتا تھا وہ آگے نہ بڑھتا تھا ، لیکن جب وہ اس کا رُخ یمن کی طرف کرتا تھا تو وہ فوراً چل پڑتا تھا۔ ابرھہ اس واقعہ سے سخت متعجب ہوا اور حیرت میں ڈوب گیا۔

اسی اثنا میں سمندر کی طرف سے غول کے غول اور جُھنڈ کے جُھنڈ چھوٹے چھوٹے پرندوں کے آن پہنچے ، جن میں سے ہر ایک کے پاس تین تین کنکریاں تھیں ، ایک ایک چونچ میں اور دو دو پنجوں میں، جو تقریباً چنے کے دانے کے برابر تھیں۔ انہوں نے یہ کنکریاں ابرھہ کے لشکر پر برسانی شروع کر دیں۔ یہ کنکریاں جس کسی کو لگتیں وہ ہلاک ہو جاتا۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ کنکریاں ان کے بدن پر جہاں بھی لگتیں سُوراخ کر دیتی تھیں، اور دوسری طرف نکل جاتی تھیں۔

اس وقت ابرھہ کے لشکر پر ایک عجیب و غریب وحشت طاری ہوگئی۔ جو زندہ بچے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، اور واپسی کے لیے

---

[1] مورخین و مفسرین نے اُوپر والے اشعار کو مختلف طور پر نقل کیا ہے۔ جو کچھ اُوپر نقل کیا گیا ہے وہ مختلف نقلوں کا مرکب خلاصہ ہے۔

یمن کی راہ پوچھتے تھے، لیکن مسلسل خرابوں کے پتوں کی طرح سڑک کے بیچوں بیچ گر جاتے تھے۔

ایک پتھر خود "ابرھہ" کے آکر لگا اور وہ زخمی ہوگیا۔ اس کو صنعا (یمن کے پائے تخت) کی طرف واپس لے گئے اور وہ وہاں جاکر ہلاک ہوگیا۔

بعض نے کہا ہے کہ چیچک کی بیماری پہلی مرتبہ عرب میں اسی سال پھیلی تھی۔

ہاتھیوں کی تعداد جو ابرھہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، بعض نے وہی "محمود" ہاتھی، بعض نے آٹھ، بعض نے دس اور بعض نے بارہ لکھی ہے۔

مشہور قول کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت اسی سال ہوئی اور عالم آپ کے نور وجود سے منور ہوگیا۔ لہٰذا بہت سے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان دونوں واقعات کے درمیان ایک رابطہ موجود تھا۔

بہرحال اس عظیم حادثہ کی اس قدر اہمیت تھی کہ اس سال کا نام عام الفیل (ہاتھی کا سال) رکھا گیا اور یہ عربوں کی تاریخ کا مبدا[1] قرار پایا۔

تفسیر

"ابرھہ" سے کہہ دو کہ آنے میں جلدی نہ کرے

اس سورہ کی پہلی آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا"؟ (الم ترکیف فعل ربک باصحاب الفیل)۔

وہ اپنی پوری قدرت و طاقت اور لشکر کے ساتھ آئے تھے تاکہ خانۂ خدا کو ویران و تباہ کردیں اور خدا نے ایک ایسے لشکر کے ساتھ، جو بظاہر بہت ہی چھوٹا اور بے حیثیت تھا، انہیں درہم برہم کردیا۔ ہاتھیوں کو چھوٹے سے پرندوں کے ساتھ، اور اس زمانہ کے ترقی یافتہ اسلحہ کو "سجیل" پتھریلی کنکریوں کے ساتھ بیکار کردیا تاکہ اس مغرور و سرکش انسان کی کمزوری و ناتوانی کو قدرت الٰہی کے مقابلہ میں ظاہر و آشکار کرے۔

الم تر (کیا تُو نے نہیں دیکھا؟) کی تعبیر، حالانکہ یہ حادثہ ایسے زمانہ میں رُونما ہُوا تھا کہ پیغمبرؐ نے ابھی دُنیا میں آنکھ نہیں کھولی تھی، یا یہ آپ کی پیدائش سے قریب تر تھا، اسی وجہ سے مذکورہ حادثہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے بہت ہی نزدیک تھا، اس کے علاوہ یہ اتنا مشہور و معروف اور متواتر تھا کہ گویا پیغمبرؐ نے اپنی چشم مبارک سے اس کا مشاہدہ کیا ہوا تھا، اور پیغمبرؐ کے معاصرین میں سے ایک گروہ نے یقینی طور پر اُسے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔

"اصحاب الفیل" کی تعبیر انہیں چند ہاتھیوں کی وجہ سے ہے جنہیں وہ اپنے ساتھ یمن سے لائے تھے تاکہ مخالفین کو

---

[1] "سیرۃ ابن ہشام" جلد ۱ ص ۳۸ تا ۶۲ "بلوغ الارب" جلد ۱ ص ۲۵۰ تا ۲۶۳ "بحارالانوار" جلد ۱۵ ص ۱۳۰ سے آگے "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۴۲

مرعوب کریں، اور اُونٹ اور گھوڑے انہیں دیکھ کر بدک جائیں اور میدانِ جنگ میں نہ ٹھہر سکیں۔[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "کیا خدا نے ان کے منصوبہ کو خاک میں نہیں ملا دیا" (الم یجعل کیدھم فی تضلیل)۔

ان کا ارادہ یہ تھا کہ خانہ کعبہ کو تباہ کر ڈالیں تاکہ یمن کے گرجے کو مرکزیت حاصل ہو اور تمام قبائل عرب اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ لیکن وہ نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ اس ماجرے نے ــ جس کی شہرت تمام جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی تھی ــ مکّہ اور خانہ کعبہ کی عظمت کو اور چار چاند لگا دیے اور اس کے مشتاق دلوں کو پہلے سے بھی زیادہ اس کی طرف متوجہ کر دیا اور شہر کو اور بھی زیادہ پُرامن بنا دیا۔

"تضلیل" سے مراد، جو وہی گمراہ کرنا ہے یہ ہے، کہ وہ ہرگز اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے۔

اس کے بعد اس ماجرے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا نے گروہ در گروہ پرندے ان کے سروں پر بھیج دیے"۔ (وارسل علیھم طیرًا ابابیل)۔

"ابابیل" لوگوں کی زبانوں پر جو کچھ مشہور ہے اس کے برخلاف یہ اس پرندے کا نام نہیں تھا، بلکہ یہ وصفی معنی رکھتا ہے۔ بعض نے اسے (متفرق گروہوں) کے معنی میں سمجھا ہے، اس معنی میں کہ مذکورہ پرندے گروہ در گروہ ہر طرف ہاتھیوں کے لشکر کی طرف آئے تھے۔

یہ لفظ جمع کے معنی دیتا ہے، جس کا مفرد بعض نے "ابابلہ" یعنی پرندوں یا گھوڑوں یا اُونٹوں کا گروہ سمجھا ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی جمع ہے جس کی جنس کا مفرد نہیں ہے۔

بہرحال "طیر" یہاں جمع کا معنی دیتا ہے، اور یہ دونوں الفاظ "طیر" و "ابابیل" مجموعی طور پر گروہ در گروہ پرندوں کے معنی میں ہے (ایسا نہیں ہے کہ ابابیل ان پرندوں کا نام ہو)۔

اس بارے میں کہ یہ پرندہ کون سا پرندہ تھا ــ جیسا کہ ہم نے داستانوں کی تفصیل میں بیان کیا ہے ــ مشہور یہ ہے کہ وہ پرندے کوّے یا چیل کی طرح کے پرندے تھے جو بحرِ احمر کی راہ سے اُٹھے تھے اور ہاتھیوں کے لشکر کی طرف آئے تھے۔

بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے: "ان پرندوں نے اس لشکر کو سجیل (پتھریلی مٹی) کے چھوٹے چھوٹے کنکروں سے نشانہ بنایا تھا"۔ (ترمیھم بحجارۃ من سجیل)۔[2]

اور جیسا کہ اس ماجرے کی تفصیل میں ہم نے تواریخ، تفاسیر اور روایات سے نقل کیا ہے، ان چھوٹے چھوٹے پرندوں میں سے ہر ایک نے چنے کے دانے کے برابر یا اس سے بھی چھوٹی چھوٹی کنکریاں اُٹھائی ہوئی تھیں، ایک ایک کنکری چونچ میں اور دو دو اپنے پنجوں میں۔ اور یہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں جس پر بھی پڑتی تھیں، اسی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی تھیں۔

جیسا کہ بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی مانند بنا دیا"۔ (فجعلھم کعصف مأکول)۔

---

[1] "فیل" اگرچہ یہاں مفرد ہے، لیکن جنس و جمع کا معنی رکھتا ہے۔

[2] "سجّیل" فارسی کا لفظ ہے جو "سنگ" (پتھر) اور "گل" (مٹی) سے لیا گیا ہے، اسی بنا پر وہ ایک ایسی چیز ہوتی ہے جو نہ پتھر کی طرح سخت ہو اور نہ مٹی کی طرح نرم۔

"عصف" (بروزنِ حذف) اُن پتوں کو کہتے ہیں جو زراعت کی شاخ پر ہوتے ہیں اور پھر خشک ہوکر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ "گھاس" کے معنی میں ہے۔

اور بعض نے اس کی گندم کے اس چھلکے کے معنی میں تفسیر کی ہے، جب کہ وہ خوشہ میں ہوتا ہے۔

"مأکول" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گھاس جانوروں کے دانتوں کے نیچے آکر دوبارہ پس جاتا ہے اور مکمل طور پر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ پھر جانور کے معدہ نے بھی اُسے تیسری مرتبہ ریزہ ریزہ کیا ہے اور یہ چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہ سنگ ریزے جس کسی کو بھی جاکر لگتے تھے، اس کو مکمل طور پر ریزہ ریزہ کر دیتے تھے۔

یہ تعبیر ان کے شدت کے ساتھ پارہ پارہ ہونے کی دلیل قرار پانے کے علاوہ اس سرکش و مغرور اور ظاہراً طاقت ور گروہ اور جمعیت کے بے قدر و قیمت ہونے اور اس کے ضعف و ناتوانی کی طرف بھی اشارہ ہے۔

چند نکات

۱۔ ایک بے نظیر معجزہ (اس گھر کا ایک مالک ہے)

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس مفصل و طولانی داستان کو چند مختصر اور سمجھنے والے انتہائی فصیح و بلیغ جملوں میں بیان کر دیا ہے۔ اور حقیقتاً ایسے نکات بیان کیے ہیں جو قرآنی اہداف، یعنی مغرور سرکشوں کو بیدار کرنے اور خدا کی عظیم قدرت کے مقابلہ میں انسان کی کمزوری دکھانے میں مدد دیتے ہیں۔

یہ ماجرا اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ معجزات و خوارق عادات، بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف لازمی نہیں ہے کہ پیغمبر یا امام ہی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں۔ بلکہ جن حالات میں خدا چاہے اور ضروری سمجھے انجام پا جاتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ خدا کی عظمت اور اس کے دین کی حقانیت سے آشنا ہو جائیں۔

یہ عجیب و غریب اعجاز آمیز عذاب دوسری سرکش اقوام کے عذاب کے ساتھ ایک واضح فرق رکھتا ہے کیونکہ طوفانِ نوحؑ کا عذاب، اور قوم لوطؑ کا زلزلہ اور سنگ باری، قوم عاد کی تیز آندھی اور قوم ثمود کا صاعقہ طبعی حوادث کا ایک سلسلہ تھے، کہ جن کا صرف ان خاص حالات میں وقوع معجزہ تھا۔

لیکن لشکرِ ابرہہ کی نابودی کی داستان ان سنگریزوں کے ذریعے جو چھوٹے چھوٹے پرندوں کی چونچ اور پنجوں سے گرتے تھے ــ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو طبعی حوادث سے مشابہ ہو۔

ان چھوٹے چھوٹے پرندوں کا اُٹھنا، اسی خاص لشکر کی طرف آنا، اپنے ساتھ کنکریاں کا لانا، خاص طور سے اُنہیں کو نشانہ بنانا اور ان چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے ایک عظیم لشکر کے افراد کے اجسام کا ریزہ ریزہ ہو جانا، یہ سب کے سب خارقِ عادت امور ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی قدرت کے سامنے بہت ہی معمولی چیز ہے۔

وہی خدا جس نے انہیں سنگ ریزوں کے اندر ایٹم کی قدرت پیدا کی ہے، کہ اگر وہ آزاد ہو جائے تو ایک عظیم تباہی پھیلا دے۔

اس کے لیے یہ بات آسان ہے کہ ان کے اندر ایسی خاصیت پیدا کردے کہ ابرھہ کے لشکر کے جسموں کو "عصف مأکول" (کھائے ہوئے بھوسے کی مانند) بنادے۔

ہمیں بعض مصری مفسرین کی طرح اس حادثہ کی توجیہہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ان کنکریوں میں وبا یا چیچک کے جراثیم تھے۔[1]

اور اگر بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ صدمہ زدہ لوگوں کے بدنوں سے چیچک میں مبتلا افراد کی طرح خون اور پیپ آتی تھی، تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حتمی طور پر چیچک میں مبتلا تھے۔

اسی طرح سے ہمیں اس بات کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ سنگ ریزے پلے ہوئے ایٹم تھے جن کے درمیان کی فضا ختم ہوگئی تھی۔ اور وہ حد سے زیادہ سخت تھے، اس طرح سے کہ وہ جہاں بھی گرتے تھے سوراخ کردیتے تھے۔

یہ سب کی سب ایسی توجیہات ہیں جو اس حادثہ کو طبیعی بنانے کے لیے ذکر ہوئی ہیں اور ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان سنگ ریزوں میں ایسی عجیب وغریب خاصیت تھی جو جسموں کو ریزہ ریزہ کردیتی تھی۔ اس سے زیادہ اور کوئی اطلاع ہمارے پاس نہیں ہے۔ بہرحال خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کوئی کام بھی مشکل نہیں ہوتا۔

۲۔ معمولی وسیلہ سے سخت ترین سزا

قابل توجہ بات یہ ہے کہ خدا نے اس ماجرے میں متکبرین اور سرکشوں کے مقابلہ میں اپنی قدرت اعلیٰ ترین صورت میں دکھادی ہے۔ شاید دنیا میں ابرھہ کے لشکر کے عذاب سے بڑھ کر زیادہ سخت اور کوئی عذاب نہ ہو اور ان مغرور لوگوں کو اس طرح سے تباہ وبرباد کردیا جائے کہ ریزہ ریزہ اور کھائے ہوئے بھوسے (عصف مأکول) کی طرح ہوجائیں۔

اتنی بڑی قدرت وشوکت رکھنے والی جمعیت کی نابودی کے لیے نرم قسم کے سنگ ریزوں اور کمزور اور چھوٹے چھوٹے پرندوں سے کام لیا جائے۔ وہی بات کہ یہ دنیا جہان کے تمام متکبرین اور سرکشوں کے لیے ایک تنبیہہ ہے، تاکہ وہ جان لیں کہ وہ خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کس قدر ناتوان ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خدا اس قسم کے عظیم کام بہت ہی چھوٹے سے موجودات کے سپرد کردیتا ہے۔ مثلاً ایسے جراثیم کو، جو ہرگز آنکھ سے دیکھے نہیں جاسکتے، مامور کردیتا ہے کہ وہ ایک مختصر سی مدت میں سرعت کے ساتھ اپنی پیدائش بڑھاکر طاقت ور قوموں کو ایک خطرناک سرایت کرنے والی بیماری، مثلاً: "وبا" و "طاعون" میں مبتلا کردے۔ اور ایک مختصر سی مدت میں خزاں کے پتوں کی طرح زمین پر ڈھیر کردے۔

یمن کا عظیم بند (سدمارب) ــــ جیسا کہ ہم نے سورۂ سبا کی تفسیر میں بیان کیا ہے ــــ زیادہ آبادی اور ایک عظیم طاقت ور تمدن کی پیدائش کا ذریعہ بنی۔ اور اس کے بعد اس قوم کی سرکشی بڑھ گئی، لیکن اس قوم کی نابودی کا فرمان جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے،

---

[1] "تفسیر عبدہ" جزء عم ص ۱۵۸ ملاحظہ ہو۔

اگر بعض تواریخ میں یہ آیا ہے کہ عرب کے شہروں میں چیچک کا مرض پہلی مرتبہ اسی سال دیکھنے میں آیا ہے تو یہ بات اس معنی پر دلیل نہیں بنتی۔

ایک یا چند صحرائی چوہوں کے سپرد ہوا تاکہ وہ اس عظیم بند کے اندر گھس جائیں اور اس میں ایک سوراخ کر دیں۔ اس سوراخ میں پانی داخل ہونے کی وجہ سے یہ سوراخ بڑے سے بڑا ہوتا چلا گیا اور آخرکار وہ عظیم بند ٹوٹ گیا اور وہ پانی جو اس بند کے تھپیڑے مار رہا تھا، اس نے ان سب آبادیوں، گھروں اور محلوں کو ویران اور تباہ و برباد کر دیا۔ اور وہ بڑی جمعیت یا تو نابود ہوگئی یا دوسرے علاقوں میں پراگندہ اور منتشر ہوگئی۔ یہ ہے خداوندِ بزرگ و برتر کی قدرت نمائی۔

۳۔ داستانِ "فیل" کے اہداف

آگے آنے والی سورت (سورۂ لایلاف) سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ سورۂ فیل کا ایک ہدف قریش پر خدا کی عظیم نعمتوں کی یاد آوری ہے تاکہ انہیں یہ بتا دے کہ اگر پروردگار کا لطف نہ ہوتا تو نہ تو اس مقدس مرکز یعنی مکہ و کعبہ کے آثار ہوتے اور نہ ہی قریش ہوتے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اسی طرح کبر و غرور کی سواری سے نیچے اُتر آئیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

دوسری طرف یہ ماجرا، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میلاد کے قریب قریب ساتھ واقع ہوا تھا، حقیقت میں اس عظیم ظہور کا پیش خیمہ تھا اور اس قیام کی عظمت کا پیام لانے والا تھا۔ اور یہ وہی چیز ہے جسے مفسرین نے "ارھاص" سے تعبیر کیا ہے[1]

اس واقعہ کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ یہ ساری دنیا جہان کے سرکشوں کے لیے ایک تنبیہ ہے، چاہے وہ قریش ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور ہوں، کہ وہ جان لیں کہ وہ ہرگز پروردگار کی قدرت کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ وہ خیالِ خام کو اپنے سر سے نکال دیں، اس کا حکم مانیں اور حق و عدالت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

چوتھا مقصد اس عظیم گھر کی اہمیت کو ظاہر کرنا ہے کہ جب "کعبہ" کے دشمنوں نے اس کو نابود کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور وہ اس ابراہیمی سرزمین کی مرکزیت کو دوسری جگہ منتقل کرنا چاہتے تھے، تو خدا نے ان کی اس طرح سے گوشمالی کی کہ ساری دنیا کے لیے باعثِ عبرت بن گئی اور اس مقدس مرکز کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا۔

اور پانچواں مقصد یہ ہے کہ، وہ خدا جس نے اس سرزمینِ مقدس کی امنیت کے بارے میں ابراہیمؑ خلیل کی دعا کو قبول کیا تھا، اور اس کی ضمانت دی تھی، اس نے اس ماجرے میں اس بات کی نشان دہی کر دی ہے کہ اس کی مشیت یہی ہے کہ یہ توحید و عبادت کا مرکز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مرکزِ امن رہے۔

۴۔ ایک مسلّم تاریخی روئیداد

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "اصحابِ فیل" کا ماجرا عربوں کے درمیان ایسا مسلّم تھا کہ یہ ان کے لیے تاریخ کا آغاز قرار پایا اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، قرآن مجید نے ایک نہایت ہی عمدہ تعبیر "الم تر" (کیا تُو نے نہیں دیکھا) کے ساتھ اس کا

---

[1] "ارھاص" ان معجزات کے معنی میں ہے جو پیغمبرؐ کے قیام سے قبل واقع ہوں اور اس کی دعوت کے لیے زمین ہموار کرنے والے ہوں۔ یہ لفظ اصل میں بنیاد گزاری اور پہلا سنگِ بنیاد رکھنے کے معنی میں ہے جسے دیوار کے نیچے رکھتے ہیں اور آمادہ ہونے اور (کھڑے ہونے) کے معنی میں بھی آیا ہے۔

ذکر کیا ہے، وہ بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے جو نہ تو اس زمانہ میں موجود تھے اور نہ ہی اُسے دیکھا تھا، جو اس ماجرے کے مسلّم ہونے کی ایک اور نشانی ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین مکّہ کے سامنے ان آیات کی تلاوت کی تو کسی نے اس کا انکار نہ کیا۔ اگر یہ مطلب مشکوک ہوتا تو کم از کم کوئی تو اعتراض کرتا اور ان کا اعتراض ان کے باقی اعتراضوں کی طرح ہی تاریخ میں ثبت ہو جاتا، خصوصاً جب کہ قرآن نے جملہ "الم تر" کے ساتھ اس مطلب کو ادا کیا تھا۔

خداوندا! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم اس توحید کے عظیم مرکز کی پاسداری کریں۔

پروردگارا! ان لوگوں کے ہاتھ، جو اس مقدس مرکز کی ظاہری حفاظت پر قناعت کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت کے پیام کو نظر انداز کرتے ہیں، اس مرکز سے کاٹ دے۔

بارالہا! تمام اشتیاق رکھنے والوں کو مکمل آگاہی و عرفان کے ساتھ اس کی زیارت نصیب فرما۔

❖ ❖ ❖

آمین یارب العالمین

اختتام سورۂ فیل

اختتام ترجمہ

۲ شوال ۱۴۰۸ھ صبح سات بج کر دس منٹ

برمکان حقیر قم مقدس ایران

سُورَۂ قُرَیش

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا۔

❖ اِس میں ۴ آیات ہیں۔

سُورۂ "قریش" کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سُورہ حقیقت میں سُورۂ فیل کی تکمیل کرنے والی سمجھی جاتی ہے اور اس کی آیات اس مطلب پر واضح دلیل ہیں۔

اِس سُورہ کا مضمون قریش پر خدا کی نعمت اور ان کے بارے میں اس کے الطاف اور محبتوں کا بیان ہے، تاکہ ان میں شکر گزاری کا احساس پیدا ہو اور یہ اس عظیم گھر کے پروردگار کی عبادت کے لیے۔ جس سے ان کا سارا شرف اور افتخار ہے۔ تیار ہو جائیں۔

جیسا کہ ہم نے سُورۂ "والضحیٰ" کے آغاز میں بیان کیا تھا کہ یہ سُورہ اور سُورہ الم نشرح حقیقت میں ایک شمار ہوتی ہے، اسی طرح سُورۂ "فیل" اور سُورۂ "قریش" بھی ایک ہی شمار ہوتی ہیں۔ کیونکہ اگر ہم ٹھیک طرح سے ان دونوں کے مطالب پر غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ ان دونوں کے مطالب ایک دوسرے کے ساتھ اِتنے مِلتے جلتے ہیں کہ وہ دونوں کے ایک ہونے کی دلیل بن سکتے ہیں۔

اسی بنا پر نماز کی ہر رکعت میں ایک مکمل سُورت پڑھنے کے لیے اگر کوئی شخص اُوپر والی سُورتوں کا انتخاب کرے تو ضروری ہے کہ وہ دونوں کو اکٹھا پڑھے۔

اِس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے فقہی کتابوں (کتاب صلوٰۃ بحث قرأت) کی طرف رجوع کیا جائے۔[1]

اِس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں یہی بات کافی ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرمؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"من قرأها اعطی من الاجر عشر حسنات، بعدد من طاف بالکعبة، واعتکف بها"

"جو شخص اس کو پڑھے تو اُسے ان لوگوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں دی جائے گی، جنہوں نے خانہ کعبہ کا طواف کیا ہے، یا وہاں اعتکاف کیا ہے"۔[2]

مسلّم طور پر اس قسم کی فضیلت اس شخص کے لیے ہے جو اس خدا کی بارگاہ میں جو کعبہ کا پروردگار ہے سرِ تعظیم جھکائے، اس کی عبادت کرے، اس گھر کے احترام کو مدِ نظر رکھے، اس کا پیام دل کے کان سے سُنے اور اس کی پابندی کرے۔

---

[1] مرحوم شیخ حر عاملی نے کتاب وسائل میں اس مطلب کو روایات جلد ۴ ص ۸۳۰ (باب ۱ از ابواب قرأت نماز) میں نقل کیا ہے۔

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۴۳۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ
۲۔ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۚ
۳۔ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۙ
۴۔ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۧ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خُدا کے نام سے

۱۔ (اصحابِ فیل کا عذاب) اس بنا پر تھا کہ قریش (اس سرزمینِ مقدس سے) اُلفت رکھیں۔ (اور پیغمبرؐ کے ظہُور کے مقدمات فراہم ہوں)۔
۲۔ انہیں سردیوں اور گرمیوں کے سفروں سے اُلفت ہے۔
۳۔ پس (اس عظیم نعمت کے شکرانے کے طور پر) اس گھر کے پروردگار کی عبادت کریں۔
۴۔ وہی جس نے انہیں بھُوک سے نجات دی اور بدامنی سے نجات بخشی۔

تفسیر

اس گھر کے پروردگار کی عبادت کرنی چاہیئے۔

چونکہ گزشتہ سُورہ (سورۂ فیل) میں اصحابِ فیل اور ابرہہ کے لشکر کی نابودی کی تفصیل بیان ہوئی تھی، جو خانہ کعبہ کو نابود کرنے اور اس خدائی مرکزِ مقدس کو ویران کرنے کے ارادہ سے آیا تھا، لہٰذا اس سُورہ کی پہلی آیت میں، جو حقیقت میں سُورۂ فیل کا ایک (تکمیلی بیان) ہے، فرماتا ہے: "ہم نے ہاتھیوں کے لشکر کو نابود کرکے انہیں کھائے ہوئے بھوسہ کے مانند ریزہ ریزہ کر دیا، "تاکہ قریش اس مقدس سرزمین سے اُلفت پیدا کریں" اور پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے مقدمات فراہم ہوں۔ (لایلاف قریش)[1]

"ایلاف" مصدر ہے، اور اُلفت بخشنے کے معنی میں ہے اور "اُلفت" انس و محبت اور گھل مل جانے کے ساتھ اجتماع کے معنی میں ہے، اور یہ جو بعض نے "ایلاف" کی "مؤالفت اور" عہد و پیمان" کے ساتھ تفسیر کی ہے، تو وُہ نہ تو اس لفظ کے ساتھ مناسب ہے جو بابِ افعال کا مصدر ہے، اور نہ ہی اس سُورہ کی آیات کے مضمون سے۔

بہرحال اس سے مُراد قریش اور سرزمینِ مکہ اور خانہ کعبہ کے درمیان اُلفت پیدا کرنا ہے کیونکہ قریش اور تمام اہلِ مکہ اس سرزمین کی مرکزیت اور امنیت کی بنا پر ہی وہاں رہائش پذیر تھے۔ حجاز کے بہت سے لوگ ہر سال وہاں آتے تھے اور مراسم حج بجالاتے تھے، اقتصادی اور ادبی مبادلات رکھتے تھے اور اس سرزمین کی مختلف برکات سے استفادہ کرتے تھے۔

یہ سب کچھ اس کی مخصوص سلامتی کی وجہ سے تھا۔ اگر ابرہہ یا کسی اور کی لشکر کشی سے اس کی سلامتی اور امنیت مخدوش ہو جاتی، یا خانہ کعبہ ویران ہو جاتا، تو پھر کسی کو اس سرزمین سے اُلفت و محبت نہ رہتی۔

"قریش" کا لفظ، جیسا کہ بہت سے مفسرین اور اربابِ لغت نے کہا ہے اصل میں سمندر کے عظیم جانوروں کی ایک نوع کے معنی میں ہے، جو ہر جانور کو آسانی کے ساتھ کھا لیتی ہے۔ یہ عبارت "ابنِ عباس" سے مشہور ہے کہ جب ان سے سوال ہوا کہ قریش کو "قریش" کیوں کہتے ہیں؟ تو انہوں نے یہ جواب دیا:

"لدابة تكون في البحر من اعظم دوابه يقال لها القرليش، لاتمر بشيء من الغث والسمين الا اكلته"!:

"یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ سمندر کے ایک بہت بڑے جانور کا نام ہے، وہ جس دُبلے یا موٹے جانور کے پاس سے گزرتا ہے اُسے کھا جاتا ہے"۔

اس کے بعد وہ اپنی بات کے ثبوت میں اشعارِ عرب سے شہادت پیش کرتے ہیں۔

---

[1] "لایلاف" میں "لام" علت کے معنی میں ہے اور "جار و مجرور" "جعل" سے متعلق ہے، جو گزشتہ سُورہ کی آیہ "فجعلهم كعصف مأكول" میں، یا کسی اور دوسرے فعل کے جو اس سُورہ میں تھا۔ بعض نے اس جار و مجرور کو فليعبدوا کے جملہ سے متعلق سمجھا ہے، جو بعد والی آیات میں آیا ہے لیکن یہ احتمال آیات کے مفہوم کے ساتھ چنداں سازگار نہیں ہے اور پہلا معنی بہتر ہے۔

اِس بنا پر اس قبیلہ کے لیے اس نام کا انتخاب، اس قبیلہ کی قدرت و قوت اور اس قدرت سے غلط فائدہ اُٹھانے کی وجہ سے ہوا۔

لیکن بعض نے اسے "قرش" (بروزن فرش) کے مادّہ سے اکتساب کے معنی میں لیا ہے، کیونکہ عام طور پر یہ قبیلہ تجارت اور کسب میں مشغول رہتا تھا۔

بعض اس مادّہ کو خبرگیری اور دیکھ بھال کرنے کے معنی میں جانتے ہیں اور چونکہ قریش حاجیوں کے حالات کی خبرگیری کرتے تھے اور بعض اوقات ان کی مدد کرتے تھے، اس لیے یہ لفظ ان کے لیے منتخب ہوا۔

"قریش" لغت میں اجتماع کے معنی میں بھی آیا ہے کیونکہ یہ قبیلہ ایک خاص قسم کی تنظیم اور اجتماع رکھتا تھا، اِس لیے یہ نام ان کے لیے انتخاب ہوا۔

لیکن بہرحال موجودہ زمانہ میں قریش کسی اچھے مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا، اور باوجود اس کے کہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبیلہ تھا، اسلام کا سخت ترین دشمن شمار ہوتا تھا جو کسی قسم کی عہد شکنی، عداوت اور دشمنی سے نہیں چوکتا تھا۔ یہاں تک کہ جب ان کی قدرت و طاقت اسلام کی کامیابی کی وجہ سے دم توڑ گئی تو پھر بھی انہوں نے مخفی سازشوں کو جاری رکھا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد بھی انہوں نے ایسے دردناک حوادث پیدا کیے جنہیں تاریخ اسلام کبھی فراموش نہیں کرے گی ہم جانتے ہیں کہ "بنی اُمیہ" اور "بنی عباس" جو طاغوتی حکومت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے، قریش میں سے ہی اُٹھے تھے۔

قرائن بھی اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ وہ عربوں کے زمانۂ جاہلیت میں بھی لوگوں کے استثمار و استعمار کی کوشش میں لگے رہتے تھے اور اسی وجہ سے جب آزادی بخش اسلام نے طلوع کیا اور ان کے ناجائز منافع خطرے میں پڑ گئے تو وہ پُوری طاقت کے ساتھ مبارزہ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ لیکن اسلام کی عظیم قدرت نے انہیں درہم برہم کر دیا۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "ہدف اور مقصد یہ تھا کہ خدا قریش کو سردیوں اور گرمیوں کے سفروں میں اُلفت بخشے:

(ایلافھم رحلۃ الشتاء والصیف)[1]

ممکن ہے کہ اس سرزمین مقدس سے قریش کو اُلفت بخشنا مراد ہو، تاکہ وہ گرمیوں اور سردیوں کے طویل سفروں میں اس مقدس مرکز سے اپنا تعلق اور لگاؤ دل سے نہ بھلائیں اور اس کی سلامتی کی وجہ سے اس کی طرف لوٹ آئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سرزمین یمن اور شام کی زندگی کی آسائشوں سے متاثر ہو کر مکہ کو خالی چھوڑ دیں۔

یا اس سے ان دو عظیم سفروں میں قریش اور دوسرے لوگوں کے درمیان اُلفت پیدا کرنا مراد ہے، کیونکہ ابرہہ کی داستان کے

---

[1] "ایلافھم" اس "ایلاف" کا بدل ہے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے، اور "ھم" کی ضمیر پہلا مفعول ہے۔ اور "رحلۃ الشتاء" دوسرا مفعول ہے اور بعض کے نظریے کے مطابق ظرفیت کے معنی میں ہے۔ اور ممکن ہے کہ وہ "منصوب بنزع خافض" ہو، اور تقدیر میں اس طرح ہو "ایلافھم من رحلۃ الشتاء والصیف" (دوسرا اور تیسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔)

[2] "رحلۃ" در اصل "رحل" (بروزن شہر) سے، اس پردہ کے معنی میں ہے جو سوار ہونے کے لیے ڈالتے ہیں۔ اسی مناسبت سے، خود اُونٹ پر یا ان مسافرتوں پر جو اُونٹ یا دُوسرے ذرائع سے ہوتی ہیں، پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

بعد لوگ انہیں دوسری نظر سے دیکھتے تھے اور قریش کے قافلہ کے احترام و اہمیت کے قائل تھے۔

قریش کو اس طویل سفر میں بھی امن کی ضرورت تھی اور سرزمینِ مکہ کے لیے بھی، اور خدا نے ابرھہ کے لشکر کی شکست کے نتیجہ میں یہ دونوں سلامتیاں انہیں بخش دی تھیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ "مکہ" کی زمین میں نہ تو کوئی باغ تھا اور نہ ہی کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ جانوروں کی دیکھ بھال بھی ان کی محدود تھی، ان کی درآمد زیادہ تر انہیں تجارتی قافلوں کے ذریعے پوری ہوتی تھی۔ وہ سردی کے موسم میں جنوب یعنی سرزمینِ یمن کی طرف ــــ جس کا موسم نسبتاً گرم ہوتا تھا ــــ رُخ کرتے تھے اور گرمی کے موسم میں شمال اور سرزمینِ شام کی طرف ــــ جس کی ہوا اور موسم خوشگوار ہوتا تھا۔ اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ سرزمینِ یمن بھی اور سرزمینِ شام بھی، اس زمانہ میں اہم تجارتی مراکز تھے۔ اور مکہ اور مدینہ ان دونوں کے درمیان حلقۂ اتصالی شمار ہوتے تھے۔

البتہ قریش ان غلط کاریوں کی وجہ سے، جو وُہ انجام دیتے تھے، خدا کے ان الطاف و محبت کے مستحق تو نہ تھے۔ لیکن چونکہ یہ مقدر ہو چکا تھا کہ اس قبیلہ اور اس سرزمینِ مقدس سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طلوع ہو، لہٰذا خدا نے ان پر یہ لُطف فرمایا۔

بعد والی آیت میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قریش کو ان سب خدائی نعمتوں کی وجہ سے جو انہیں کعبہ کی برکت سے حاصل ہوئی تھیں "اس گھر کے پروردگار کی عبادت کرنا چاہیئے نہ کہ بُتوں کی": (فلیعبدوا ربّ ھٰذا البیت)۔

"وہی خدا جس نے انہیں بھوک سے نجات بخشی اور کھانا دیا، اور بے امنی سے رہائی بخشی اور امن دیا": (الذی اطعمھم من جوع وآمنھم من خوف)[1]

ایک طرف تو انہیں تجارت میں فروغ عطا کیا اور انہیں فائدہ پہنچایا اور دوسری طرف بدامنی کو ان سے دُور کر دیا اور دفع ضرر کیا۔ اور یہ سب کچھ ابرھہ کے لشکر کی شکست سے فراہم ہوا۔ اور حقیقت میں یہ کعبہ کے بانی ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کی قبولیت تھی۔ لیکن انہوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی۔ اس مقدس گھر کو ایک بُت خانہ میں تبدیل کر دیا، بُتوں کی عبادت کو اس گھر کے خدا کی عبادت پر ترجیح دی اور انجام کار ان تمام ناشکریوں کا انجام بد دیکھا۔

خداوندا! ہمیں عبادت و بندگی اور نعمتوں کا شکر ادا کرنے اور اس عظیم گھر کی حفاظت، پاسداری اور احترام کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! اس عظیم اسلامی مرکز کو روز بروز زیادہ سے زیادہ پُرشکوہ، اور دُنیا جہان کے مُسلمانوں کے لیے حلقۂ اتصال قرار دے۔

بار الٰہا! سارے خونخوار دشمنوں اور ان لوگوں کے جو اس عظیم مرکز سے غلط فائدہ اُٹھاتے ہیں، ہاتھ کاٹ دے۔

❖ ❖ ❖

اختتام ترجمہ
۲ شوال ۱۴۰۱ھ
قم مقدسہ۔ ایران

آمین یا ربّ العالمین
سُورۂ قریش کا اختتام

---

[1] بعض مفسرین نے اس آیت کو دو آیات سمجھا ہے، اور اس سُورہ کی آیات کو پانچ آیات شمار کیا ہے، لیکن مشہور و معروف یہ ہے کہ یہ ایک آیت ہے، اور سُورہ کی چار ہی آیات ہیں۔

سُورَہ اَلْمَاعُون

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا۔

❖ اِس میں ۷ آیات ہیں۔

سُورۂ ماعون کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سُورہ بہت سے مفسرین کے نظریہ کے مطابق مکی سورتوں میں سے ہے ۔ اس کی آیات کا لب ولہجہ ، جو مختصر اور چُبھنے والے مقاطع ہیں قیامت اور اس کے منکرین کے اعمال کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، اس مطلب کی ناطق گواہ ہیں۔

مجموعی طور پر اس سُورہ میں منکرینِ قیامت کی صفات و اعمال کو پانچ مرحلوں میں بیان کیا گیا ہے، کہ وہ اس عظیم دن کی تکذیب کی وجہ سے راہِ خدا میں " انفاق" کرنے اور " یتیموں" اور " مسکینوں کی مدد کرنے سے کس طرح رُوگردانی کرتے ہیں اور وہ " نماز" کے بارے میں کیسے غافل اور ریاکار ہیں، اور " حاجت مندوں" کی مدد کرنے سے کس طرح رُوگردانی کرتے ہیں؟

اِس سُورہ کی شانِ نزول کے بارے میں بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ ابوسفیان کے بارے میں نازل ہوا ہے جو روزانہ دو بڑے بڑے اُونٹ نحر کیا کرتا تھا اور وُہ خود اور اس کے یار دوست اُنہیں کھاتے تھے۔ لیکن ایک دن ایک یتیم آیا اور اس نے اُن سے کچھ مانگا تو اُس نے اپنے عصا سے اُسے مارا ، اور اُسے دُور کر دیا۔

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ " ولید بن مغیرہ" یا " عاص بن وائل" کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

اِس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے :

" من قرأ أرءيت الذى يكذب بالدين فى فرائضه و نوافله قبل الله صلاته وصيامه، ولم يحاسبه بما كان منه فى الحياة الدنيا":

" جو شخص اس سُورہ کو اپنی فریضہ اور نافلہ نمازوں میں پڑھے گا تو خدا اس کے نماز و روزہ کو قبول کرے گا اور ان کاموں کے مقابلہ میں جو اس سے دنیا کی زندگی میں سرزد ہوئے ہیں اس کا کوئی حساب نہیں لے گا۔" [1]

---

[1] " مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۴۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۝
۲۔ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۝
۳۔ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ۝
۴۔ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۝
۵۔ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝
۶۔ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ ۝
۷۔ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ کیا تُو نے اس شخص کو دیکھا ہے، جو ہمیشہ ہی روزِ جزا کا انکار کرتا رہتا ہے؟
۲۔ وہی تو ہے، جو یتیم کو سختی کے ساتھ دھکے دیتا ہے۔
۳۔ اور دوسروں کو مسکین کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتا۔
۴۔ پس ان نمازگزاروں پر وائے ہے، جو
۵۔ اپنی نمازوں کو بھول جاتے ہیں۔

۶۔ وہی جو ریاکاری کرتے ہیں۔

۷۔ اور دوسروں کو ضروریاتِ زندگی سے باز رکھتے ہیں۔

تفسیر

معاد کے انکار کے اثراتِ بد

اس سُورہ میں پہلے پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے منکرین کے اعمال میں روزِ جزا کے انکار کے اثراتِ بد کو بیان کرتا ہے:۔

"کیا تُو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو ہمیشہ روزِ جزا کا انکار کرتا ہے" (ارءیت الذی یکذّب بالدّین)۔

اِس کے بعد ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر مزید فرماتا ہے، "وہی تو ہے جو یتیم کو سختی کے ساتھ دھکے دیتا ہے" (فذالك الّذی یدع الیتیم)۔

"اور دوسروں کو مسکین و نادار کو کھانا کھلانے کے لیے شوق نہیں دلاتا" (ولا یحض علی طعام المسکین)۔

"دین" سے مُراد یہاں "جزا" یا "روزِ جزا" ہے۔ اور روزِ جزا اور اس کی عظیم دادگاہ کے انکار سے انسان کے عمل میں ایک وسیع ردِّعمل پیدا ہوتا ہے۔ جس کے پانچ حصّوں کی طرف اس سُورہ میں اشارہ ہوا ہے۔ منجملہ: یتیموں کو سختی کے ساتھ دھتکارنا اور دوسرے لوگوں کو مسکینوں کو کھانا کھلانے کا شوق نہ دلانا۔ یعنی نہ تو خُود ہی انفاق کرنا اور نہ ہی دوسروں کو اس کام کی دعوت دینا۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں "دین" سے مراد قرآن یا تمام آئین و دینِ اسلام ہے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ اور اس کی نظیر سورہ انفطار کی آیہ ۹ کلّا بل تکذبون بالدین، اور سورہ "تین" کی آیہ ۷ فما یکذبك بعد بالدّین میں بھی آئی ہے۔ جہاں ان سُورتوں کی دوسری آیات کے قرینہ سے دین سے مراد روزِ جزا ہے۔

"یدع" "دعّ" (بروزن حد) کے مادّہ سے، سختی کے ساتھ دُور کرنے اور غصّہ کے ساتھ دھتکارنے کے معنی میں ہے اور "یحض" "حض" کے مادّہ سے کسی چیز کے لیے دوسروں کو تحریص و ترغیب دینے کے معنی میں ہے[1]۔ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے، "حص" چلنے اور سیر کرنے کے لیے شوق دلانا ہے۔ لیکن "حض" اس طرح نہیں۔

چونکہ "یحض" اور "یدع" فعل مضارع کی صورت میں آئے ہیں، لہٰذا یہ اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ یتیموں اور

---

[1] "مفردات" مادّہ "حض"

مسکینوں کے بارے میں ان کا یہ کام دائمی طور پر تھا۔

یہ نکتہ بھی یہاں پر قابل توجہ ہے کہ یتیموں کے بارے میں انسانی شفقت اور مہربانی کرنے کا مسئلہ کھانا کھلانے اور سیر کرنے کی نسبت زیادہ عمدہ ہے۔ کیونکہ یتیم کو سب سے زیادہ رنج اور دکھ شفقت و مہربانی کے مرکز اور غذائے روحی کے ہاتھ سے چلے جانے کی وجہ سے ہوتا ہے، اور جسمانی غذا کا مرحلہ بعد میں آتا ہے۔

پھر ان آیات میں ہمارے سامنے مسکینوں کو کھانا کھلانے کا مسئلہ آتا ہے، جو اہم ترین کارہائے خیر میں سے ہے۔ یہاں تک کہ فرماتا ہے کہ اگر کوئی شخص خود کسی مسکین کو کھانا کھلانے کی قدرت نہیں رکھتا، تو دوسروں کو اس بات کی ترغیب دے اور شوق دلائے۔

"فذالك" کی تعبیر (اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہاں "فا" سببیت کا معنی دیتا ہے) اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ معاد پر ایمان کا نہ ہونا ان غلط کاریوں کا سبب بنتا ہے، اور واقعاً ایسا ہی ہے۔ وہ شخص جو دل کی گہرائیوں کے ساتھ اس عظیم دن اور اس دادگاہ عدل، اور اس حساب و کتاب اور جزا و سزا پر یقین رکھتا ہو، اس کے تمام اعمال میں اس کے مثبت آثار ظاہر ہوں گے۔ لیکن جو اس پر ایمان نہیں رکھتے تو گناہ کرنے اور انواع و اقسام کے جرائم کرنے پر ان کی جرأت کرنے میں اس کے اثرات کامل طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔

اس گروہ کی تیسری صفت کے بارے میں فرماتا ہے: پس ان نمازگزاروں پر ولے ہے"۔ (فویل للمصلین)۔

"وہی نمازی جو اپنی نماز کو بھول جاتے ہیں"۔ (الذین ھم عن صلاتھم ساھون)۔

وہ اس کے لیے نہ تو کسی قدر و قیمت کے قائل ہیں اور نہ ہی اس کے اوقات کو کوئی اہمیت دیتے ہیں، اور نہ ہی اس کے ارکان و شرائط اور آداب کی رعایت کرتے ہیں۔

"ساھون" "سھو" کے مادہ سے اصل میں اس خطا کے معنی میں ہے جو غفلت کی بنا پر سرزد ہو، چاہے اس کے مقدمات کے فراہم کرنے میں مقصر ہو یا نہ ہو۔ البتہ پہلی صورت میں معذور نہیں ہے، اور دوسری صورت میں معذور ہے۔ لیکن یہاں وہ سہو مراد ہے جو تقصیر کے ساتھ توأم ہو۔

اس بات پر توجہ رکھنی چاہیئے کہ یہ نہیں فرماتا کہ: "وہ اپنی نماز میں سہو کرتے ہیں"۔ چونکہ نماز میں سہو تو بہرحال ہر شخص سے ہو جاتا ہے، بلکہ فرماتا ہے: "وہ اصل نماز سے ہی سہو کرتے ہیں، اور کل کی کل نماز کو ہی بھول جاتے ہیں"۔

یہ بات واضح ہے کہ اگر اس مطلب کا ایک یا چند مرتبہ اتفاق ہو تو ممکن ہے کہ وہ کوتاہی کی وجہ سے ہو۔ لیکن جو شخص نماز کو ہمیشہ کے لیے ہی بھلائے ہوئے ہو، اور اسے بالکل ہی بھلا چکا ہو، تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے کسی اہمیت کا قائل نہیں ہے، یا اصلاً اس پر ایمان نہیں رکھتا، اور اگر وہ کبھی کبھار نماز پڑھ لیتا ہے تو لوگوں کی زبان یا اسی طرح کی باتوں سے ڈر کر پڑھتا ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں "ساھون" سے مراد کیا ہے؛ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس کے علاوہ دوسری تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ اس سے مراد وقت فضیلت سے تاخیر کرنا ہے۔

یا اس سے مراد ان منافقین کی طرف اشارہ کرنا ہے جو نہ نماز کے ثواب کا اعتقاد رکھتے ہیں، اور نہ ہی اس کے ترک کے عذاب کا۔

یا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگ نماز میں ریا کاری کرتے ہیں۔ (جب کہ یہ معنی بعد والی آیت میں آرہا ہے)۔

البتہ ان معانی کے درمیان جمع بھی ممکن ہے اگرچہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

بہر حال جب نماز کو بھول جانے والے ویل اور ہلاکت کے مستحق ہیں، تو پھر ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو کلی طور پر نماز کو چھوڑے ہوئے ہیں اور تارک الصلوٰۃ ہیں۔

چوتھے مرحلہ میں ان کے ایک اور بدترین عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ ایسے لوگ ہیں جو ہمیشہ ریاکاری کرتے ہیں" (الذین ھم یراءون)۔

اور آخری مرحلہ میں مزید فرماتا ہے: "وہ دوسروں کو ضروریاتِ زندگی سے منع کرتے ہیں" (و یمنعون الماعون)۔

مسلّمہ طور پر اس تظاہر اور ریاکاری کے سرچشمے روزِ قیامت پر ایمان کا نہ ہونا، اور خدائی جزاؤں کی طرف توجہ نہ کرنا ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان خدائی جزاؤں کو تو چھوڑ دے، اور مخلوق کو خوش کرنے کی طرف توجہ رکھے۔

"ماعون" "معن" (بروزن شأن) کے مادہ سے، کم اور تھوڑی سی چیز کے معنی میں ہے۔ اور بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں اس سے مراد جزئی اور معمولی قسم کی چیزیں ہیں۔ جو لوگ خصوصاً ہمسائے ایک دوسرے سے عاریتاً لے لیتے ہیں، مثلاً کچھ نمک، پانی، آگ (ماچس) برتن وغیرہ۔

واضح رہے کہ جو شخص اس قسم کی چیزیں بھی دوسروں کو نہیں دیتا، وہ انتہائی پست اور بے ایمان آدمی ہوتا ہے۔ ایسے افراد اس قدر بخیل ہوتے ہیں کہ اس قسم کی معمولی چیزوں کے دینے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ یہی معمولی معمولی چیزیں بعض اوقات بڑی بڑی احتیاجات کو پورا کرتی ہیں اور ان کے روک لینے سے لوگوں کی زندگی میں بڑی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔

ایک گروہ نے یہ بھی کہا ہے کہ "ماعون" سے مراد زکوٰۃ ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ اصل مال سے عام طور پر بہت ہی کم ہوتی ہے۔ کبھی سو میں سے دس، کبھی سو میں سے پانچ اور کبھی سو میں سے اڑھائی۔

یقیناً "زکوٰۃ کا نہ دینا" بھی بدترین کاموں میں سے ایک ہے، کیونکہ زکوٰۃ معاشرے کی بہت سی اقتصادی مشکلات کو حل کرتی ہے۔

ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے ماعون کی تفسیر میں فرمایا:

"ھو القرض یقرضہ، والمتاع یعیرہ، والمعروف یصنعہ"

"ماعون وہ قرض ہے جو انسان دوسرے کو دیتا ہے۔ اور وہ وسائل زندگی ہیں جو وہ اُدھار کے طور پر دوسروں کو دیتا ہے۔ اور وہ امدادیں اور کارہائے خیر ہیں جنہیں انسان انجام دیتا ہے"[1]

ایک اور روایت میں انہیں حضرت سے یہی معنی نقل ہوا ہے، اور اس کے ذیل میں آیا ہے کہ راوی نے کہا: ہمارے ہمسائے ایسے ہیں کہ جب ہم کچھ وسائل زندگی ان کو دیتے ہیں تو وہ انہیں توڑ دیتے ہیں اور خراب کر دیتے ہیں، تو کیا انہیں نہ دینا بھی گناہ ہے؟

---

[1] "کافی" مطابق نقل نورالثقلین جلد ۵ ص ۶۷۹

تو آپ نے فرمایا اس صورت میں کوئی مانع نہیں ہے۔[1]

"ماعون" کے معنی کے بارے میں دوسرے احتمالات بھی دیے گئے ہیں، یہاں تک کہ تفسیر قرطبی میں بارہ سے زیادہ قول اس سلسلے میں نقل ہوئے ہیں جن میں سے بہت سوں کو ایک دوسرے میں ملایا جا سکتا ہے، البتہ زیادہ اہم وہی ہیں جو ہم نے اوپر نقل کیے ہیں۔

ان دونوں کاموں کو ایک دوسرے کے بعد ذکر کرنا (ریاکاری و منع ماعون) گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو بات خدا کے لیے ہے اُسے وہ مخلوق کی نیت سے بجالاتے ہیں، اور جو مخلوق کے لیے ہے وہ ان کے لیے نہیں کرتے اور اس طرح سے وہ کوئی بھی حق اس کے حق دار تک نہیں پہنچاتے۔

ہم اس گفتگو کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا:

"من منع الماعون جارہ منعہ اللہ خیرہ یوم القیامۃ، ووکلہ الیٰ نفسہ، ومن وکلہ الیٰ نفسہ فما اسوء حالہ؟!:

"جو شخص ضروری اور معمولی چیزوں کو اپنے ہمسایہ سے روکتا ہے، خدا اُسے قیامت کے دن اپنی خیر سے روک دے گا، اور جسے خدا اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دے اس کا بہت ہی بُرا حال ہوگا۔[2]

چند نکات

۱۔ سُورۂ ماعون کے مباحث کی جمع بندی

اِس مختصر سے سُورہ میں صفاتِ رذیلہ کا ایک ایسا مجموعہ آیا ہے کہ وہ جس شخص میں بھی ہو اس کی بے ایمانی، پستی اور حقارت کی ایک نشانی ہے۔ اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان سب کو تکذیبِ دین یعنی جزا، یا روزِ جزا کی فرع قرار دیا ہے۔

یتیموں کو حقیر جاننا، بھوکوں کو کھانا نہ کھلانا، نماز سے غفلت برتنا، ریاکاری کرنا اور لوگوں سے موافقت نہ کرنا یہاں تک کہ زندگی کے معمولی وسائل دینے میں۔ یہ ہے ان (صفاتِ رذیلہ) کا مجموعہ۔

اور اس طرح سے ان بخیل، خود خواہ اور ریاکار افراد کو ظاہر کرتا ہے، جن کا نہ تو "مخلوقِ خدا" ہی کے ساتھ کوئی تعلق ہے اور نہ ہی "خالق" کے ساتھ کوئی رابطہ۔ ایسے افراد جن کے وجود میں نورِ ایمان اور احساسِ مسئولیت نہیں ہوتا، نہ تو وہ خدائی اجر و ثواب میں غور و فکر کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

---

[1] "کافی" مطابق نقل، نورالثقلین جلد ۵ ص ۶۷۹

[2] "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۶۷۹ حدیث ۲۰

۲۔ تظاہر و ریا ایک بہت بڑی اجتماعی مُصیبت ہے

ہر عمل کی قدر و قیمت اس کے سبب کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسلام کی نگاہ میں ہر عمل کی بُنیاد اس کی "نیت" پر ہوتی ہے، وہ بھی "خالص نیت"

اسلام ہر چیز سے پہلے نیت کے بارے میں تحقیق کرتا ہے، لہٰذا ایک مشہور حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"انما الاعمال بالنیات ولکل امرء مانوی"

"ہر عمل نیت کے ساتھ وابستہ ہے اور ہر شخص کا عمل میں حصّہ، اس کی اس نیت کے مطابق ہوگا، جو وہ عمل میں رکھتا تھا"

اور اسی حدیث کے ذیل میں آیا ہے:

"جو شخص خدا کے لیے جہاد کرے اس کا اَجر خدائے بزرگ و برتر پر ہے۔ اور جو شخص مالِ دنیا کے لیے جنگ کرے، یہاں تک کہ ایک عقال (وہ چھوٹی سی رسّی جس سے اُونٹ کے پاؤں کو باندھتے ہیں) لینے کے لیے کرے اس کا حصّہ بس وہی ہے"[1]

یہ سب اس بنا پر ہے کہ "نیت" سے ہی عمل وجود میں آتا ہے۔ وہ شخص جو خدا کے لیے کوئی کام انجام دیتا ہے، تو وہ اس کی بنیاد کو محکم کرتا ہے، اور اس کی تمام کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائیں۔ لیکن جو شخص تظاہر اور ریاکاری کے لیے کسی عمل کو انجام دیتا ہے وہ صرف اس کے ظاہر اور زرق و برق پر نظر رکھتا ہے، اور وہ اس کی گہرائی و بنیاد اور حاجت مندوں کے استفادے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

وہ معاشرہ جو ریاکاری کا عادی ہو جاتا ہے وہ نہ صرف خُدا، اخلاقِ حسنہ اور ملکاتِ فاضلہ سے دُور کر دیا جاتا ہے، بلکہ اس کے تمام اجتماعی پروگرام مفہوم و مطلب سے خالی ہو جاتے ہیں، اور وہ مُٹھی بھر بے معنی ظواہر کا خلاصہ رہ جاتے ہیں، اور ایسے انسان اور اس قسم کے معاشرے کی سرنوشت کتنی دردناک ہے؟!

"ریا" کی مذمّت میں بہت زیادہ روایات آئی ہیں، یہاں تک کہ اس کو شرک کی ایک نوع کہا گیا ہے، اور ہم یہاں تین ہلا دینے والی روایات پر قناعت کرتے ہیں۔

۱۔ ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"سیأتی علی الناس زمان تخبث فیہ سرائرھم، وتحسن فیہ علانیتھم، طمعاً فی الدنیا لا یریدون بہ ما عند ربھم، یکون دینھم ریاء لا یخالطھم خوف، یعمھم اللہ بعقاب فیدعونہ دعاء الغریق فلا یستجیب لھم"

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد اول ص ۳۵ (ابواب مقدمۃ العبادات باب ۵ حدیث ۱۰)۔

"لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب ان کے باطن قبیح، گندے اور آلودہ ہو جائیں گے، اور ان کے ظاہر زیبا اور خوبصورت ہوں گے۔ دُنیا میں طمع کی خاطر وہ اس سے اپنے پروردگار کی جزاؤں کے طلب گار نہیں ہوں گے۔ ان کا دین ریا ہو جائے گا، خوفِ خدا ان کے دل میں باقی نہ رہے گا، خدا ان سب کو ایک سخت عذاب میں گرفتار کرے گا، اور وہ جتنا بھی ایک ڈوبنے والے کی طرح خدا کو پکاریں گے، ہرگز ان کی دُعا قبول نہ ہوگی۔"[1]

۲۔ ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے اپنے ایک صحابی "زرارہ" سے فرمایا:

"من عمل للناس كان ثوابه على الناس يا زراره! كل رياء شرك!"

"جو شخص لوگوں کے لیے عمل کرے گا اس کا اجر و ثواب لوگوں پر ہی ہوگا اے زرارہ! ہر ریا شرک ہے۔"[2]

۳۔ ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"ان المرائي يدعى يوم القيامة باربعة اسماء:

يا كافر! يا فاجر! يا غادر! يا خاسر! حبط عملك، و بطل اجرك فلا خلاص لك اليوم، فالتمس اجرك ممن كنت تعمل له!"

"ریاکار شخص کو قیامت کے دن چار ناموں سے پکارا جائے گا:

اے کافر! اے فاجر! اے حیلہ گر! اے خاسر و زیاں کار! تیرا عمل نابود ہو گیا ہے، تیرا اجر و ثواب باطل ہو چکا ہے۔ آج تیرے لیے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے لہٰذا تو اپنا اجر و ثواب اس سے طلب کر جس کے لیے تو عمل کرتا تھا۔"[3]

خداوندا! خلوصِ نیت سخت مشکل کام ہے، تو خود اس راہ میں ہماری مدد فرما۔

پروردگارا! ہمیں ایسا ایمان مرحمت فرما کہ ہم تیرے ثواب و عقاب کے علاوہ اور کچھ نہ سوچیں، اور مخلوق کی رضا و خوشنودی اور غصہ و غضب تیری راہ میں ہمارے لیے یکساں ہو۔

بارالٰہا! اس راہ میں جو خطا اور غلطی اب تک ہم نے کی ہے وہ ہمیں بخش دے۔

آمین یا ربّ العالمین

اختتام سورۂ ماعون

---

[1] "اصول کافی" جلد ۲ باب الریاء حدیث ۱۴

[2] "وسائل الشیعہ" جلد اوّل ص ۴۹ (حدیث ۱۱ کے ذیل میں)۔

[3] "وسائل الشیعہ" جلد اوّل ص ۵۱ (حدیث ۱۶ کے ذیل میں)۔

سُورَہ اَلْکَوثَر

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا۔

❖ اس میں ۳ آیات ہیں۔

سُورۂ کوثر کے مطالب اور اس کی فضیلت

مشہور یہ ہے کہ یہ سُورہ "مکّہ" میں نازل ہوا ہے۔ لیکن بعض نے اس کے مدنی ہونے کا احتمال بھی دیا ہے۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ سُورہ دو بار نازل ہوا۔ ایک دفعہ مکّہ میں اور دوسری دفعہ مدینہ میں، لیکن جو روایات اس کے شانِ نزول میں وارد ہوئی ہیں وہ اس کے مکّی ہونے کے مشہور قول کی تائید کرتی ہیں۔

اِس سُورہ کے شانِ نزول میں آیا ہے کہ: "عاص بن وائل" نے جو مُشرکین کے سرداروں میں سے تھا، پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسجد الحرام سے نکلتے وقت ملاقات کی اور کچھ دیر تک آپ سے باتیں کرتا رہا۔ قریش کے سرداروں کا ایک گروہ مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے دُور سے اس منظر کا مشاہدہ کیا۔ جس وقت "عاص بن وائل" مسجد میں داخل ہوا تو انہوں نے اس سے کہا کہ تو کس سے باتیں کر رہا تھا؟ اس نے کہا: اس "اَبتر" شخص سے۔

اس نے اس تعبیر کا اس لیے انتخاب کیا کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند "عبداللہ" دُنیا سے رُخصت ہو چکے تھے اور عرب ایسے آدمی کو جس کے کوئی بیٹا نہ ہو "ابتر" کہا کرتے تھے یعنی (بلاعقب۔ مقطوع النسل) لہٰذا قریش نے پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند کی وفات کے بعد اس لقب کو آنحضرتؐ کے لیے انتخاب کر رکھا تھا، جس پر یہ سُورت نازل ہوئی، اور پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت سی نعمتوں اور کوثر کی بشارت دی اور ان کے دشمنوں کو اَبتر کہا۔[1]

اِس کی وضاحت اِس طرح ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بانوئے اسلام جناب خدیجہؑ سے دو پسر تھے، ایک قاسم اور دوسرے طاہر جنہیں عبداللہ بھی کہتے تھے۔ دونوں ہی مکّہ میں دُنیا سے چل بسے اور پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کوئی بیٹا نہ رہا۔ اس بات نے قریش کے بدخواہوں کی زبان کھول دی، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "ابتر" کہنے لگے۔[2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۴۹۔

[2] اگلے صفحہ پر

وہ اپنی روایت کے مطابق بیٹے کو حد سے زیادہ اہمیت دیتے تھے، اسے باپ کے پروگراموں کو جاری رکھنے والا شمار کرتے تھے اس سانحے کے باعث ان کا خیال یہ تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے آپ کے پروگرام معطل ہو کر رہ جائیں گے چنانچہ وہ اس بات پر بہت خوش تھے۔

قرآن مجید نازل ہوا اور اس سورہ میں اعجاز آمیز طریقے سے انہیں جواب دیا اور یہ خبر دی کہ آنحضرتؐ کے دشمن ہی ابتر رہیں گے اور اسلام و قرآن کا پروگرام کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ اس سورہ میں جو بشارت دی گئی ہے وہ ایک طرف تو دشمنانِ اسلام کی امیدوں پر ایک ضرب تھی اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تسلّی خاطر تھی جن کا قلبِ پاک اور نازک دل اس قبیح لقب اور دشمنوں کی سازش کو سُن کر غمگین اور مکدر ہوا تھا۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من قرأها سقاه الله من انهار الجنة، واعطى من الاجر بعدد كل قربان قربه العباد في يوم عيد ويقربون من اهل الكتاب والمشركين"

"جو شخص اس کی تلاوت کرے خدا اُسے جنّت کی نہروں سے سیراب کرے گا اور ہر قربانی کی تعداد میں جو خدا کے بندے عید (قربان) کے دن کرتے ہیں، اور اسی طرح سے وہ قربانیاں جو اہلِ کتاب اور مشرکین دیتے ہیں ان سب کی تعداد کے برابر اس کو اجر دے گا۔"[1]

اس سورہ کا نام (کوثر) اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] (گزشتہ صفحہ کا حاشیہ) پیغمبر اکرمؐ کے اور بیٹا جس کا نام "ابراہیم" تھا "ماریہ قبطیہ" سے مدینہ میں ہجرت کے آٹھویں سال پیدا ہوا، لیکن اتفاقاً وہ بھی دو سال کا ہونے سے پہلے وفات پا گیا۔ ان کی وفات نے پیغمبر اکرمؐ کے دل کو بہت آزردہ کیا تھا۔

(حاشیہ صفحہ ۳۱۰)

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ۵۴۸۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ ۝
۲۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ ۝
۳۔ اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ ہم نے تجھے کوثر (بہت زیادہ خیر و برکت) عطا کی۔
۲۔ اَب جب کہ یہ بات ہے تو اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھ اور قربانی دے۔
۳۔ یقیناً تیرا دشمن ہی اَبتر (اور بلا عقب و مقطوع النسل) ہے۔

تفسیر

ہم نے تجھے فراواں خیر و برکت دی

اس تمام سورے میں روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے (جیسا کہ سورۂ والضحیٰ اور سورہ اَلم نشرح میں ہے) اور تینوں سوروں کے اہم اہداف و مقاصد میں سے ایک آنحضرتؐ کے دل کو دردناک انبوہ حوادث میں تسلی دینا اور دشمنوں کے بار بار لگائے ہوئے زبان کے زخموں کے مقابلہ میں تشفی بخشنا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "ہم نے تجھے کوثر عطا کیا" (انا اعطیناک الکوثر)۔

"کوثر" وصف ہے جو "کثرت" سے لیا گیا ہے، اور فراواں خیر و برکت کے معنی میں ہے۔ اور "سخی" افراد کو بھی "کوثر" کہا جاتا ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں کوثر سے کیا مُراد ہے ؟ ایک روایت میں آیا ہے کہ جس وقت یہ سُورہ نازل ہوا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے ، اور اس سُورہ کی تلاوت فرمائی۔ اصحاب نے عرض کیا یہ کیا چیز ہے جو خدا نے آپ کو عطا فرمائی ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ یہ جنّت میں ایک نہر ہے ، جو دُودھ سے زیادہ سفید اور قدح (بلور) سے زیادہ صاف ہے، اس کے اطراف میں دُر و یاقوت کے قبے ہیں۔[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السّلام سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

" کوثر جنّت میں ایک نہر ہے جو خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو ان کے فرزند (عبداللہ جو آپ کی زندگی میں فوت ہوگئے تھے) کے بدلے میں عطا کی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد وہی "حوضِ کوثر" ہے جو پیغمبر سے تعلق رکھتا ہے ، اور جس سے مومنین جنّت میں داخل ہونے کے وقت سیراب ہوں گے ۔

بعض نے اس کی نبوّت سے تفسیر کی ہے، بعض دوسروں نے قرآن سے ، بعض نے اصحاب و انصار کی کثرت سے اور بعض نے کثرتِ اولاد اور ذُرّیت سے ، جو سب آپ کی دُختر نیک اختر فاطمہ زہرہ علیہا السّلام سے وجود میں آئی اور اس قدر بڑھ گئی ہے کہ حساب و شمار سے باہر ہوگئی ہے اور دامنِ قیامت تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود کی یادگار ہے۔ بعض نے اس کی " شفاعت " سے بھی تفسیر کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السّلام سے ایک حدیث بھی نقل کی ہے۔[2]

یہاں تک کہ فخر رازی نے " کوثر " کی تفسیر میں " پندرہ قول " نقل کیے ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر اس وسیع معنی کے واضح مصادیق کا بیان ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے " کوثر " " خیر کثیر اور فراواں نعمت " کے معنی میں ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت ہی زیادہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ اور جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک اس کے مصادیق میں سے ایک واضح مصداق ہے۔ اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مصداق ہیں، جنہیں آیت کی مصداقی تفسیر کے عنوان سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال تمام میدانوں میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر تمام نعمتیں — یہاں تک کہ دُشمنوں کے ساتھ جنگوں میں آپ کی کامیابیوں میں ، یہاں تک کہ آپ کی اُمّت کے علماء ، جو ہر عصر اور ہر زمانہ میں قرآن و اسلام کی مشعلِ فروزاں کی پاسداری کرتے ہیں، اور اُسے دنیا کے ہر گوشہ میں لے جاتے ہیں۔ سب اس خیرِ کثیر میں شامل ہیں۔

اس بات کو نہیں بھُولنا چاہیئے کہ خدا اپنے پیغمبرؐ سے یہ بات اس وقت کہہ رہا ہے کہ ابھی تک اس خیرِ کثیر کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ یہ ایک ایسی خبر اور پیش گوئی تھی جو مُستقبل قریب اور مستقبل بعید کے لیے کی جا رہی تھی۔ یہ ایک اعجاز آمیز اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی حقانیت کو بیان کرنے والی خبر ہے ۔

اس عظیم نعمت اور خیرِ فراواں کے لیے بہت ہی زیادہ شکر ادا کرنے کی ضرورت ہے ، اگرچہ مخلوق کا شکر ادا کرنا خالق کی نعمت

---

[1] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۴۹

[2] " وہی مدرک "

کے حق کو ہرگز ادا نہیں کرتا، بلکہ شکرگزاری کی توفیق اس کی طرف سے خود ایک اور نعمت ہے، لہٰذا فرماتا ہے: "اب جب کہ ایسا ہے تو صرف اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھ اور قربانی دے" (فصل لربك وانحر)۔

ہاں! نعمت کا بخشنے والا وہی ہے۔ اسی بنا پر نماز، عبادت اور قربانی جو ایک قسم کی عبادت ہے، اس کے علاوہ کسی اور کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ خصوصاً "رب" کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو نعمتوں کے دوام اور پروردگار کی تدبیر و ربوبیت کو بیان کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ "عبادت" خواہ نماز کی صورت میں ہو، یا قربانی کرنے کی صورت میں، وہ رب اور ولی نعمت کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ اور وہ خدا کی ذاتِ پاک سے وابستہ ہے۔

یہ بات مشرکین کے اعمال کے مقابلہ میں ہے جو اپنی نعمتوں کو تو خدا ہی کی طرف سے سمجھتے تھے، لیکن سجدہ اور قربانی بتوں کے لیے کرتے تھے۔ بہرحال 'لربك' کی تعبیر عبادات میں قصدِ قربت کے لازم ہونے کے مسئلہ پر ایک واضح دلیل ہے۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ نماز سے مراد عید قربان کے دن کی نماز ہے۔ اور قربانی کرنا بھی اُسی دن ہے۔ لیکن ظاہراً آیت کا مفہوم عام اور وسیع ہے۔ اگرچہ عید کے دن کی نماز اور قربانی بھی اس کا ایک واضح مصداق ہے۔

"وانحر" "نحر" کے مادہ سے، اُونٹ کو حلال کرنے کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ بات شاید اس بنا پر ہے کہ قربانیوں میں سے اُونٹ کی قربانی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی اور پہلے پہل مسلمان اس سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے اور اُونٹ کی قربانی دینا ایثار و قربانی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

اُوپر والی آیت کے لیے یہاں دو اور تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ "وانحر" کے جملہ سے مُراد نماز کے وقت رُو بقبلہ کھڑا ہونا ہے، چونکہ "نحر" کا مادہ گلے والی جگہ کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد عربوں نے اسے ہر چیز کے آمنے سامنے ہونے کے معنی میں استعمال کیا ہے، لہٰذا وہ کہتے ہیں:

"منازلنا تتناحر" یعنی ہمارے گھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں۔

۲۔ اس سے مراد تکبیر کے وقت ہاتھوں کو بلند کرنا اور گلے اور چہرے کے سامنے لانا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے:

"جس وقت یہ سورہ نازل ہوا، تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل سے سوال کیا: یہ "نُحَیرہ"[1] جس کے لیے میرے پروردگار نے مجھے مامور کیا ہے، کیا ہے؟

"جبرئیل" نے عرض کیا:

"یہ نحیرہ نہیں ہے، بلکہ خدا نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ جس وقت نماز میں داخل ہوں تو تکبیر کہتے وقت اپنے ہاتھوں کو بلند کریں، اور اسی طرح جب رکوع کریں، یا رکوع سے سر اُٹھائیں، یا سجدہ کریں، اس وقت بھی، کیونکہ ہماری اور سات آسمانوں کے

---

[1] "نُحَیرہ" مہینہ کے آخری دن کے معنی میں ہے، چونکہ اس دن انسان نئے چاند کے استقبال کے لیے جاتا ہے اور بعض نے اسے مہینہ کے آخری شب و روز کے معنی میں لیا ہے، تو اس بنا پر روایت کا معنی اس طرح ہوگا، یہ اگلے مہینہ کا استقبال جس کا خدا نے مجھے حکم دیا ہے کیا ہے؟ لہٰذا جبرئیل نے کہا یہ "نحیرہ" نہیں ہے۔

فرشتوں کی نماز اسی طرح کی ہے۔ اور ہر چیز کی ایک زینت ہوتی ہے، اور نماز کی زینت ہر تکبیر کے وقت ہاتھوں کو بلند کرنا ہے۔[1]

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں اپنے دستِ مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اس سے مراد یہ ہے کہ نماز کے آغاز میں ہاتھوں کو اس طرح بلند کرو کہ ان کی ہتھیلیاں رُو بقبلہ ہوں۔"

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے، کیونکہ اس سے مراد بُت پرستوں کے اعمال کی نفی ہے جو غیر خدا کے لیے عبادت و قربانی کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان تمام روایات اور مطالب کے درمیان جمع کرنا، جو اس سلسلہ میں ہم تک پہنچی ہیں کوئی مانع نہیں ہے۔ خاص طور سے تکبیرات کے وقت ہاتھ بلند کرنے کے سلسلہ میں تو شیعہ اور اہلِ سنت کی کتابوں میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں۔ اس طرح سے یہ آیت ایک جامع مفہوم رکھتی ہے جو ان کو بھی شامل ہے۔

اور اس سورہ کی آخری آیت میں، اس نسبت کی طرف توجہ دیتے ہوئے، جو شرک کے سرغنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دیتے تھے، فرماتا ہے: "تو ابتر اور بلا عقب و مقطوع النسل نہیں ہے۔ بلکہ تیرا دشمن ابتر، بلاعقب اور مقطوع النسل رہے گا": (ان شانئک ھوالابتر)۔

"شانئ" "مشنآن" (بروزن ضربان) کے مادّہ سے عداوت و دُشمنی، کینہ ورزی اور بدخلقی کرنے کے معنی میں ہے اور "شانی" اس شخص کو کہتے ہیں جو اس صفت کا حامل ہو۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "ابتر" اصل میں "دُم کٹے جانور" کے معنی میں ہے، اور دُشمنانِ اسلام کی طرف سے اس تعبیر کا انتخاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتک حرمت اور توہین کرنے کے لیے تھا۔ اور "شانی" کی تعبیر اسی واقعیت کو بیان کرتی ہے کہ وہ اپنی دشمنی میں کم سے کم آداب کی رعایت تک بھی نہیں کرتے تھے۔ یعنی ان کی عداوت و دُشمنی قساوت و رذالت سے آمیختہ تھی۔ حقیقت میں قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ لقب خود تمہارا ہے نہ کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا۔

دوسری طرف — جیسا کہ سورہ کی شانِ نزول میں بیان کیا گیا ہے — قریش پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اور اسلام کی بساط کے اُلٹ جانے کے انتظار میں تھے، کیونکہ وہ یہ کہتے تھے کہ آپ کے پیچھے کوئی اولاد نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تو بلاعقب اور بے اولاد نہیں ہے بلکہ تیرے دشمن ہی بلا عقب اور بے اولاد ہیں۔

چند نکات

۱۔ حضرت فاطمہ(ع) اور "کوثر"

ہم بیان کر چکے ہیں کہ "کوثر" ایک عظیم جامع اور وسیع معنی رکھتا ہے۔ اور وہ "خیر کثیر و فراواں ہے" اور اس کے

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۰

بہت زیادہ مصادیق ہیں۔ لیکن بہت سے بزرگ شیعہ علماء نے اس کے واضح ترین مصادیق میں سے ایک مصداق "فاطمہ زہراؑ" (سلام اللہ علیہا) کے وجود مبارک کو سمجھا ہے۔ چونکہ آیت کی شانِ نزول سے ظاہر ہے کہ دشمن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابتر اور بلاعقب ہونے سے متہم کرتے تھے۔ قرآن ان کی بات کی نفی کے ضمن میں کہتا ہے: "ہم نے تجھے کوثر عطا کیا ہے" اس تعبیر کا مطلب یہی بنتا ہے کہ یہ "خیر کثیر" فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہی ہیں کیونکہ پیغمبرؐ کی نسل اور ذریت اسی دُختر گرامی کے ذریعے سارے عالم میں منتشر ہوئی، جو نہ صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جسمانی اولاد تھی بلکہ انہوں نے آپ کے دین اور اسلام کی تمام اقدار کی حفاظت کی اور اُسے آنے والوں تک پہنچایا۔ نہ صرف اہل بیتؑ کے آئمہ معصومینؑ، جن کی اپنی ایک مخصوص حیثیت تھی، بلکہ ہزارہا فرزندانِ فاطمہ عالم میں پھیل گئے، جن میں بڑے بڑے بزرگ علماء، مؤلفین، فقہا، محدثین، مفسرین والا مقام، اور عظیم حکمران ہوگزرے ہیں جنہوں نے ایثار و قربانی اور فداکاری کے ساتھ دینِ اسلام کی حفاظت کی کوشش کی۔

یہاں پر "فخر رازی" کی ایک عمدہ بحث ہمارے سامنے آئی ہے جو اُس نے کوثر کی مختلف تفسیروں کے ضمن میں بیان کی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ سورہ ان لوگوں کے ردّ کے عنوان سے نازل ہوا ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کے نہ ہونے پر طعن و طنز، اور تنقید و اعتراض کرتے تھے۔ اس بناء پر سُورہ کا معنی یہ ہوگا کہ خدا آپ کو ایسی نسل دے گا جو زمانہ دراز تک باقی رہے گی۔ غور تو کرو کہ لوگوں نے اہل بیتؑ کے کتنے افراد کو شہید کیا۔ لیکن اس کے باوجود دُنیا اُن سے بھری پڑی ہے۔ جب کہ بنی اُمیہ میں سے (جو اسلام کے دشمن تھے) کوئی قابلِ ذکر شخص دنیا میں باقی نہیں رہا۔ پھر آنکھ کھول کر دیکھ اور غور کر کہ فاطمہؑ کی اولاد کے درمیان باقرؑ و صادقؑ و رضاؑ و نفس ذکیہ[1] جیسے کتنے عظیم اور بزرگ علماء ہوئے ہیں۔

۲۔ اس سُورہ کا اعجاز

درحقیقت اس سُورہ میں تین پیشین گوئیاں بیان کی گئی ہیں۔ ایک طرف تو پیغمبرؐ کو خیر کثیر عطا کرنے کی خوش خبری دیتی ہے۔ (اگرچہ "اعطینا" فعل ماضی کی صُورت میں ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ مضارع مسلّم کی قسم سے ہو، جو ماضی کی صُورت میں بیان ہوا ہے)۔ اور یہ خیر کثیر ان تمام فتوحات، کامیابیوں اور توفیقات کو شامل ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعد میں نصیب ہوئی ہیں۔ اگرچہ وہ مکہ میں اس سُورہ کے نزول کے وقت پیش بینی کے قابل نہیں تھیں۔

دوسری طرف یہ سُورۃ اِس بات کی خبر دے رہا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے اولاد، بلاعقب اور مقطوع النسل نہیں ہوں گے۔ بلکہ آپ کی نسل اور اولاد بڑی کثرت سے عالم میں موجود رہے گی۔

تیسری جانب یہ سورہ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ آپ کے دشمن اُبتر، بلاعقب اور مقطوع النسل ہو جائیں گے۔ یہ پیشگوئی بھی پوری ہوگئی ہے اور آپ کے دشمن اس طرح تتر بتر اور تباہ و برباد ہوئے کہ آج ان کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ حالانکہ "بنی اُمیہ" اور "بنی عباس" جیسے قبائل جو پیغمبرؐ اور ان کی اولاد کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے ایک وقت اتنی جمعیت اور کثرت

---

[1] "نفس زکیہ" "امام حسن مجتبیٰؑ" کے فرزند "محمد بن عبداللہ" کا لقب ہے، جو منصور دوانقی کے ہاتھوں ۱۴۵ ہجری میں شہید ہوئے۔

[2] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۱۲۴

رکھتے تھے کہ ان کی اولاد شمار میں نہ آتی تھی ۔ لیکن آج اگر اُن میں سے کوئی باقی رہ بھی گیا ہو تو وہ بالکل پہچانا نہیں جاتا ۔

۳۔ خُدا کے لیے جمع کی ضمیر کس لیے ہے ؟

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں بھی اور قرآن مجید کی اور بہت سی دُوسری آیات میں بھی صیغہ " متکلم مع الغیر" (جمع متکلم) کے ساتھ اپنا ذکر کرتا ہے ۔ فرماتا ہے : " ہم نے تجھے کوثر عطا کیا ۔

یہ تعبیر اور اس قسم کی تعبیریں عظمت و قدرت کو بیان کرنے کے لیے ہوتی ہیں کیونکہ بزرگ اور بڑی ہستیاں جب اپنے بارے میں بات کرتی ہیں ، تو وہ صرف اپنے بارے میں ہی نہیں ، بلکہ اپنے ماموریں کارندوں کے بارے میں بھی خبر دیتی ہیں ، اور یہ قدرت و عظمت اور ان کے اوامر کے مقابلہ میں فرمانبرداری کرنے والوں سے کنایہ ہے ۔

زیر بحث آیت میں لفظ " ان " بھی اس معنی پر ایک دوسری تاکید ہے ۔ اور " اٰتینٰاک " کے بجائے " اعطیناک " کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ خدا نے پیغمبرؐ کو کوثر بخش دیا ہے اور عطا کر دیا ہے ۔ اور یہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک بہت بڑی بشارت ہے تاکہ دشمنوں کی بیہودہ باتوں سے آپ کا قلب مبارک آزردہ نہ ہو ۔ اور آپ کے آہنی عزم میں سستی اور کمزوری پیدا نہ ہونے پائے ۔ اور دُشمن یہ جان لیں کہ آپ کی تکیہ گاہ وہ خدا ہے ، جو تمام خیرات کا منبع ہے اور اس نے خیرِ کثیر آپ کو بخش دی ہے ۔

خداوندا ! ہمیں اس خیرِ کثیر کی برکات سے جو تُو نے اپنے پیغمبرؐ کو مرحمت فرمائی ہے ، بے نصیب نہ کرنا ۔

پروردگارا ! تُو جانتا ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی ذُرّیتِ طاہرہ کو خلوص دل کے ساتھ دوست رکھتے ہیں ، لہٰذا ہمیں انہیں کے ساتھ محشور کرنا ۔

بارِ الٰہا ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے دین و آئین کی بہت بڑی عظمت ہے ، اس عظمت و عزت و شوکت میں روز بروز اضافہ فرما ۔

* * *

آمین یا ربّ العالمین

اختتام سُورۂ کوثر

سُورَۃُ الکٰفِرُون

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا

❖ اِس میں ۶ آیات ہیں۔

سُورۂ "کافرون" کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا۔ اس کا لب ولہجہ اور اس کے مطالب اس بات کے واضح گواہ ہیں۔ اسی طرح وُہ شانِ نزول جس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا، اس مدعا پر دُوسری دلیل ہے ـــ یہ جو بعض نے اس کے مدنی ہونے کا احتمال دیا ہے بہت بعید نظر آتا ہے۔

سُورہ کا لب ولہجہ بتاتا ہے کہ یہ سُورہ ایسے زمانہ میں نازل ہوا جب مسلمان اقلیت میں تھے اور کفّار اکثریت میں۔ پیغمبرؐ پر ان کی طرف سے سخت دباؤ تھا اور انہیں اصرار تھا کہ کسی طرح سازش کرکے آپ کو شرک کی طرف کھینچ لیں۔ پیغمبرؐ نے ان کی اس پیش کش کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور انہیں کُلّی طور پر مایوس کر دیا اور ان کے ساتھ اُلجھے بھی نہیں۔

یہ بات تمام مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ ہے کہ وہ اِسلام اور دین کی اساس کے بارے میں دشمن کے ساتھ کسی حالت میں بھی مصالحت نہ کریں اور جب بھی ان کی طرف سے اس قسم کی خواہش کی جائے تو انہیں کامل طور سے مایوس کر دیں۔ اس سُورہ میں اس معنی پر خصوصیت کے ساتھ دو مرتبہ تاکید ہوئی ہے کہ "میں تمہارے معبُودوں کی پرستش نہیں کروں گا" اور یہ تاکید انہیں مایوس کرنے کے لیے ہے۔ اسی طرح اس بات کی بھی دوبار تاکید ہوئی ہے کہ "تم بھی ہرگز میرے معبُود، خدائے یگانہ کی عبادت نہیں کرو گے"۔ یہ ان کی ہٹ دھرمی کی ایک دلیل ہے اور اس کا انجام یہ ہے کہ "میں ہوں اور میرا دین توحید، اور تم ہو اور تمہارا شرک آلود دین"۔

اس سُورہ کی فضیلت کے بارے میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں جو اس کے مطالب کی حد سے زیادہ اہمیّت کی ترجمان ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

"من قرأ قل یاایھا الکافرون فکانما قرأ ربع القرآن وتباعدت عنه مردة الشیاطین، وبرأ من الشرك، ویعافی من الفزع الاکبر"

"جو شخص سورہ "قل یا ایھا الکافرون" کو پڑھے گا تو ایسا ہے جیسے اس نے چوتھائی قرآن پڑھا ہو، سرکش شیاطین اس سے دور رہیں گے، وہ شرک سے پاک ہو جائے گا اور "روزِ قیامت" کی گھبراہٹ سے امان میں ہوگا۔[1]

"ربع القرآن" (چوتھائی قرآن) کی تعبیر شاید اس بنا پر ہے کہ قرآن کا تقریباً چوتھا حصہ شرک و بت پرستی سے مبارزہ میں ہے اور اس کا نچوڑ اور خلاصہ اس سورہ میں آیا ہے۔ اور سرکش شیاطین کا دور ہونا اس بنا پر ہے کہ اس سورہ میں مشرکین کی پیش کش کو ٹھکرا دیا گیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ شرک شیطان کا اہم ترین آلہ ہے۔

قیامت میں نجات بھی پہلے درجہ میں توحید اور نفیِ شرک کی مرہونِ منت ہے، وہی مطلب جس کے محور پر یہ سورہ گردش کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے عرض کیا: اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ مجھے کسی ایسی چیز کی تعلیم دیجئے جسے میں سوتے وقت پڑھا کروں، آپ نے فرمایا:

"اذا اخذت مضجعك فاقرأ قل یاایھا الکافرون ثم نم علی خاتمتھا فانھا براءة من الشرك"

"جب تو اپنے بستر پر جائے تو سورہ قل یا ایھا الکافرون کو پڑھ۔ اس کے بعد سو جا کیونکہ یہ شرک سے بیزاری ہے۔[2]

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے "جبیر بن مطعم" سے فرمایا:

"کیا تو اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ جب تو سفر پر جائے تو زادِ راہ اور توشہ کے لحاظ سے اپنے ساتھیوں میں سب سے بہتر ہو"؟ اس نے عرض کی:

ہاں! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ان پانچ سورتوں کو پڑھا کرو: "قل یاایھا الکافرون" و "اذا جاء نصر اللہ والفتح" و "قل ھو اللہ احد" و "قل اعوذ برب الفلق" و "قل اعوذ برب الناس" اور اپنی قرأت کی ابتدا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے کیا کرو۔

اور ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "میرے والد کہا کرتے تھے کہ "قل یاایھا الکافرون" ربع قرآن ہے اور جب آپ اس کی قرأت سے فارغ ہوتے تو فرماتے: "اعبد اللہ وحدہ، اعبد اللہ وحدہ" "میں صرف خدائے واحد کی عبادت کرتا ہوں، "میں صرف خدائے واحد کی عبادت کرتا ہوں"۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۵۵۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ

۲۔ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ

۳۔ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ

۴۔ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ

۵۔ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ؕ

۶۔ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۧ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ کہہ دو! اے کافرو!

۲۔ جن کی تم پرستش کرتے ہو مَیں ان کی عبادت نہیں کرتا۔

۳۔ اور نہ تم اس کی عبادت کروگے جس کی مَیں پرستش کرتا ہوں۔

۴۔ اور نہ ہی مَیں ان کی پرستش کروں گا جن کی تم پرستش کرتے ہو۔

۵۔ اور نہ تم اس کی پرستش کروگے جس کی مَیں عبادت کرتا ہوں۔

۶۔ (اَب جب کہ معاملہ اس طرح ہے تو) تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے

شانِ نزول

روایات میں آیا ہے کہ یہ سُورہ مشرکین کے سرغنوں کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ مثلاً "ولید بن مغیرہ" "عاص بن وائل" "حارث بن قیس" اور "اُسیہ بن خلف" وغیرہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ اے محمدؐ! آؤ تم ہمارے دین کی پیروی کرلو، ہم بھی تمہارے دین کی پیروی کرلیتے ہیں اور ہم تمہیں اپنے تمام امتیازات میں شریک کرلیں گے۔ ایک سال تو تم ہمارے خداؤں کی عبادت کیا کرو اور دوسرے سال ہم تمہارے خدا کی عبادت کیا کریں گے۔ اگر تمہارا دین بہتر ہے تو ہم اس میں شریک ہوگئے ہیں اور اپنا حصّہ اس میں سے لے لیا ہے۔ اور اگر ہمارا دین بہتر ہوا تو تم ہمارے دین میں شریک ہوگئے اور تم نے اس میں سے اپنا حصّہ لے لیا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ کسی چیز کو اس کا شریک قرار دوں"۔

اُنہوں نے کہا: کم از کم ہمارے خداؤں کو چھُو ہی لو اور ان سے تبرّک حاصل کرلو تو ہم تمہاری بات مان لیں گے اور تمہارے خدا کی پرستش کرنے لگیں گے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"میں تو اپنے پروردگار کے حکم کا منتظر ہوں۔ تو اس موقع پر سُورۂ "قل یاایھا الکافرون" نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد الحرام میں آئے جب کہ قریش کے سرداروں کی ایک جماعت وہاں جمع تھی۔ تو آپؐ نے اُن کے سروں کے اُوپر کھڑے یہ سورہ آخر تک ان کے سامنے پڑھا۔ جب اُنہوں نے اس سُورہ کے پیام کو سُنا تو مکمل طور پر مایوس ہوگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کو آزار پہنچانے لگے"۔[1]

تفسیر

بُت پرستوں کے ساتھ ہرگز مصالحت نہیں ہوسکتی

اِس سُورہ کی آیات پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہیں: "کہہ دو اے کافرو!

---

[1] اِس شانِ نزول کو عبارتوں میں مختصر سے اختلاف کے ساتھ بہت سے مفسّرین نے نقل کیا ہے، منجملہ "طبرسیؒ نے "مجمع البیان" میں، "قرطبی" نے اپنی تفسیر میں، "ابوالفتوح رازیؒ نے اپنی تفسیر میں، اور "سیوطی" نے "درالمنثور" میں۔

(قل یاایھا الکافرون)۔

" تم جن کی پرستش کرتے ہو میں ان کی پرستش نہیں کرتا" (لا اعبد ما تعبدون)۔

" اور نہ ہی تم اس کی پرستش کرو گے جس کی میں پرستش کرتا ہوں" (ولا انتم عابدون ما اعبد)۔

اس طرح اپنی مکمل علیحدگی کو مشخص کرتا ہے اور صراحت کے ساتھ کہتا ہے: " میں ہرگز بھی بُت پرستی نہیں کروں گا" اور تم بھی اپنی اس ہٹ دھرمی اور اپنے بڑوں کی اندھی تقلید کے باعث، جس پر تمہیں اصرار ہے، اور بُت پرستوں کی طرف سے جو بکثرت ناجائز منافع تمہیں حاصل ہوتے ہیں اس وجہ سے ہرگز شرک سے خالص خدا پرستی کی طرف نہیں آ سکتے۔

بُت پرستوں کو توحید و بُت پرستی میں کسی قسم کی مصالحت سے مکمل طور پر مایوس کرنے کے لیے دوبارہ مزید فرماتا ہے: اور نہ ہی میں ہرگز ان کی پرستش کروں گا جن کی تم پرستش کرتے ہو" (ولا انا عابد ما عبدتم)۔

" اور نہ ہی تم اس کی پرستش کرو گے جس کی میں عبادت کرتا ہوں" (ولا انتم عابدون ما اعبد)۔

اس بنا پر بُت پرستی کے مسئلہ پر بے جا مصالحت کے لیے اصرار نہ کرو، کیونکہ یہ بات غیر ممکن ہے۔

" اب جب کہ معاملہ اس طرح ہے تو تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے" (لکم دینکم ولی دین)۔

" بہت سے مفسرین نے یہ تصریح کی ہے کہ یہاں "کافرون" سے مراد مکہ کے بُت پرستوں کے سرغنوں کا ایک خاص گروہ ہے، اس بنا پر "الکافرون" پر "الف ولام" اصطلاح کے مطابق "عہد" کا ہے "جمع" کا نہیں ہے۔

ممکن ہے کہ اس مطلب پر ان کی دلیل۔ اس چیز کے علاوہ جو شانِ نزول میں بیان کی جا چکی ہے — یہ ہو کہ مکہ کے بُت پرستوں میں سے بہت سے آخرکار ایمان لے آئے تھے۔ اس بنا پر اگر وہ یہ کہتا ہے کہ: " نہ تم میرے معبود کی عبادت کرو گے اور نہ ہی میں تمہارے معبودوں کی، تو یقینی طور پر یہ شرک و کفر کے سرغنوں کے اس گروہ کے بارے میں ہے جو آخری عمر تک ہرگز ایمان نہیں لایا، ورنہ فتح مکہ کے موقع پر بہت سے مشرکین فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔

یہاں چند سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے۔

۱۔ یہ سورہ "قل" (کہہ دے) کے ساتھ شروع کیوں ہوا؟

کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ "قل" اس کے آغاز میں لائے بغیر "یاایھاالکافرون" کہا جاتا؟ دوسرے لفظوں میں پیغمبرؐ کو خدا کے حکم کا اجرا کرنا چاہیئے تھا اور انہیں "یاایھاالکافرون" کہنا چاہیئے تھا، نہ کہ جملہ "قل" کا بھی تکرار کریں۔

اس سوال کا جواب سورہ کے مضمون کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوتا ہے۔ کیونکہ مشرکین عرب نے پیغمبرؐ کو بُتوں کے سلسلے میں مصالحت کرنے کی دعوت دی تھی، لہٰذا آپ کے لیے اپنی طرف سے اس مطلب کی نفی کرنا ضروری تھا اور یہ کہنا چاہیئے تھا کہ میں ہرگز تمہاری بات نہیں مانوں گا اور اپنی عبادت کو شرک سے آلودہ نہیں کروں گا۔ اگر اس سورہ کے آغاز میں لفظ "قل" نہ ہوتا تو یہ بات خدا کی بات ہو جاتی اور اس صورت میں "لا اعبد ما تعبدون" (تم جن کی عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کروں گا) کا جملہ اور اسی قسم کے دوسرے جملوں کا کوئی مفہوم نہ ہوتا۔

اس کے علاوہ چونکہ جبرئیل کے پیام میں لفظ "قل" خدا کی طرف سے تھا، لہٰذا پیغمبرؐ کی ذمہ داری یہ ہے کہ قرآن کی اصالت

کی حفاظت کے لیے اسے بعینہٖ بیان کریں اور خود یہی چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ "جبرئیل" اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی الٰہی کے نقل کرنے میں معمولی سی بھی تبدیلی نہیں کی اور اُنہوں نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایسے مامور ہیں جو فقط فرمانِ الٰہی پر ہی کان دھرتے ہیں جیسا کہ سُورۂ یونس کی آیہ ۱۵ میں آیا ہے: قل ما یکون لی ان ابدّلہ من تلقائی نفسی ان اتبع الّا ما یوحٰی الیّ: کہ دیجئے مجھے اس بات کا کوئی حق نہیں ہے کہ میں قرآن کو اپنی طرف سے بدل دوں، میں تو صرف اس بات کی پیروی کرتا ہوں جس کی مجھ پر وحی ہوتی ہے۔

۲۔ کیا بُت پرست خدا کے منکر تھے؟

ہم جانتے ہیں کہ بُت پرستوں کو ہرگز خدا کا انکار نہیں تھا۔ اور قرآن کی صریح آیات کے مطابق جب اُن سے آسمان و زمین کے خالق کے بارے میں پوچھا جاتا تھا تو وہ یہ جواب دیتے تھے کہ وہ خدا ہے: ولئن سألتھم من خلق السّمٰوٰت والارض لیقولن اللہ (لقمان - ۲۵)

تو پھر وہ اس سُورہ میں یہ کیسے کہتا ہے: "نہ تو میں تمہارے معبود کی پرستش کروں گا اور نہ ہی تم میرے معبود کی پرستش کرو گے"

اس سوال کا جواب بھی اس چیز کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ بحث مسئلہ خلقت کے بارے میں نہیں ہے بلکہ مسئلہ عبادت کے بارے میں ہے۔ بُت پرست، خالقِ جہاں خدا ہی کو سمجھتے تھے۔ لیکن ان کا عقیدہ یہ تھا کہ عبادت بتوں ہی کی کرنا چاہیئے تاکہ وہ بارگاہِ خدا میں واسطہ بنیں، یا یہ کہ ہم اصلاً اس لائق نہیں ہیں کہ خدا کی پرستش کریں، لہٰذا ہمیں جسمانی بتوں کی عبادت کرنا چاہیئے۔ اس موقع پر قرآن اُن کے اوہام اور خیالات پر سُرخ لکیر کھینچتے ہوئے رد کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ عبادت تو صرف خدا ہی کی ہونا چاہیئے، نہ بُتوں کی ہونا چاہیئے اور نہ ہی دونوں کی۔

۳۔ یہ تکرار کس لیے ہے؟

اس بارے میں کہ پیغمبرؐ کی طرف سے بُتوں کی عبادت کی نفی کی تکرار اور مشرکین کی طرف سے خدا کی عبادت کی نفی کی تکرار کس بنا پر ہے، بہت زیادہ اختلاف ہے۔

ایک جماعت کا عقیدہ تو یہ ہے کہ یہ تکرار تاکید اور مشرکین کو مکمل طور پر مایوس کرنے، ان کے راستے کو اسلام کے راستے سے جُدا کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لیے ہے کہ توحید و شرک کے درمیان مصالحت کا امکان نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں، چونکہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شرک کی طرف دعوت دینے میں اصرار کے ساتھ تکرار کرتے تھے، لہٰذا قرآن بھی ان کے رد کرنے میں تکرار کرتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ (امام جعفر صادق علیہ السّلام کے زمانے کے ایک زندیق) "ابوشاکر دیصانی" نے امام جعفر صادق علیہ السّلام کے ایک صحابی "ابوجعفر احول" (محمد بن علی نعمانی کوفی معروف بہ مومن طاق) سے ان آیات کے تکرار کی دلیل کے بارے میں سوال کیا اور یہ کہا کہ کیا کسی عقل مند آدمی سے یہ بات ممکن ہے کہ اس کے کلام میں اس قسم کی تکرار ہو؟

ابوجعفر احول کے پاس چونکہ اس کا کوئی جواب نہیں تھا لہٰذا وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں مدینہ پہنچے اور اس سلسلہ میں سوال کیا، تو امامؑ نے فرمایا:

"ان آیات کے نزول اور ان میں تکرار کا سبب یہ تھا کہ قریش نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک سال آپ ہمارے خداؤں کی پرستش کریں اور دوسرے سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں گے اور اسی طرح بعد والے سال میں آپ ہمارے خداؤں کی عبادت کریں اور اس کے اگلے سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں گے، تو اُوپر والی آیات نازل ہوئیں اور ان تمام تجاویز کی نفی کی۔"

جب ابوجعفر "احول" نے "ابو شاکر" کو یہ جواب دیا تو اس نے کہا:

"هٰذا ما حمله الابل من الحجاز"

"یہ وہ بار ہے جسے اُونٹ حجاز سے اُٹھا کر لائے ہیں"[1]

(یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تیرا جواب نہیں ہے بلکہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا قول ہے)۔

بعض دوسروں نے یہ کہا ہے کہ یہ تکرار اس بنا پر ہے کہ ایک جملہ تو حال کے بیان کے لیے ہے اور دوسرا مستقبل کے بیان کے لیے، یعنی میں ہرگز بھی نہ تو حال میں تمہارے معبودوں کی پرستش کروں گا اور نہ ہی کبھی آئندہ تمہارے معبودوں کی عبادت کروں گا۔

لیکن ظاہراً اس تفسیر پر کوئی شاہد موجود نہیں ہے۔

ایک تیسری تفسیر بھی اس تکرار کے لیے بیان کی گئی ہے کہ پہلا جملہ تو معبودوں کے اختلاف کو اور دوسرا عبادت کے اختلاف کو بیان کرتا ہے۔ یعنی نہ تو میں ہرگز تمہارے معبودوں کی عبادت کروں گا اور نہ ہی میری عبادت تمہاری عبادت کی طرح ہے، کیونکہ میری عبادت مخلصانہ اور ہر قسم کے شرک سے خالی ہے۔

علاوہ ازیں تمہارا بتوں کی عبادت کرنا بڑوں کی اندھی تقلید کی بنا پر ہے۔ لیکن میرا اللہ کی عبادت کرنا تحقیق و شکرانے کے طور پر ہے[2]

لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ تکرار تاکید کے لیے ہے، جیسا کہ ہم نے اُوپر وضاحت کی ہے۔ وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

یہاں ایک چوتھی تفسیر بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ: "دوسری آیت میں تو یہ فرماتا ہے کہ جن کی تم اَب

---

[1] "تفسیر علی بن ابراہیم" جلد ۲ ص ۴۴۵

[2] اس تفسیر کی بنا پر "ما" دوسری اور تیسری آیت میں "ما موصولہ" ہے، اور چوتھی اور پانچویں آیت میں "مصدریہ" اس وجہ کو ابوالفتوح رازی نے ایک تفسیر کے عنوان سے جلد ۱۲ ص ۱۹۲ پر نقل کیا ہے اور مرحوم طبرسی نے بھی زیر بحث آیات کے ذیل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

عبادت کررہے ہو میں ان کی عبادت نہیں کروں گا۔ اور چوتھی آیت میں فرماتا ہے کہ "میں نے گزشتہ زمانہ میں بھی کبھی تمہارے معبودوں کی عبادت نہیں کی ہے چہ جائیکہ اَب کروں"

یہ فرق اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ دوسری آیت میں "تعبدون" فعل مضارع کی صورت میں ہے، اور چوتھی آیت میں "عبدتم" فعل ماضی کی صورت میں ہے، بعید نظر نہیں آتا۔[1]

اگرچہ یہ تفسیر صرف دوسری اور چوتھی آیت کے تکرار کو تو حل کرتی ہے، لیکن تیسری اور پانچویں آیت اُسی طرح اپنی پُوری قوت کے ساتھ باقی رہتی ہے۔[2]

۴۔ کیا "لکم دینکم ....." کی آیت کا مفہوم بُت پرستی کا جواز ہے؟

کبھی یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس سُورہ کی آخری آیت جو یہ کہتی ہے کہ: "تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے" تو اس کا مفہوم وہی "صلح کل" ہی ہے اور یہ انہیں اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنے دین پر برقرار رہیں کیونکہ یہ دینِ اسلام کو قبول کرنے پر اصرار نہیں کرتی۔

لیکن یہ خیال انتہائی کمزور اور بے بُنیاد ہے کیونکہ آیات کا لب ولہجہ اچھی طرح سے اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ تعبیر ایک قسم کی تحقیر وتہدید ہے، یعنی تمہارا دین خود تمہیں ہی مبارک ہو اور تم جلدی ہی اس کے بُرے انجام کو دیکھ لوگے جیسا کہ سُورۂ قصص کی آیہ ۵۵ میں آیا ہے: و اذا سمعوا اللغو اعرضوا عنه و قالوا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم سلام علیکم لانبتغی الجاهلین: "مومنین جب کوئی لغو اور بیہودہ بات سُنتے ہیں تو اس سے رُوگردانی کرلیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ تم پر سلام (وداع اور جُدائی کا سلام) ہم جاہلوں کے طلب گار نہیں ہیں"!

قرآن مجید کی سینکڑوں آیتیں اس مفہوم کی گواہ ہیں جو شرک کی ہر صُورت میں سرکوبی کرتی ہیں، اسے ہر کام سے زیادہ قابلِ نفرت سمجھتی ہیں اور اُسے نہ بخشا جانے والا گناہ خیال کرتی ہیں۔

علمانے اس سوال کے دوسرے جواب بھی دیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آیت میں کچھ محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: لکم جزاء دینکم ولی جزاء دینی[3] "یعنی تمہارے دین کی جزا تمہارے لیے اور میرے دین کی جزا میرے لیے"۔

دوسرے یہ کہ یہاں "دین" جزا کے معنی میں ہے۔ اور آیت میں کوئی بھی چیز محذوف نہیں ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنی جزا لوگے اور میں اپنی جزا لوں گا۔[4]

---

[1] اس بنا پر "عابد" کو بھی جو اسم فاعل ہے اس آیت میں ماضی کا معنی دینا چاہیئے۔

[2] ضمنی طور پر اس بات پر بھی توجہ کرنا چاہیئے کہ "ما موصولہ" اگرچہ عام طور پر غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے لیکن بہت سے مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ یہ ذوی العقول کیلیے بھی استعمال ہوتا ہے، قرآن کی آیات بھی اس مطلب کی شاہد ہیں۔

[3] ضمناً توجہ رکھنا چاہیئے کہ ولی دین کے جملہ میں دین مکسور ہے اور اس کا کسرہ یا محذوف پر دلالت کرتا ہے، اور اصل میں یہ ولی دینی تھا۔

لیکن پہلی تفسیر اور پہلا جواب زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

۵۔ آپ نے ایک لمحہ کے لیے بھی شرک سے مصالحت نہیں کی۔

اس سورہ میں جو کچھ آیا ہے وہ حقیقت میں اس واقعیت کو بیان کرتا ہے کہ توحید و شرک دو متضاد پروگرام اور مکمل طور پر دو الگ الگ راستے ہیں اور ان میں ایک دوسرے کے ساتھ کسی قسم کی مشابہت نہیں ہے۔ توحید انسان کو خدا سے مربوط کرتی ہے جب کہ شرک اس کو خدا سے بیگانہ کر دیتا ہے۔

توحید تمام مرحلوں اور میدانوں میں وحدت و یگانگی کی رمز ہے جب کہ شرک زندگی کے تمام شئون میں تفرقہ اور پراگندگی کا سبب ہے۔

توحید انسان کو عالم مادہ اور جہان طبیعت سے بلندی کی طرف لے جاتی ہے اور ماورا طبیعت میں خدا کے لامتناہی وجود کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑ دیتی ہے، جبکہ شرک انسان کو طبیعت کے کنویں میں سرنگوں کر دیتا ہے اور اس کا رشتہ محدود، کمزور اور فانی موجودات کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔

اسی بنا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام انبیاء عظام نے نہ صرف شرک کے ساتھ مصالحت نہیں کی، بلکہ ان کا پہلا اور اہم ترین پروگرام شرک کے ساتھ مبارزہ کرنا تھا۔

آج بھی راہ حق کے تمام چلنے والوں اور اس دین کے علماء و مبلغین کو یہی راستہ اور طریقہ اختیار کرنا چاہیئے اور ہر جگہ اور ہر مقام پر ہر قسم کے شرک اور مشرکین سے سازباز اور مصالحت سے اپنی برأت اور بیزاری کا اعلان کرنا چاہیئے۔

یہی اسلام کی اصل راہ ہے۔

خداوندا! ہمیں شرک اور شرک آلودہ افکار و اعمال سے دور رکھ۔

پروردگارا! ہمارے زمانہ کے مشرکین کے وسوسے بھی خطرناک ہے، ہمیں ان کے دام فریب میں گرفتار ہونے سے محفوظ رکھ۔

بارالہا! ہمیں ایسی شجاعت اور صراحت و قاطعیت مرحمت فرما کہ ہم بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح ہر قسم کے کفر و شرک کی مصالحت کی پیش کش کو رد کر دیں۔

❊ ❊ ❊

آمین یا رب العالمین

سورۂ کافرون کا اختتام

اختتام ترجمہ

بروز ہفتہ تقریباً آٹھ بجے صبح

۵ شوال ۱۴۰۸ھ

برمکان خود قم مقدس ایران

حضرت علی اسے پکڑ کر مدینہ لے آئے۔ ۳۴۷

لقمان

.. ایک مشہور حکیم و دانا ۲۸۰

محمد بن حنفیہ

.. صمد کے معنی جناب امیرؑ سے دریافت کیے۔ ۳۷۷

محمدؐ بن عبداللہ رسول پاکؐ

.. قرآن میں درخشاں ستارے ہیں ان پر اور ستارے ہیں۔ نہ عجائبات ختم ہوتے ہیں نہ مطالب پرانے ہوتے ہیں اس میں ہدایت کے چراغ اور حکمت کی منزلیں ہیں۔ ۲۵

.. جو شخص سورہ بلد تلاوت کرے گا خدا اُسے قیامت میں اپنے غضب سے امان دے گا۔ ۳۱

.. انسان کی آنکھوں کو پلکوں سے اور زبان کو ہونٹوں سے ضبط میں رکھا گیا ہے۔ ۴۲

.. لوگو! تمھارے لیے دو (خیر اور شر کی) سرزمینیں موجود ہیں۔ ۴۵، ۴۹

.. دشوار گزار گھاٹی سے بھاری بوجھ والے نہیں گذر سکیں گے۔ میں چاہتا ہوں اس بوجھ کو ہلکا کر دوں۔ ۴۹

.. غلاموں کو آزاد اور گردنوں کو (طوقِ غلامی سے) رہائی دے۔ جن رشتہ داروں نے تجھ سے قطع رحمی کی ان سے بھی اچھا سلوک کر، بھوکوں کو کھلا، امر و نہی کر، زبان بند رکھ ۵۱

.. خداوندا! میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا فرما۔ تو ولی و مولیٰ ہے تزکیہ فرما۔ ۶۶، ۶۷

.. جس کے نفس کا خدا نے تزکیہ کیا وہ نجات پا گیا۔ جسے خیر سے محروم کر دیا وہ نا امید ہو گیا۔ ۶۷

.. من اشقی الاٰخرین۔ جناب امیرؑ نے فرمایا۔ نہیں معلوم۔ فرمایا، جو شخص تیرے سر پر ضرب لگائے گا۔ ۷۱

.. خدا کے نزدیک پسندیدہ عمل بھوکے کو کھانا کھلانا، قرضہ ادا کرنا، مومن کا دل خوش کرنا۔ ۹۵

.. جو شخص مسلمانوں کے کسی گھرانے کی ایک دن رات پذیرائی کرے، خدا اس کے گناہوں کو بخش دے گا۔ ۹۶

.. جو شخص والضحیٰ کی تلاوت کرے گا۔ اللہ اس سے راضی اور محمدؐ اس کے شفیع ہوں گے۔ ۹۹

.. قسم ہے دن اور روشنی کی، رات اور سکون کی، خدا نے تجھے نہیں چھوڑا، تیری آخرت دنیا سے بہتر ہے۔ اس قدر عطا کیا جائے گا کہ تو خوش ہو گا۔ ۱۰۲، ۱۰۳

سُورَۂ نَصر

❖ یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوا۔

❖ اِس میں ۳ آیات ہیں۔

سُورۂ "نصر" کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سُورہ مدینہ میں ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے اور اس میں ایک بہت بڑی کامیابی اور فتح عظیم کی بشارت ہے کہ اس کے بعد لوگ گروہ در گروہ خدا کے دین میں داخل ہوں گے ، لہٰذا اس عظیم نعمت کا شکر ادا کرنے کے لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسبیح ، حمد الٰہی اور استغفار کرنے کی دعوت دی گئی ہے ۔

اگرچہ اسلام میں بہت سی فتوحات ہوئی ہیں لیکن اُوپر والی بات کے پُورا ہونے کے طور پر " فتح مکّہ " کے سوا اور کوئی فتح نہیں تھی ۔

خصوصاً جب کہ بعض روایات کے مطابق عربوں کا نظریہ یہ تھا کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکّہ کو فتح کرلیا اور وہ اس پر مسلط ہوگئے ، تو یہ ان کے حقانیت کی دلیل ہوگی ، کیونکہ اگر وہ حق پر نہ ہوئے تو خدا انہیں اس قسم کی اجازت نہیں دے گا ، جیسا کہ اس نے "ابرہہ" کے عظیم لشکر کو اس قسم کی اجازت نہیں دی تھی ۔ اسی بنا پر مشرکین عرب فتح مکّہ کے بعد گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوگئے ۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ سُورہ "صلح حدیبیہ" کے بعد اور فتح مکّہ سے دو سال پہلے ہجرت کے چھٹے سال نازل ہوا ۔ لیکن یہ بات ، جس کے بارے میں بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہ فتح مکّہ کے بعد ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع میں نازل ہوا ، بہت ہی بعید ہے کیونکہ اس سُورہ کی تعبیریں اس معنی کے ساتھ سازگار نہیں ہیں ، کیونکہ یہ مستقبل سے مربوط ایک حادثہ کی خبر دیتا ہے نہ کہ گزشتہ کی ۔

اس سُورہ کا ایک نام سُورہ " تودیع " ہے ۔ (تودیع یعنی خدا حافظ) کیونکہ اس میں ضمنی طور پر پیغمبرؐ کی رحلت کی خبر ہے ۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس وقت یہ سورہ نازل ہوا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی اپنے اصحاب کے

سامنے تلاوت کی تو سب کے سب بہت خوش اور مسرور ہوئے، لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباسؓ اس کو سُن کر رونے لگے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اے چچا! آپ کیوں رو رہے ہیں؟

عرض کیا: میرا گمان یہ ہے کہ اس سُورہ میں آپؐ کی رحلت کی خبر دی گئی ہے۔ تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"یہی بات ہے جو آپ کہہ رہے ہیں"[1]

اس بارے میں کہ یہ مطلب اس سُورہ کے کس جملہ سے معلوم ہوتا ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کیونکہ آیات کے ظاہر میں تو فتح اور کامیابی کی بشارت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ ظاہراً اس مفہوم کا اس بات سے استفادہ کیا گیا ہے کہ یہ سُورہ اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت آخرت کو پہنچ رہی ہے۔ آپ کا دین مکمل طور پر ثابت اور مستقر ہو چکا ہے اور یہ معلوم ہے کہ ایسی حالت میں سرائے فانی سے جہان باقی کی طرف رحلت کی توقع پورے طور پر قابل پیش بینی ہے۔

اِس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"من قرأها فكانما شهد مع رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فتح مكة"

"جو شخص اس کی تلاوت کرے گا وہ اس شخص کے مانند ہے جو فتح مکہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھا"[2]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

"جو شخص سُورۂ "اذا جاء نصر الله والفتح" کو نافلہ یا واجب نماز میں پڑھے گا خدا اس کو اس کے تمام دشمنوں پر فتح یاب کرے گا اور وہ قیامت میں اس حالت میں وارد محشر ہوگا کہ اس کے ہاتھ میں ایک عہد نامہ ہوگا، جو بات کرے گا، خدا نے اُسے اس کی قبر کے اندر سے باہر بھیجا ہے، اور وہ جہنم کی آگ سے امان نامہ ہے"[3]

کہے بغیر واضح ہے کہ یہ سب اعزاز و افتخار اور فضیلت اس شخص کے لیے ہے جو اس سورہ کو پڑھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرے اور ان کے راستے اور طریقہ پر چلے اور آپ کے دین و آئین اور سُنّت پر عمل کرے، نہ کہ صرف لقلقۂ لسانی پر قناعت کرے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۴۔ یہ مضمون متعدد روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ (المیزان جلد ۲۰ ص ۵۳۲)۔

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۳

[3] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ
۲۔ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ
۳۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۧ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ جب خُدا کی مدد اور کامیابی آن پہنچے
۲۔ اور تُو دیکھے گا کہ لوگ گروہ دَر گروہ خُدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں
۳۔ پس تم اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجا لاؤ اور اس سے استغفار کرو کہ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

تفسیر

جب اصلی کامیابی آن پہنچے

اِس سُورہ کی پہلی آیت جس میں فرماتا ہے: "جس وقت خدا کی مدد اور کامیابی آن پہنچے"۔ (اذا جاء نصر اللہ والفتح)
"اور تُو دیکھے گا کہ لوگ گروہ در گروہ خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں"۔ (ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجًا)۔
تو اس عظیم نعمت اور اس کامیابی اور نصرتِ الٰہی کے شکرانے کے طور پر اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجالاؤ اور اس سے

بخشش طلب کرو کہ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ (فسبح بحمد ربك واستغفره انه كان توابا)۔

ان تین مختصر اور پُرمعنی آیات میں بہت سے ایسے نکات ہیں جن میں غور کرنے سے اس سُورہ کے اصلی ہدف کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

۱۔ پہلی آیت میں "نصرت" کی اضافت "خدا" کی طرف ہوئی ہے (نصرالله) صرف یہی ایک جگہ نہیں ہے کہ جہاں یہ اضافت نظر آرہی ہے، بلکہ قرآن کی بہت سی آیات میں یہ معنیٰ منعکس ہے۔ منجملہ ان کے سُورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۴ میں آیا ہے۔ (الا ان نصرالله قریب) "جان لو کہ خدا کی مدد قریب ہے"۔

اور سُورہ آل عمران کی آیہ ۱۲۶ اور انفال کی آیہ ۱۰ میں آیا ہے۔ (وما النصر الا من عندالله) "نصرت تو صرف خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نصرت و کامیابی ہر حال میں خدا کے ارادہ سے ہی ہوتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے توانائیوں کو مجتمع کرنا اور قدرت و طاقت مہیا کرنا ضروری ہے، لیکن ایک موحد آدمی نصرت کو خدا ہی کی طرف سے سمجھتا ہے اور اسی بنا پر کامیابی کی صُورت میں مغرور نہیں ہوتا بلکہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

۲۔ اس سُورہ میں پہلے نصرتِ الٰہی، پھر فتح و کامرانی اور اس کے بعد اسلام کے نفوذ و وسعت اور لوگوں کے خدا کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہونے کی بات کی گئی ہے۔ یہ تینوں ایک دوسرے کی علّت و معلول ہیں۔ جب تک خدا کی نصرت اور مدد نہ ہو، فتح و کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور جب تک فتح و کامیابی حاصل نہ ہو اور راستہ کی رکاوٹیں دُور نہ ہوں، لوگ گروہ در گروہ مسلمان نہیں ہوتے۔ البتہ ان تین مرحلوں کے بعد جن میں سے ہر ایک بہت بڑی نعمت ہے، چوتھا مرحلہ شکر اور حمد و ستائش الٰہی کا آتا ہے۔

اور دوسری طرف سے خدائی نصرت اور کامیابی اس لیے ہے کہ اصل ہدف یعنی لوگوں کا خدا کے دین میں داخل ہونا اور عمومی ہدایت صورت پذیر ہو۔

۳۔ "فتح" یہاں مطلق صُورت میں بیان ہوا ہے اور ان قرائن کی بنا پر جن کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے، اس سے مُراد فتح مکّہ ہے، جس کا ایسا ہی ردِّ عمل ہوا تھا۔ اور واقعاً فتح مکّہ نے تاریخ اسلام میں ایک نئی فصل کا اضافہ کیا، کیونکہ اس سے شرک کا اصلی مرکز تباہ و برباد ہو گیا، بُت توڑ دیے گئے اور بُت پرستوں کی اُمید مایوسی اور نا اُمیدی میں تبدیل ہو گئی اور لوگوں کے لیے اسلام پر ایمان کے راستے میں جو رکاوٹیں تھیں وہ ہٹ گئیں۔ اسی بنا پر فتح مکّہ کو جزیرۃ العرب میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں اسلام کے ثبات و استقرار کا مرحلہ سمجھنا چاہیئے۔ اور اسی لیے مشرکین کی جانب سے فتح مکّہ کے بعد (سوائے ایک موقع کے جس کی جلدی ہی سرکوبی ہو گئی) کسی قسم کا مقابلہ نظر نہیں آیا اور لوگ تمام علاقوں سے اسلام قبول کرنے کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے۔

۴۔ تیسری آیت کے ذیل میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (اور طبعاً سب مومنین کو) تین اہم حکم دیتا ہے جو حقیقت میں

اس عظیم کامیابی کا شکرانہ اور اس نصرتِ الٰہی کے مقابلہ میں ایک مناسب عکس العمل ہے۔ اور وہ تسبیح، حمد اور استغفار کا حکم ہے۔

"تسبیح" کا معنی خدا کو ہر قسم کے عیب و نقص سے منزّہ سمجھنا ہے۔ "حمد" صفاتِ کمالیہ کے ساتھ اس کی توصیف و تعریف کرنا ہے، اور "استغفار" بندوں کی کوتاہیوں اور تقصیروں کو ظاہر کرتا ہے۔

یہ عظیم کامیابی اس بات کا سبب بنی ہے کہ شرک آلودہ افکار میں کمی ہو، خدا کا کمال و جمال زیادہ سے زیادہ ظاہر ہو اور راستہ سے بھٹکے ہوئے لوگ حق کی طرف لوٹ آئیں۔

یہ فتح عظیم سبب بنی ہے کہ لوگ یہ گمان نہ کریں کہ خدا اپنے اولیا اور دوستوں کو تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ (اس نقص سے پاکیزگی) اور وہ یہ بھی جان لیں کہ خدا اپنے وعدوں کے انجام دینے پر توانا ہے۔ (اس کمال سے موصوف ہونا) اور بندے بھی اس کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے نقص کا اعتراف کریں۔

اس کے علاوہ ممکن ہے کہ انسان میں کامیابی کے وقت غیر مطلوب ردِّ عمل پیدا ہو جائے اور وہ "غرور و تکبّر اور خود کو برتر سمجھنے" میں مبتلا ہو جائے۔ یا دشمن سے "انتقام لینے اور ذاتی حساب چکانے" کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ یہ تینوں احکام اُسے اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ وہ کامیابی کے حساس لمحات میں خدا کی صفاتِ جلال و جمال کی یاد میں رہے، سب چیزوں کو اس کی طرف سے سمجھے اور استغفار میں مشغول ہو جائے تاکہ غرور و غفلت بھی اس سے زائل ہو اور وہ جذبۂ انتقام سے بھی دُور ہو۔

۵۔ مسلمہ طور پر پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام انبیا کی طرح "معصوم" تھے، پس یہ استغفار کا حکم کس لیے ہے؟

اس سوال کے جواب میں ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہ تو ساری اُمت کے لیے ایک نمونہ و اسوہ اور دستور العمل ہے کیونکہ:

اولاً: اس طولانی مبارزہ کے طویل زمانہ میں، جو بہت زیادہ سالوں تک جاری رہا (تقریباً بیس سال) اور مسلمانوں نے بہت سخت اور دردناک دن گزارے، بعض اوقات تو حادثات ایسے پیچیدہ ہو جاتے تھے کہ جانیں لبوں تک پہنچ جاتی تھیں اور بعض لوگوں کے افکار میں خدائی وعدوں کے بارے میں بُرے گمان پیدا ہو جاتے تھے، جیسا کہ قرآن جنگ "احزاب" کے بارے میں فرماتا ہے: وبلغت القلوب الحناجر و تظنون باللہ الظنونا: "اور دل گلے تک آ گئے اور تم اللہ کے بارے میں (نامناسب) گمان کرنے لگے۔ (احزاب - ۱۰)

اب جب کہ کامیابی حاصل ہو گئی ہے تو وہ اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ وہ سب بدگمانیاں اور بے تابیاں غلط تھیں، لہٰذا انہیں استغفار کرنا چاہیے۔

ثانیاً: انسان چاہے جتنی بھی خدا کی حمد و ثنا کرے، پھر بھی وہ اس کے شکر کا حق ادا نہیں کر سکتا، لہٰذا اُسے حمد و ثنا کے آخر میں اپنی تقصیر و کوتاہی کی بنا پر "خدا کی بارگاہ میں" استغفار کرنا چاہیے۔

ثالثاً: عام طور پر کامیابیوں کے بعد شیطانی وسوسے شروع ہو جاتے ہیں اور ایک طرف "غرور" اور دوسری طرف "تندروی اور انتقام جوئی" کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس موقع پر خدا کو یاد رکھنا چاہیے اور مسلسل استغفار کرتے رہنا چاہیے، تاکہ ان میں سے کوئی سی حالت بھی پیدا نہ ہو۔ یا اگر پیدا ہو بھی تو بیرطرف ہو جائے۔

رابعاً: جیسا کہ ہم نے سُورہ کے آغاز میں بیان کیا ہے اس کامیابی کا اعلان تقریباً پیغمبرؐ کی ماموریت کے اختتام

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر کے پورا ہونے اور لقائے محبوب کے لیے جانے کے اعلان کے معنی میں ہے۔
اور یہ حالت "تسبیح و "حمد" و "استغفار" سے مناسبت رکھتی ہے۔ اسی لیے روایات میں آیا ہے کہ اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جملہ کا بہت زیادہ تکرار فرماتے تھے:

"سبحانك اللّٰهم وبحمدك، اللّٰهم اغفرلی انك انت التواب الرحیم"

"خداوندا! تو پاک و منزہ ہے، اور میں تیری حمد و ثنا کرتا ہوں۔ خداوندا! مجھے بخش دے کہ تو بہت ہی توبہ کو قبول کرنے والا اور مہربان ہے"[1]

۶۔ "انه كان توّابا" کا جملہ مسئلہ استغفار کی علت کا بیان ہے۔ یعنی استغفار و توبہ کر کیونکہ خدا بہت ہی توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔

ضمنی طور پر شاید اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ جب خدا تمہاری توبہ کو قبول کر لیتا ہے تو تم بھی کامیابی کے بعد جہاں تک ہو سکے کوتاہی کرنے والوں کی توبہ کو قبول کر لو۔ اور جب تک ان سے مخالفت کا ارادہ یا سازش کے آثار ظاہر نہ ہوں انہیں اپنے سے دور نہ کرو۔ لہٰذا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس فتح مکہ کے ماجرے میں شکست خوردہ کینہ ور دشمنوں کے مقابلہ میں اسلامی رافت و رحمت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا ہے۔

یہ صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی سیرت نہیں ہے کہ آپ دشمن پر آخری اور اصلی فتح حاصل کرنے کے موقع پر تسبیح و حمد و استغفار میں مصروف ہو گئے، بلکہ سارے ہی انبیاء کی تاریخ میں یہ مطلب اچھی طرح نمایاں ہے۔

مثلاً حضرت "یوسف" علیہ السلام جب مصر کے تختِ حکومت پر بیٹھے اور ایک طویل جدائی کے بعد ان کے ماں باپ اور بھائی ان سے آکر ملے تو عرض کی: رب قد اٰتیتنی من الملك وعلّمتنی من تأویل الاحادیث فاطر السماوات والارض انت ولیّی فی الدنیا والاٰخرة توفّنی مسلمًا والحقنی بالصالحین: پروردگارا! تو نے حکومت کا ایک بہت بڑا حصہ مجھے دیا ہے اور تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا کیا ہے، تو ہی آسمان و زمین کو پیدا کرنے والا ہے اور تو ہی دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے۔ مجھے مسلمان کی حیثیت سے موت دینا اور صالحین کے ساتھ ملحق کرنا" (یوسف۔ ۱۰۱)

پیغمبر خدا حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب ملکۂ سبا کے تخت کو اپنے سامنے حاضر دیکھا تو کہا:

"هٰذا من فضلِ ربّی لیبلونی ءاشکر ام اکفر":

"یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ آیا میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں؟" (نمل۔ ۴۰)

ایک نکتہ

فتح مکہ اسلام کی عظیم ترین فتح

فتح مکہ نے۔ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایک نئی

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۴

فصل کا اضافہ کیا ہے اور تقریباً بیس سال کے بعد دشمن کی معاندتوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا - حقیقت میں فتح مکہ سے جزیرۃ العرب سے شرک و بت پرستی کی بساط لپیٹ دی گئی اور اسلام دنیا کے دوسرے ممالک کی طرف حرکت کے لیے آمادہ ہوا۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیبیہ کے عہد و پیمان اور صلح کے بعد کفار نے عہد شکنی کی اور اس صلح نامہ کو نظر انداز کر دیا۔ اور پیغمبر کے بعض حلیفوں کے ساتھ زیادتی کی، آپ کے حلیفوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی تو رسول اللہؐ نے اپنے حلیفوں کی مدد کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اور دوسری طرف مکہ میں بت پرستی، شرک اور نفاق کا جو مرکز قائم تھا اس کے ختم ہونے کے تمام حالات فراہم ہو گئے تھے اور یہ ایک ایسا کام تھا جسے ہر حالت میں انجام دینا ضروری تھا۔ اس لیے پیغمبر خدا کے حکم سے مکہ کی طرف جانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

فتح مکہ تین مراحل میں انجام پائی :-

پہلا مرحلہ مقدماتی تھا، یعنی ضروری قوا اور توانائیوں کو فراہم کرنا، زمانہ کے موافق حالات کا انتخاب اور دشمن کی جسمانی و روحانی قوت و توانائی کی مقدار و کیفیت کی حیثیت کے بارے میں کافی اطلاعات حاصل کرنا تھا۔

دوسرا مرحلہ، فتح کے مرحلہ کو بہت ہی ماہرانہ اور ضائعات و تلفات یعنی نقصان کے بغیر انجام دینا تھا۔

اور آخری مرحلہ، جو اصلی مرحلہ تھا وہ اس کے آثار و نتائج کا مرحلہ تھا۔

۱۔ یہ مرحلہ انتہائی دقت، باریک بینی اور لطافت کے ساتھ انجام پایا، خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ و مدینہ کی شاہراہ کو اس طرح سے قرق کر لیا تھا کہ اس عظیم آمادگی کی خبر کسی طرح سے بھی اہل مکہ کو نہ پہنچ سکی۔ اس لیے انہوں نے کسی قسم کی تیاری نہ کی، وہ مکمل طور پر غفلت میں پڑے رہے اور اسی وجہ سے اس مقدس سرزمین میں اس عظیم حملے اور بہت بڑی فتح میں تقریباً کوئی خون نہیں بہا۔

یہاں تک کہ وہ خط بھی، جو ایک ضعیف الایمان مسلمان "حاطب بن ابی بلتعہ" نے قریش کو لکھا تھا اور قبیلہ "مزینہ" کی ایک عورت "کنود" یا "سارہ" نامی کے ہاتھ مکہ کی طرف روانہ کیا تھا، اعجاز آمیز طریقہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے آشکار ہو گیا۔ علی علیہ السلام کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ بڑی تیزی سے اس کے پیچھے روانہ ہوئے، انہوں نے اس عورت کو مکہ و مدینہ کی ایک درمیانی منزل میں جا لیا اور اس سے وہ خط لے کر خود اسے بھی مدینہ واپس لے آئے، جس کی داستان سورہ ممتحنہ کی پہلی آیت کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے[1]۔

بہر حال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں اپنا ایک قائم مقام مقرر کر کے ہجرت کے آٹھویں سال ماہ رمضان کی دس تاریخ کو مکہ کی طرف چل پڑے، اور دس دن کے بعد مکہ پہنچ گئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے راستے کے وسط میں اپنے چچا عباسؓ کو دیکھا کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے آپ کی طرف آ رہے ہیں۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اپنا سامان مدینہ بھیج دیجئے اور خود ہمارے

---

[1] "تفسیر نمونہ" جلد ۲۴ صـ۸

ساتھ چلیں ، اور آپ آخری مہاجر ہیں ۔

۲۔ آخرکار مسلمان مکّہ کے قریب پہنچ گئے اور شہر کے باہر، اطراف کے بیابانوں میں اس مقام پر جسے " مرّالظہران " کہا جاتا تھا اور جو مکّہ سے چند کلو میٹر سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھا، پڑاؤ ڈال دیا۔ اور رات کے وقت کھانا پکانے کے لیے (یا شاید اپنی وسیع پیمانہ پر موجودگی کو ثابت کرنے کے لیے) وہاں آگ روشن کردی۔ اہلِ مکّہ کا ایک گروہ اس منظر کو دیکھ کر حیرت میں ڈوب گئے۔

ابھی تک پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور لشکرِ اسلام کے اس طرف آنے کی خبریں قریش سے پنہاں تھیں۔ اس رات اہلِ مکّہ کا سرغنہ ابوسفیان اور مشرکین کے بعض دوسرے سرغنے خبریں معلوم کرنے کے لیے مکّہ سے باہر نکلے۔ اس موقع پر پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباس نے سوچا کہ اگر رسول اللہؐ قہرآلود طریقہ پر مکّہ میں وارد ہوئے تو قریش میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ انہوں نے پیغمبرِ اکرمؐ سے اجازت لی اور آپؐ کی سواری پر سوار ہوکر کہا کہ میں جاتا ہوں، شاید کوئی مل جائے تو اس سے کہوں کہ اہلِ مکّہ کو اس ماجرے سے آگاہ کردے تاکہ وہ آکر امان حاصل کرلیں۔

عباس وہاں روانہ ہوکر بہت قریب پہنچ گئے۔ اتفاقاً اس موقع پر انہوں نے " ابوسفیان" کی آواز سُنی جو اپنے ایک دوست " بدیل" سے کہہ رہا تھا کہ ہم نے کبھی بھی اس سے زیادہ آگ نہیں دیکھی۔ " بدیل" نے کہا : میرا خیال ہے کہ یہ آگ قبیلہ " خزاعہ" نے جلائی ہوئی ہے۔ ابوسفیان نے کہا: قبیلہ خزاعہ اس سے کہیں زیادہ ذلیل و خوار ہیں کہ وہ اتنی آگ روشن کریں۔

اس موقع پر "عباس" نے " ابوسفیان" کو پکارا۔ ابوسفیان نے بھی عباس کو پہچان لیا اور کہا سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟ عباس نے جواب دیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جو دس ہزار مجاہدینِ اسلام کے ساتھ تمہاری طرف آ رہے ہیں۔ ابوسفیان سخت پریشان ہوا اور کہا : آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں۔

عباس نے کہا : میرے ساتھ آؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امان لے لو ورنہ قتل کردیے جاؤ گے۔

اس طرح سے عباس نے " ابوسفیان" کو اپنے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری پر ہی سوار کرلیا اور تیزی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پلٹ آئے۔ وہ جس گروہ اور جس آگ کے قریب سے گزرتے وہ یہی کہتے کہ یہ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ہیں جو آنحضرتؐ کی سواری پر سوار ہیں، کوئی غیر آدمی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس مقام پر آئے جہاں عمر ابنِ خطابؓ تھے۔ جب عمر بن خطابؓ کی نگاہ ابوسفیان پر پڑی تو کہا، خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے تجھ (ابوسفیان) پر مسلّط کیا ہے، اب تیرے لیے کوئی امان نہیں ہے اور فوراً ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر آپ سے ابوسفیان کی گردن اُڑانے کی اجازت مانگی۔

لیکن اتنے میں عباسؓ بھی پہنچ گئے اور کہا : کہ اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے اسے پناہ دے دی ہے۔ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : میں بھی سردست اُسے امان دیتا ہوں۔ کل آپ اسے میرے پاس لے آئیں۔ اگلے دن جب عباسؓ اُسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لائے تو رسول اللہؐ نے اس سے فرمایا :

" اے ابوسفیان ! وائے ہو تجھ پر، کیا وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ تو خدائے یگانہ پر

ایمان لے آئے۔

اُس نے عرض کیا: ہاں! اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، مَیں گواہی دیتا ہوں کہ خدا یگانہ ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اگر بُتوں سے کچھ ہو سکتا تو مَیں یہ دن نہ دیکھتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کیا وہ موقع نہیں آیا کہ تُو جان لے کہ مَیں اللہ کا رسول ہوں۔"

اُس نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ابھی اس بارے میں میرے دل میں کچھ شک و شبہ موجود ہے۔ لیکن آخرکار ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں میں سے دو آدمی مسلمان ہو گئے۔

پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عباسؓ کو فرمایا:

"ابوسفیان کو اس درّہ میں جو مکّہ کی گزرگاہ ہے، لے جاؤ تاکہ خدا کا لشکر وہاں سے گزرے اور یہ دیکھ لے۔"

عباسؓ نے عرض کیا: "ابوسفیان ایک جاہ طلب آدمی ہے، اس کو کوئی امتیازی حیثیت دے دیجئے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ امان میں ہے، جو شخص مسجد الحرام میں پناہ لے لے وُہ امان میں ہے، جو شخص اپنے گھر کے اندر رہے اور دروازہ بند کر لے وہ بھی امان میں ہے۔"

بہرحال جب ابوسفیان نے اس لشکرِ عظیم کو دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ مقابلہ کرنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہی اور اس نے عباس کی طرف رُخ کر کے کہا: آپ کے بھتیجے کی سلطنت بہت بڑی ہو گئی ہے۔ عباس نے کہا: وائے ہو تجھ پر یہ سلطنت نہیں نبوت ہے۔

اس کے بعد عباس نے اس سے کہا کہ اَب تو تیزی کے ساتھ مکّہ والوں کے پاس جا کر انہیں لشکرِ اسلام کا مقابلہ کرنے سے ڈرا۔

ابوسفیان نے مسجد الحرام میں جا کر پکار کر کہا:

"اے جمعیّت قریش! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ تمہاری طرف آیا ہے، تم میں اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا، جو شخص میرے گھر میں داخل ہو جائے وہ امان میں ہے، جو شخص مسجد الحرام میں چلا جائے وہ بھی امان میں ہے اور جو شخص اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے گھر کا دروازہ بند کرے وہ بھی امان میں ہے۔"

اس کے بعد اس نے چیخ کر کہا: اے جمعیّتِ قریش اسلام قبول کر لو تاکہ سالم رہو اور بچ جاؤ، اس کی بیوی ہندہ نے اس کی داڑھی پکڑ لی اور چیخ کر کہا: اس بُڈھے احمق کو قتل کر دو۔

ابوسفیان نے کہا: میری داڑھی چھوڑ دے۔ خدا کی قسم اگر تُو اسلام نہ لائی تو تُو بھی قتل ہو جائے گی، جا کر گھر میں بیٹھ جا۔

اس کے بعد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکرِ اسلام کے ساتھ روانہ ہوئے اور " ذوی طوی " کے مقام تک پہنچ گئے، وہی بلند مقام جہاں سے مکّہ کے مکانات صاف نظر آتے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ دن یاد آگیا جب آپ مجبور ہوکر مخفی طور پر مکّہ سے باہر نکلے تھے۔ لیکن آج دیکھ رہے ہیں کہ اس عظمت کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں، تو آپؐ نے اپنی پیشانی مبارک اُونٹ کے کجاوے کے اُوپر رکھ دی اور سجدہ شکر بجا لائے۔

اس کے بعد پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم " حجون " میں (مکّہ کے بلند مقامات میں سے وہ جگہ جہاں خدیجہؑ کی قبر ہے) اُترے، غسل کرکے اسلحہ اور لباسِ جنگ پہن کر اپنی سواری پر سوار ہوئے، سُورۂ فتح کی قرأت کرتے ہوئے مسجد الحرام میں داخل ہوئے اور آوازِ تکبیر بلند کی۔ لشکرِ اسلام نے بھی نعرۂ تکبیر بلند کیا تو اس سے سارے دشت و کوہ گونج اُٹھے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اُونٹ سے نیچے اُترے اور بُتوں کو توڑنے کے لیے خانہ کعبہ کے قریب آئے۔ آپ یکے بعد دیگرے بُتوں کو سرنگوں کرتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے :

" جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا "

" حق آگیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل ہے ہی مٹنے والا "

کچھ بڑے بڑے بُت کعبہ کے اُوپر نصب تھے، جن تک پیغمبرؐ کا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیرالمومنین علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپؑ کے دوش مبارک پر پاؤں رکھ کر اُوپر چڑھ جائیں اور بتوں کو زمین پر گرا کر توڑ ڈالیں۔ علیؑ نے آپؐ کے حکم کی اطاعت کی۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانہ کعبہ کی کلید لے کر دروازہ کھولا اور انبیاؑ کی ان تصویروں کو جو خانہ کعبہ کے اندر در و دیوار پر بنی ہوئی تھیں، محو کر دیا۔

۳۔ اس سریع اور شاندار کامیابی کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانہ کعبہ کے دروازے کے حلقہ میں ہاتھ ڈالا اور وہاں پر موجود اہلِ مکّہ کی طرف رُخ کرکے فرمایا :

" اَب بتلاؤ تم کیا کہتے ہو ؟ اور تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے بارے میں کیا حکم دوں گا ؟ انہوں نے عرض کیا : ہم آپ سے نیکی اور بھلائی کے سوا اور کوئی توقع نہیں رکھتے ! آپ ہمارے بزرگوار بھائی اور ہمارے بزرگوار بھائی کے فرزند ہیں۔ آج آپ برسرِ اقتدار آگئے ہیں، ہمیں بخش دیجئے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے اور مکّہ کے لوگ بھی بلند آواز کے ساتھ رونے لگے۔

پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

" میں تمہارے بارے میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے کہی تھی کہ آج تمہارے اُوپر کسی قسم کی کوئی سرزنش اور ملامت نہیں ہے، خدا تمہیں بخش دے گا، وہ ارحم الراحمین ہے "[1]

اور اس طرح سے آپؑ نے ان سب کو معاف کر دیا اور فرمایا :

" تم سب آزاد ہو، جہاں چاہو جا سکتے ہو"۔

ضمنی طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا کہ آپ کے لشکری کسی سے نہ اُلجھیں اور بالکل کوئی خُون نہ بہایا جائے۔ ایک روایت کے مطابق صرف چھ افراد کو مستثنیٰ کیا گیا تھا جو بہت ہی بدزبان اور خطرناک لوگ تھے۔

یہاں تک کہ جب آپؐ نے یہ سُنا کہ لشکرِ اسلام کے عَلمدار " سعد بن عبادہ نے انتقام کا نعرہ بلند کیا ہے اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ : الیوم یوم الملحمة" آج انتقام کا دن ہے " تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے فرمایا ——— جلدی سے جاکر اس سے عَلم لے لو اور اُس سے عَلم لے کر یہ نعرہ لگاؤ کر :

الیوم یوم المرحمة" آج عفو و بخشش اور رحمت کا دن ہے"۔

اور اس طرح مکّہ کسی خونریزی کے بغیر فتح ہوگیا، عفو و رحمتِ اسلامی کی اس کشش نے، جس کی انہیں بالکل توقع نہیں تھی، دلوں پر ایسا اثر کیا کہ لوگ گروہ در گروہ آکر مسلمان ہوگئے، اس عظیم فتح کی صدا تمام جزائر عربستان میں جا پہنچی، اسلام کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی اور مسلمانوں اور اسلام کی ہر جہت سے دھاک بیٹھ گئی[1]۔

بعض تاریخوں میں آیا ہے کہ جب پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خانۂ کعبہ کے دروازے کے پاس کھڑے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

" لا الٰہ الّا اللہ وحدہ وحدہ ، انجز وعدہ، و نصر عبدہ، وھزم الاحزاب وحدہ ، الا ان کل مال او مأثرة او دم تدعی فھو تحت قدمی ھاتین :

" خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ یکتا و یگانہ ہے ، یگانہ ، اس نے آخرکار اپنے وعدہ کو پورا کر دیا۔ اور اپنے بندہ کی مدد کی ، اور اس نے خُود اکیلے ہی تمام گروہوں کو شکست دے دی ۔ جان لو کہ ہر مال ، ہر امتیاز ، اور ہر وہ خُون جس کا تعلق ماضی اور زمانۂ جاہلیّت سے ہے ، سب کے سب میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہیں۔ (یعنی اب اس خون کے بارے میں ، جو زمانۂ جاہلیّت میں بہایا گیا تھا ، یا وہ اموال جو لوٹے گئے تھے ، کوئی بات نہ کرنا) اور زمانۂ جاہلیّت کے تمام اعزازات اور امتیازات بھی باطل ہو گئے ہیں اور اس طرح تمام گزشتہ فائلیں بند ہوگئی ہیں۔

یہ ایک بہت ہی اہم اور عجیب قسم کی پیش نہاد تھی جس میں عمومی معافی کے فرمان سے حجاز کے لوگوں کو ان کے تاریک اور پُر ماجرا ماضی سے کاٹ کر رکھ دیا اور انہیں اسلام کے سائے میں ایک نئی زندگی بخشی جو ماضی سے مربوط

---

[1] سُورۂ یوسف آیہ ۹۲

[2] " کامل ابن اثیر" جلد ۲ " تفسیر مجمع البیان" زیرِ بحث آیات کے ذیل میں اور دوسری کتابوں کا خلاصہ ۔

کشمکشوں اور جنجالوں سے مکمل طور پر خالی تھی۔

اس کام نے اسلام کی پیش رفت کے سلسلہ میں حد سے زیادہ مدد کی اور یہ ہمارے آج اور آنے والے کل کے لیے ایک دستور العمل ہے۔

خداوندا! تو اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ اس دیرینہ عظمت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی اقتدا کے سائے میں مسلمانوں کے لیے دوبارہ پلٹا دے۔

پروردگارا! ہمیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے دوستوں کے زمرہ میں قرار دے۔

بارالہا! ہمیں ایسی توفیق مرحمت فرما کہ ہم دنیا میں عدل اسلامی کی حکومت کو اس طرح پھیلائیں کہ ساری دنیا کے لوگ فوج در فوج اسے دل و جان سے قبول کر لیں۔

❁ ❁ ❁

آمین یارب العالمین

سورہ "نصر" کا اختتام

ترجمہ کا اختتام

۶ شوال ۱۴۰۸ھ بروز اتوار

صبح بارہ بج کر چوبیس منٹ

برمکان حقیر قم مقدس ایران

سُورَۃُ اللَّھَب (تبّت)

❖ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
❖ اِس میں ۵ آیات ہیں۔

سُورۂ "لہب" (تبّت) کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سُورہ جو مکّہ میں اور تقریباً پیغمبرِ اسلام کی آشکارا دعوت کے آغاز میں نازل ہوا تھا، وہ واحد سُورہ ہے جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کے دشمنوں میں سے اس زمانہ کے ایک دشمن (یعنی ابولہب) پر نام لے کر سخت حملہ کیا گیا ہے اور اس کا مضمون اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اُسے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خصوصی عداوت تھی اور وہ اور اس کی بیوی کام بگاڑنے اور بدزبانی کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے تھے۔

قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ دونوں جہنمی ہیں اور ان کے لیے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے - یہ معنی صحیح ثابت ہوا اور وہ دونوں کے دونوں انجام کار دنیا سے بے ایمان گئے - یہ قرآن کی ایک کھلی ہوئی پیش گوئی ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"من قرأها رجوت ان لا یجمع اللّٰہ بینہ و بین ابی لھب فی دار واحدۃ"

"جو شخص اس کی تلاوت کرے گا مجھے اُمید ہے کہ خدا اُسے اور ابولہب کو ایک گھر میں اکٹھا نہیں کرے گا (یعنی وہ اہلِ بہشت سے ہوگا، جب کہ ابولہب اہلِ دوزخ سے ہے)"[1]

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ یہ فضیلت اس شخص کے لیے ہے جو اس سُورہ کو پڑھ کر اپنا راستہ ابولہب کے راستہ سے جُدا کرے، نہ کہ وہ لوگ جو زبان سے تو پڑھیں لیکن ابولہب جیسا عمل کریں۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۸

شانِ نزول

"ابن عباس" سے نقل ہوا ہے کہ جس وقت آیہ " و انذر عشیرتك الاقربین " نازل ہوئی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے قریبی رشتہ داروں کو انذار کرنے اور اسلام کی دعوت دینے (اور اپنی دعوت کا اعلان کرنے) پر مامور ہوئے، تو پیغمبر کوہِ صفا پر آئے اور پکار کر کہا " یا صباحاہ " (یہ جملہ عرب اس وقت کہتے تھے جب ان پر دشمن کی طرف سے غفلت کی حالت میں حملہ ہو جاتا تھا تاکہ سب کو باخبر کر دیں اور وہ مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جائیں، لہٰذا کوئی شخص " یاصباحاہ " کہہ کر آواز دیتا تھا! " صباح " کے لفظ کا انتخاب اس وجہ سے کیا جاتا تھا کہ عام طور پر غفلت کی حالت میں حملے صبح کے وقت کیے جاتے تھے)۔

مکّہ کے لوگوں نے جب یہ صدا سُنی تو اُنہوں نے کہا کہ یہ کون ہے جو فریاد کر رہا ہے۔

کہا گیا کہ یہ " محمّد " صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ کچھ لوگ آپ کے پاس پہنچے تو آپؐ نے قبائلِ عرب کو ان کے نام کے ساتھ پکارا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر سب کے سب جمع ہو گئے تو آپؐ نے ان سے فرمایا:

" مجھے بتلاؤ! اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ دشمن کے سوار اس پہاڑ کے پیچھے سے حملہ کرنے والے ہیں، تو کیا تم میری بات کی تصدیق کرو گے۔"

اُنہوں نے جواب دیا: " ہم نے آپ سے کبھی بھی جھوٹ نہیں سُنا"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

" انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید"

" میں تمہیں خدا کے شدید عذاب سے ڈراتا ہوں "

(" میں تمہیں توحید کا اقرار کرنے اور بُتوں کو ترک کرنے کی دعوت دیتا ہوں") جب ابولہب نے یہ بات سُنی تو اس نے کہا: " تبّالك! أما جمعتنا الا لهذا ؟! : " تو ہلاک ہو جائے! کیا تُو نے ہمیں صرف اس بات کے لیے جمع کیا ہے"؟

اِس موقع پر یہ سُورہ نازل ہوا: تبت یدا ابی لهب وتب " اے ابولہب! تُو ہی ہلاک ہو اور تیرے ہاتھ ٹوٹیں، تُو ہی زیاں کار اور ہلاک ہونے والا ہے۔

بعض نے اس موقع پر اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ جب ابولہب کی بیوی " اُم جمیل " نے یہ خبر سنی کہ یہ سُورہ اس کے اور اس کے شوہر کے بارے میں نازل ہوا ہے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی، لیکن وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ دیکھ سکی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پتھر تھا اور وہ کہہ رہی تھی کہ میں نے سُنا ہے " محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری ہجو کی ہے۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے مل گیا تو میں یہ پتھر اس کے منہ پر دے ماروں گی، میں خود بھی شاعر ہوں"! اس کے بعد اصطلاح کے مطابق اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کی مذمّت میں شعر کہے۔[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسلام کے لیے ابولہب اور اس کی بیوی کا خطرہ اور ان کی عداوت اسی تک منحصر نہیں تھی۔ اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے ان پر سخت شدید حملہ کیا ہے اور صراحت کے ساتھ ان کی مذمت کر رہا ہے تو اس کی بہت سی وجوہات ہیں، جن کی طرف انشاء اللہ بعد میں اشارہ ہوگا۔

❖ ❖ ❖

گزشتہ صفحہ کا حاشیہ

لہ "تفسیر قرطبی" جلد ۱۰ ص ۷۳۲۴ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ) اسی مضمون کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں، "ابن اثیر" نے "الکامل جلد ۲ ص ۶۰" میں اور "درالمنثور" و "ابوالفتوح رازی" اور "فخر رازی" اور "فی ظلال القرآن" میں اس سورہ کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ؕ

۲۔ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ؕ

۳۔ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۚ

۴۔ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۚ

۵۔ فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۚ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ ابولہب کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں (اور وُہ ہلاک ہو جائے)۔

۲۔ اس کے مال و دولت نے اور جو کچھ اس نے کمایا ہے اُسے ہرگز کوئی فائدہ نہ دیا۔

۳۔ وُہ جلدی ہی اس آگ میں داخل ہو جائے گا جس کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔

۴۔ اور اسی طرح سے اس کی وُہ بیوی جو ایندھن اُٹھانے والی ہے۔

۵۔ اور اس کی گردن میں خرما کی چھال کی رسّی ہے۔

تفسیر

ابولہب کا ہاتھ کٹ جائے۔

جیسا کہ ہم نے اس سُورہ کے شانِ نزول میں بیان کیا ہے یہ سُورہ حقیقت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا، عبدالمطلب کے بیٹے" ابولہب کی بُری باتوں کا جواب ہے جو اسلام کے سخت دُشمنوں میں سے تھا اور جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آشکار اور عمومی دعوت اور عذابِ الٰہی کے بارے میں آپ کے انذار کو سُن کر یہ کہا تھا کہ :

" تُو ہلاک ہو جائے، کیا تُو نے ہمیں انہی باتوں کے لیے پُکارا تھا" ؟

قرآن مجید اس بدزبان شخص کے جواب میں فرماتا ہے :

" ابولہب کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں ، یا وہ ہلاک ہو جائے اور خسارہ اُٹھائے"۔

(تبت یدا ابی لھب وتب)۔

" تب " و " تباب " (بروزنِ عذاب) " مفردات " میں " راغب " کے قول کے مطابق دائمی خسارے کے معنی میں ہے۔ لیکن طبرسی نے " مجمع البیان " میں یہ کہا ہے کہ یہ اس نقصان کے معنی میں ہے جو ہلاکت پر منتہی ہو۔

بعض ارباب لُغت نے اس کی " قطع کرنے " کے معنی میں بھی تفسیر کی ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہلاکت پر منتہی ہونے والا دائمی نقصان طبعاً قطع ہونے اور کٹ جانے کا سبب بنتا ہے۔ ان معانی کے مجموعہ سے وہی بات معلوم ہوتی ہے جو ہم نے آیہ کے معنی میں بیان کی ہے۔

البتہ یہ ہلاکت اور نقصان ممکن ہے دنیوی پہلو رکھتا ہو یا معنوی و اُخروی یا دونوں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید نے اپنی روش اور سیرت کے برخلاف ایک شخص کا نام کیسے لے لیا اور اس شدت کے ساتھ اس پر حملہ کیوں کیا ہے ؟

لیکن ابولہب کی حیثیت معلوم ہونے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

اس کا نام " عبدالعزیٰ " (عزیٰ بت کا بندہ) اور اس کی کنیت " ابولہب " تھی - اس کے لیے اس کنیت کا انتخاب شاید اس وجہ سے تھا کہ اس کا چہرہ سُرخ اور بھڑکتا ہوا تھا، چونکہ لغت میں لہب آگ کے شعلہ کے معنی میں ہے۔

وہ اور اس کی بیوی " اُم جمیل " جو ابوسفیان کی بہن تھی ، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نہایت بدزبان اور سخت ترین دشمنوں میں سے تھے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ " طارق محاربی " نامی ایک شخص کہتا ہے : میں " ذی المجاز " کے بازار میں تھا۔ (ذی المجاز عرفات کے نزدیک مکہ سے تھوڑے سے فاصلہ پر ہے) اچانک میں نے ایک جوان کو دیکھا جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا : اے لوگو ! لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لو تو نجات پا جاؤ گے - اور اس کے پیچھے پیچھے میں نے ایک شخص کو دیکھا

جو اس کے پاؤں کے پچھلے حصہ پر پتھر مارتا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے پاؤں سے خون جاری تھا اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا " اے لوگو! یہ جھوٹا ہے، اس کی بات نہ ماننا"!

میں نے پوچھا کہ یہ جوان کون ہے؟ تو لوگوں نے بتایا: " یہ محمد" صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس کا گمان یہ ہے کہ وہ پیغمبر ہے اور یہ بوڑھا اس کا چچا ابولہب ہے جو اس کو جھوٹا سمجھتا ہے۔[1]

ایک اور دوسری روایت میں آیا ہے کہ " ربیع بن عباد" کہتا ہے: میں اپنے باپ کے ساتھ تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ وہ قبائل عرب کے پاس جاتے اور ہر ایک کو پکار کر کہتے: میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تم خدائے یگانہ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

جب وہ اپنی بات سے فارغ ہو جاتا تو ایک خوبرو بھینگا آدمی جو ان کے پیچھے پیچھے تھا، پکار کر کہتا: "اے فلاں قبیلے یہ شخص یہ چاہتا ہے کہ تم لات و عزیٰ بت اور اپنے ہم پیمان جنوں کو چھوڑ دو اور اس کی بدعت و ضلالت کی پیروی کرنے لگ جاؤ۔ اس کی بات نہ سننا، اور اس کی پیروی نہ کرنا"!

میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ اس کا چچا ابولہب ہے۔[2]

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جب مکہ سے باہر کے لوگوں کا کوئی گروہ اس شہر میں داخل ہوتا تھا تو وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی رشتہ داری اور سن و سال کے لحاظ سے بڑا ہونے کی بنا پر ابولہب کے پاس جاتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تحقیق کرتا تھا۔ وہ جواب دیتا: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک جادوگر ہے۔ وہ بھی پیغمبرؐ سے ملاقات کیے بغیر ہی لوٹ جاتے۔ اسی اثنا میں ایک ایسا گروہ آیا جنہوں نے یہ کہا کہ ہم تو اسے دیکھے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ ابولہب نے کہا: " ہم مسلسل اس کے جنون کا علاج کر رہے ہیں! وہ ہلاک ہو جائے!"[3]

ان روایات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اکثر مواقع پر سایہ کی طرح پیغمبرؐ کے پیچھے لگا رہتا تھا اور کسی خرابی سے فروگزاشت نہ کرتا تھا۔ خصوصاً اس کی زبان بہت ہی گندی اور آلودہ ہوتی تھی اور وہ رکیک اور چبھنے والی باتیں کیا کرتا تھا۔ اور شاید اسی وجہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب دشمنوں کا سرغنہ شمار ہوتا تھا۔ اسی بنا پر زیر بحث آیات اس پلید اور اس کی بیوی ام جمیل پر ایسی صراحت اور سختی کے ساتھ تنقید کر رہی ہیں۔

وہی ایک اکیلا ایسا شخص تھا جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بنی ہاشم کی حمایت کے عہد و پیمان پر دستخط نہیں کیے تھے اور اس نے آپ کے دشمنوں کی صف میں رہتے ہوئے دشمنوں کے عہد و پیمان میں شرکت کی تھی۔ ان حقائق کی طرف توجہ کرنے سے اس سورہ کی استثنائی کیفیت کی دلیل واضح ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: اس کے مال و ثروت نے اور جو کچھ اس نے کمایا ہے اس نے اسے ہرگز کوئی فائدہ

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۵۹

[2] "فی ظلال القرآن" جلد ۸ ص ۶۹۷

[3] "تفسیر القرآن" جلد ۳۰ ص ۵۰۳

نہیں دیا اور وہ اسے عذابِ الٰہی سے نہیں بچائے گا: (ما اغنیٰ عنہ مالہ وما کسب)۔[1]

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دولت مند مغرور شخص تھا جو اپنی اسلام دشمن کوششوں کے لیے اپنے مال و دولت پر بھروسہ کرتا تھا۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "وہ جلدی ہی اس آگ میں داخل ہوگا جس کے شعلے بھڑکنے والے ہیں": (سیصلیٰ نارًا ذات لھب)۔

اگر اس کا نام "ابولہب" تھا تو اس کے عذاب کی آگ بھی "ابولہب" ہے اور وہ بہت ہی عظیم شعلے رکھتی ہے۔ (اس بات پر توجہ رہے کہ "لہب" یہاں نکرہ کی صورت میں آیا ہے اور یہ اس شعلہ کی عظمت کی دلیل ہے)۔

نہ صرف ابولہب کو بلکہ کسی بھی کافر اور بدکار کو اس کا مال و ثروت اور اس کی اجتماعی و معاشرتی حیثیت جہنم کی آگ اور خدا کے عذاب سے رہائی نہیں بخشیں گے۔ جیسا کہ سورہ شعراء کی آیہ ۸۸ و ۸۹ میں آیا ہے: یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم: قیامت ایک ایسا دن ہے جس میں انسان کو نہ تو اس کا مال ہی کوئی فائدہ دے گا اور نہ ہی اس کی اولاد، سوائے اس شخص کے جو قلبِ سلیم (یعنی ایمان و تقویٰ کی روح کے ساتھ) پروردگار کے دربار میں حاضر ہو۔

مسلّم طور پر آیہ "سیصلیٰ نارًا ذات لھب" سے مراد جہنم کی آگ ہے، لیکن بعض نے احتمال دیا ہے کہ اس میں دنیا کی آگ بھی شامل ہے۔

روایات میں آیا ہے کہ جنگِ "بدر" اور سخت شکست کے بعد جو مشرکینِ قریش کو اٹھانی پڑی تھی، ابولہب نے جو خود میدانِ جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا ــــ ابوسفیان کے واپس آنے پر اس سے ماجرے کے بارے میں سوال کیا:

ابوسفیان نے قریش کے لشکر کی شکست اور سرکوبی کی کیفیت اس سے بیان کی۔ اس کے بعد اس نے مزید کہا: خدا کی قسم ہم نے اس جنگ میں آسمان و زمین کے درمیان ایسے سوار دیکھے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کے لیے آئے تھے۔

اس موقع پر "عباس" کے ایک غلام "ابورافع" نے کہا: میں وہاں بیٹھا ہوا تھا، میں نے اپنے ہاتھ بلند کیے اور کہا کہ وہ آسمانی فرشتے تھے۔

اس سے ابولہب بھڑک اٹھا اور اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر دے مارا، مجھے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے مجھے پیٹے چلے جا رہا تھا۔ وہاں عباس کی بیوی "ام الفضل" بھی موجود تھی۔ اس نے ایک چھڑی اٹھائی اور ابولہب کے سر پر دے ماری اور کہا: "کیا تُو نے اس کمزور آدمی کو اکیلا سمجھا ہے؟"

ابولہب کا سر پھٹ گیا اور اس سے خون بہنے لگا۔ سات دن کے بعد اس کے بدن میں بدبو پیدا ہوگئی، اس کی جلد میں طاعون کی شکل کے دانے نکل آئے اور وہ اسی بیماری سے واصلِ جہنم ہوگیا۔

اس کے بدن سے اتنی بدبو آرہی تھی کہ لوگ اس کے نزدیک جانے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ وہ اسے مکہ سے باہر

---

[1] "ماکسب" میں "ما" ممکن ہے "موصولہ" یا "مصدریہ" ہو، بعض اس کے لیے ایک وسیع معنی کے قائل ہیں جو نہ صرف اس کے اموال بلکہ اس کی اولاد کو بھی شامل ہے اور "ما اغنیٰ عنہ" میں "ما" مسلّم طور پر "ما نافیہ" ہے۔

لے گئے اور دُور سے اس پر پانی ڈالا اور اس کے بعد اس کے اُوپر پتھر پھینکے۔ یہاں تک کہ اس کا بدن پتھروں اور مٹی کے نیچے چھُپ گیا۔[1]

بعد والی آیت میں اس کی بیوی "اُم جمیل" کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس کی بیوی بھی جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگی، جو اپنے دوش پر ایندھن اُٹھاتی ہے"۔ (وامرأته حمالة الحطب)[2]

"اور اس کی گردن میں خرما کی چھال کی رسّی یا گردن بند ہے"۔ (فی جیدها حبل من مسد)۔

کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ابولہب کی بیوی۔ جو "ابوسفیان" کی بہن اور معاویہ کی پھوپھی تھی۔ اسلام کے برخلاف اپنے شوہر کی عداوتوں اور خرابیوں میں برابر کی شریک تھی لیکن اس بارے میں کہ قرآن نے اس کی حمالة الحطب (دوش پر ایندھن اُٹھانے والی عورت) کے ساتھ توصیف کیوں کی ہے، مفسرین نے متعدد تفسیریں بیان کی ہیں:

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ اس بنا پر ہے کہ وہ کانٹے دار جھاڑیاں کندھے پر اُٹھا کر لاتی تھی اور پیغمبرؐ کے راستہ میں ڈال دیا کرتی تھی تاکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاؤں میں چُبھ جائیں۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ تعبیر اس کی سخن چینی اور چغل خوری کے بارے میں آئی ہے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

میان دوکس جنگ چوں آتش است
سُخن چین بدبخت ہیزم کش است

دو آدمیوں کے درمیان جنگ آگ کے مانند ہے اور بدبخت چُغل خور ایندھن اُٹھانے والا ہے۔

بعض اسے اس کے شدّتِ بُخل سے کنایہ سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ اتنی دولت مند ہونے کے باوجود کسی ضرورت مند کی مدد کے لیے تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ اسی لیے اسے "ہیزم کش" ایندھن اُٹھانے والے فقیر سے تشبیہ دی گئی ہے۔

بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ قیامت میں بہت سے گروہوں کے گناہوں کو اپنے کندھے پر اُٹھائے ہوئے ہوگی۔

ان معانی میں سے پہلا معنی سب سے زیادہ مناسب ہے، اگرچہ ان کے درمیان جمع بھی بعید نہیں ہے۔

"جید" (بروزن دید) "گردن" کے معنی میں ہے اور اس کی جمع "اجیاد" ہے۔ بعض ارباب لغت کا نظریہ یہ ہے کہ "جید" و "عنق" اور "رقبہ" تینوں کے ایک ہی معنی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ "جید" سینے کے اُوپر والے حصّہ کو کہا جاتا ہے، "عنق" گردن کی پُشت یا ساری گردن کو اور "رقبہ" مطلقاً گردن کو کہا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات ایک انسان کو بھی "رقبہ" کہتے ہیں۔ مثلاً: "فک رقبة" یعنی انسان کو آزاد کرنا۔[3]

---

[1] "بحارالانوار" جلد ۱۹ ص ۲۲۷

[2] "امرأته" "سیصلی" میں پوشیدہ ضمیر پر عطف ہے اور حمالة الحطب" حال ہے اور منصوب ہے، اور بعض نے مثل "زمخشری" کے "کشاف" میں اسے "ذم" کے عنوان سے منصوب جانا ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے اذا حمالة الحطب لیکن مسلّم طور پر پہلا معنی بہتر ہے۔

[3] "التحقیق فی کلمات القرآن الکریم" جلد ۲ ص ۱۵۸

"مسد" (بروزن حسد) اس رسّی کے معنی میں ہے جو کھجور کے پتوں سے بنائی جاتی ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ "مسد" وہ رسّی ہے جو جہنم میں اس کی گردن میں ڈالیں گے جس میں کھجور کے پتوں جیسی سختی ہوگی اور اس میں آگ کی حرارت اور لوہے کی سنگینی ہوگی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ چونکہ بڑے لوگوں کی عورتیں اپنی شخصیت کو آلات و زیورات خصوصاً گردن کے قیمتی زیورات سے زینت دینے میں خاص بات سمجھتی ہیں، لہٰذا خدا قیامت میں اس مغرور و خود پسند عورت کی تحقیر کے لیے لیف خرما کا ایک گردن بند اس کی گردن میں ڈال دے گا۔ یا یہ اصلاً اس کی تحقیر سے کنایہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس تعبیر کے بیان کرنے کا سبب یہ ہے کہ "اُم جمیل" کے پاس جواہرات کا ایک بہت ہی قیمتی گردن بند تھا اور اس نے یہ قسم کھائی تھی کہ وہ اسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی میں خرچ کرے گی، لہٰذا اس کے اس کام کے بدلے میں خدا نے بھی اس کے لیے ایسا عذاب مقرر کر دیا ہے۔

چند نکات

۱۔ قرآن کے اعجاز کی ایک اور نشانی

ہم جانتے ہیں کہ یہ آیات مکّہ میں نازل ہوئیں اور قرآن کریم نے دو ٹوک طریقہ سے یہ خبر دی تھی کہ ابولہب اور اس کی بیوی جہنم کی آگ میں ہوں گے، یعنی وہ ہرگز بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ انجام کار ایسا ہی ہوا، بہت سے مشرکین مکّہ تو واقعی طور پر ایمان لے آئے اور بعض ظاہری طور پر مسلمان ہوگئے، لیکن وہ افراد جو نہ تو واقع میں ایمان لائے اور نہ ہی ظاہر بظاہر، وہ یہ دونوں تھے۔ یہ قرآن مجید کے غیبی اخبار میں سے ایک ہے اور قرآن نے دوسری آیات میں بھی اس قسم کی خبریں دی ہیں جن میں قرآن کی غیبی خبروں کے عنوان کے تحت اعجازِ قرآن کی ایک فصل کو مخصوص کیا گیا ہے اور ہم نے ان آیات میں سے ہر ایک کے ذیل میں مناسب بحث کی ہے۔

۲۔ ایک اور سوال کا جواب

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی ان پیشین گوئیوں کی موجودگی میں ممکن نہیں تھا کہ ابولہب اور اس کی بیوی ایمان لے آتے، ورنہ یہ خبر جھوٹی اور دروغ ہو جاتی۔

یہ سوال اسی معروف سوال کے مانند ہے جو "علمِ خدا" کے مسئلہ کے بارے میں جبر کی بحث میں پیش ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ خدا جو ازل سے ہر چیز کا عالم تھا، وہ گنہگاروں کے گناہ اور اطاعت گزاروں کی اطاعت کو جانتا تھا۔ اس بنا پر اگر گنہگار گناہ نہ کرتے تو خدا کا علم جہالت میں بدل جائے۔

علماء اور فلاسفۂ اسلام قدیم سے اس سوال کا جواب دے چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا جانتا ہے کہ ہر شخص اپنے

اختیار و آزادی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کون کون سے کام انجام دے گا، مثلاً زیر بحث آیات میں خدا ابتدا سے جانتا تھا کہ ابولہب اور اس کی بیوی اپنی خواہش و رغبت اور ارادہ و اختیار سے ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، جبری اور لازمی طور پر نہیں دوسرے الفاظ میں ارادہ و اختیار کی آزادی کا عنصر بھی خدا کو معلوم تھا - وہ جانتا تھا کہ بندے صفت اختیار کے ساتھ اور اپنے ارادہ سے کون سے عمل انجام دیں گے۔

مسلّمہ طور پر ایسا علم اور مستقبل کے بارے میں اس قسم کی خبر دینا، مسئلہ اختیار کی تاکید ہے، جبر اور مجبوری کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ (غور کیجئے)

۳۔ بے بصیرت رشتہ دار ہمیشہ دُور ہوتے ہیں۔

یہ سُورہ ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کی تاکید کر رہا ہے کہ ایسی رشتہ داری جس میں ایمان اور عقیدہ کا رشتہ نہ ہو اس کی کوئی حیثیت اور قدر و قیمت نہیں ہوتی، اور مردانِ خدا منحرف، جبار اور سرکش لوگوں کے مقابلہ میں کسی قسم کا میلان نہیں رکھتے تھے چاہے وہ ان کے کتنے ہی قریبی رشتہ دار ہوں۔

باوجود اس کے کہ ابولہب پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چچا تھا اور آپ کے قریب ترین رشتہ داروں میں شمار ہوتا تھا، جب اُس نے اپنا اعتقادی اور عملی راستہ آپ سے جُدا کر لیا تو اس کی بھی دوسرے منحرف اور گمراہ لوگوں کی طرح سخت ملامت اور سرزنش کی گئی۔ اس کے برعکس ایسے دُور دراز کے لوگ بھی تھے جو نہ صرف پیغمبر کے رشتہ داروں میں شمار نہ ہوتے تھے، بلکہ آپ کے خاندان اور اہلِ زبان سے بھی نہیں تھے، لیکن وہ فکری، اعتقادی اور عملی رشتہ کی بنا پر اس قدر نزدیک ہو گئے کہ مشہور حدیث سلمان منا اھل البیت (سلمان ہم اہلِ بیت میں سے ہیں) کے مطابق گویا خاندانِ رسالت کا جزء ہو گئے۔[1]

یہ ٹھیک ہے کہ اس سُورہ کی آیات صرف ابولہب اور اس کی بیوی کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ صرف ان کے صفات کی وجہ سے اُن کی ایسی مذمت کی گئی ہے۔ اس بنا پر جو شخص یا جو گروہ اُنہیں اوصاف کا حامل ہو گا اس کی سرنوشت بھی اُنہیں جیسی ہو گی۔

خداوندا! ہمارے دل کو ہر قسم کی ہٹ دھرمی اور عناد سے پاک کر دے۔

پروردگارا! ہم سب اپنے انجام اور عاقبت کار سے ڈرتے ہیں، ہمیں امن و سکون اور آرام بخش دے واجعل عاقبۃ امرنا خیرًا۔ (ہماری عاقبت بخیر کر)

بارالٰہا! ہم جانتے ہیں کہ اس عظیم عدالت میں نہ تو مال و دولت کام آتے ہیں اور نہ ہی کوئی رشتہ داری فائدہ دیتی ہے، صرف تیرا لطف و کرم ہی کام آتا ہے، لہٰذا ہم پر اپنا لطف و کرم کر۔

آمین یا ربّ العالمین

سُورۂ لہب کا اختتام

---

[1] ہم نے اس سلسلہ میں جلد ۹ ص ۱۲۰ پر سُورۂ ھود کی آیہ ۴۶ کے ذیل میں نوح کے بیٹے کے حال کی مناسبت سے، زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

سُورۂ اخلاص

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا۔

❖ اس میں ۴ آیات ہیں۔

سُورۂ "اخلاص" کے مطالب اور اس کی فضیلت

یہ سُورہ ـــــ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے (سورۂ اخلاص اور سُورۂ توحید) پروردگار کی توحید اور اس کی یگانگت اور یکتائی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور چار مختصر سی آیات میں خدا کی وحدانیت کی اس طرح سے توصیف و تعریف کی ہے جس میں اضافہ کی ضرورت نہیں ہے ۔

اس سورہ کی شانِ نزول کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السّلام سے اس طرح نقل ہوا ہے :

" یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ تقاضا کیا کہ آپ ان کے لیے خدا کی توصیف بیان کریں۔ پیغمبرؐ تین دن تک خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ سورہ نازل ہوا اور ان کو جواب دیا۔"

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ سوال کرنے والا " عبداللہ بن صوریا " تھا ۔ جو یہودیوں کے مشہور سرداروں میں سے ایک تھا۔ اور دوسری روایت میں یہ آیا ہے کہ اس قسم کا سوال " عبداللہ بن سلام " نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مکّہ میں کیا تھا اور اس کے بعد وہ ایمان لے آیا تھا ۔ لیکن اپنے ایمان کو اسی طرح سے چھپائے ہوئے تھا۔

دُوسری روایات میں یہ آیا ہے کہ اس قسم کا سوال مشرکین مکّہ نے کیا تھا [1]

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ سوال کرنے والا نجران کے عیسائیوں کا ایک گروہ تھا۔

ان روایات کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے ، کیونکہ ممکن ہے کہ یہ سوال اُن سب کی طرف سے ہوا ہو۔ اور یہی بات اس سُورہ کی حد سے زیادہ عظمت و بزرگی کی ایک دلیل ہے جو مختلف افراد و اقوام کے سوالات کا جواب دیتا ہے۔

---

[1] المیزان جلد ۱۰ ص ۵۴۶

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں مشہور اسلامی منابع میں بہت سی روایات آئی ہیں، جو اس سورہ کی حد سے زیادہ عظمت کی ترجمان ہیں۔ منجملہ۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

" ایعجز احدکم ان یقرأ ثلث القرآن فی لیلۃ "

"کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات سے عاجز ہے کہ ایک ہی رات میں ایک تہائی قرآن پڑھ لے۔"

حاضرین میں سے ایک نے عرض کیا، اے رسولِ خدا، ایسا کرنے کی کس میں طاقت ہے ؟

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

" اقرءوا قل ھو اللہ احد "

" سورہ قل ھو اللہ پڑھا کرو "

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے " سعد بن معاذ" کے جنازے پر نماز پڑھی تو آپ نے فرمایا :

" ستر ہزار فرشتوں نے، جن میں جبرئیلؑ بھی تھے، اس کے جنازے پر نماز پڑھی ہے۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا ہے کہ وہ کس عمل کی بنا پر تمہارے نماز پڑھنے کا مستحق ہوا ہے ؟

جبرئیل نے کہا : " اٹھتے بیٹھتے، پیدل چلتے اور سوار ہوتے اور چلتے پھرتے " قل ھو اللہ احد" پڑھنے کی وجہ سے "[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

" جس شخص پر ایک رات اور دن گزر جائے، اور وہ پنجگانہ نمازیں پڑھے اور ان میں قل ھو اللہ احد کی قرات نہ کرے تو اس سے کہا جائے گا : یا عبداللہ! لست من المصلین "! :

" اے بندۂ خدا تو نماز گزاروں میں سے نہیں ہے "[2]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

" جو شخص خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ ہر نماز کے بعد قل ھو اللہ احد کے پڑھنے کو ترک نہ کرے کیونکہ جو شخص اسے پڑھے گا خدا اس کے لیے

---

[1] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۶۱

[2] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۵۶۱ اور تفسیر و حدیث کی دوسری کتابیں۔

خیر دنیا و آخرت جمع کر دے گا۔ اور خود اُسے اور اس کے ماں باپ اور اس کی اولاد کو بخش دے گا۔ [1]

ایک اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں داخل ہوتے وقت اس سُورہ کا پڑھنا، رزق کو بڑھاتا ہے اور فقر و فاقہ کو دُور کر دیتا ہے۔ [2]

اس سُورہ کی فضیلت میں اتنی زیادہ روایات ہیں کہ وہ اس مختصر بیان میں نہیں سما سکتیں اور ہم نے جو کچھ نقل کیا ہے وہ صرف ان کا ایک حصّہ ہے۔

اس بارے میں کہ سُورہ " قل ھواللہ " قرآن کی ایک تہائی کے برابر کیسے ہوگیا؟ تو بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ اس بنا پر ہے کہ قرآن " احکام " و " عقائد " اور " تاریخ " پر مشتمل ہے اور یہ سُورہ عقائد کے حصّہ کو اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

بعض دوسرے مفسّرین نے یہ کہا ہے کہ قرآن کے تین حصّے ہیں " مبدأ " و " معاد " اور " جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے " اور یہ سُورہ پہلے حصّہ کی تشریح کرتا ہے۔

یہ بات قابلِ قبول ہے کہ قرآن کی تقریباً ایک تہائی توحید کے بارے میں بحث کرتی ہے، اور اس کا خلاصہ سُورۂ توحید میں آیا ہے۔

ہم اس گفتگو کو اس سُورہ کی عظمت کے بارے میں ایک دوسری حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔

امام علی بن الحسین علیہ السّلام سے لوگوں نے سُورۂ توحید کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

" ان اللہ عز وجل علم انہ یکون فی آخر الزمان اقوام متعمقون۔
فانزل اللہ تعالیٰ قل ھواللہ احد، والآیات من سورۃ الحدید الی قولہ:
" وھو علیم بذات الصدور " فمن رام وراء ذالک فقد ھلک "

" خداوند تعالیٰ جانتا تھا کہ آخری زمانہ میں ایسی قومیں آئیں گی جو مسائل میں تعمق اور غور و خوض کرنے والی ہوں گی، لہٰذا اس نے (مباحث توحید اور خدا شناسی کے سلسلہ میں) سُورہ قل ھواللہ احد اور سُورۂ حدید کی ابتدائی آیات، علیم بذات الصدور تک نازل فرمائیں۔ جو شخص اس سے زیادہ کا طلب گار ہوگا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ [3]

❖ ❖ ❖

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۶۱ اور تفسیر و حدیث کی دوسری کتابیں۔

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۶۱ اور تفسیر و حدیث کی دوسری کتابیں۔

[3] "اصول کافی" جلد ۱ باب النسبۃ حدیث ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ

۲۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ

۳۔ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ

۴۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ کہہ دیجئے خُدا یکتا و یگانہ ہے۔

۲۔ خُدا ہی ہے کہ جس کی طرف تمام حاجت مند رُخ کرتے ہیں

۳۔ نہ تو اُس نے کسی کو جنا ہے اور نہ ہی وُہ کسی سے پیدا ہُوا ہے۔

۴۔ اور ہرگز اس کا کوئی ہم پلہ اور مانند نہیں ہے۔

تفسیر ۹

وُہ یکتا اور بے مثال ہے

اِس سُورہ کی پہلی آیت بار بار کے ان سوالات کے جواب میں ہے جو مختلف اقوام یا افراد کی طرف سے پروردگار کے اوصاف کے سلسلہ میں ہوئے تھے، فرماتا ہے: "کہہ دیجئے وُہ یکتا و یگانہ ہے" (قل ھو اللہ احد) [1]

([1] حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جملہ کا " ھو " کی ضمیر کے ساتھ آغاز ، جو واحد غائب کی ضمیر ہے اور ایک مبہم مفہوم کو بیان کرتی ہے ۔ حقیقت میں اس واقعیت کی ایک رمز اور اشارہ ہے کہ اس کی ذاتِ اقدس انتہائی خفا میں ہے اور انسانوں کے محدود افکار کی دسترس سے باہر ہے اگرچہ اس کے آثار نے جہان کو اس طرح سے پُر کر رکھا ہے کہ وہ ہر چیز سے زیادہ ظاہر اور زیادہ آشکار ہے ۔ جیسا کہ سُورہ حٰم سجدہ کی آیہ ۵۳ میں آیا ہے :

"سنریھم ایاتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتّٰی یتبین لھم انہ الحق "

"ہم جلدی ہی اطراف جہان اور ان کے نفسوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے "

اس کے بعد اس ناشناختہ حقیقت سے پردہ اُٹھائے ہوئے کہتا ہے " وہ یکتا و یگانہ خدا ہے "

ضمنی طور پر یہاں " قل " (کہہ دے) کا معنی یہ ہے کہ اس حقیقت کا اظہار کرو ۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے اِس بات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ کفار دست بہ اسم اشارہ کے ساتھ اپنے بتوں کی طرف اشارہ کرتے تھے اور کہتے تھے :

"اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! یہ ہمارے خدا ہیں ، تو بھی اپنے خدا کی تعریف و توصیف کر تاکہ ہم اُسے دیکھیں اور اس کا ادراک کریں ۔ تو خدا نے یہ آیات نازل کیں ، قل ھو اللہ احد ..... " ھا " " ھو " ہیں ، مطلب کو ثابت کرنے اور توجہ دینے کے لیے ہے اور " داد " ضمیر غائب ہے ، جو اس ذات کی طرف اشارہ ہے جو آنکھوں کے دیکھنے سے غائب اور حواس کے لمس سے دُور ہے "[1]

ایک اور حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

" جنگِ بدر کی رات میں نے " خضر " علیہ السلام کو خواب میں دیکھا اور ان سے کہا کہ مجھے کوئی ایسی چیز بتائیں جس کی مدد سے میں دشمنوں پر کامیاب ہوں تو انہوں نے کہا : کہیئے :

یاھو ۔ یا من لا ھو الّا ھو "

پچھلے صفحہ کا حاشیہ [1] بعض نے ھو کو یہاں " ضمیر شان " لیا ہے " اس بنا پر معنی یہ ہوگا کہ شان و مطلب یہ ہے کہ خدا ایک اکیلا ہے ۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ " ھو " اس خدا کی پاک ذات کی طرف اشارہ ہو جو سوال کرنے والوں کے لیے غیر معلوم اور مبہم تھی ۔ اس بنا پر " ھو " مبتدا ہے اور " اللہ " اس کی خبر اور " احد " خبر کے بعد کی خبر ہے ۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] " بحارالانوار " جلد ۳ ص ۲۲۱ حدیث ۱۲ (تلخیص کے ساتھ)

جب صبح ہوئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا :

" یا علی ! علمت الاسم الاعظم "

" اے علی آپ کو اسم اعظم کی تعلیم دی گئی ہے "

اس کے بعد جنگِ بدر میں یہی جملہ میرا وردِ زبان رہا ۔ ۔ ۔ [1]

" عمار یاسر " نے جب یہ سُنا کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام صفین کے دن جنگ کے وقت یہی ذکر پڑھ رہے تھے تو عرض کیا : یہ کیا کنایات ہیں ؟ تو آپ نے فرمایا : یہ خدا کا اسم اعظم اور توحید کا ستون ہے [2]

" اللہ " خدا کا اسم خاص ہے اور امام کی بات کا مفہوم یہ ہے کہ اسی ایک لفظ کے ذریعے اس کے تمام صفاتِ جلال و جمال کی طرف اشارہ ہوا ہے ، اور اسی بناء پر اس کو اسم اعظم الٰہی کا نام دیا گیا ہے ۔

اس نام کا خُدا کے سوا اور کسی پر اطلاق نہیں ہوتا جب کہ خدا کے دوسرے نام عام طور پر اس کی کسی صفتِ جمال و جلال کی طرف اشارہ ہوتے ہیں ، مثلاً : عالم و خالق و رازق ، اور عام طور پر اس کے غیر پر بھی اطلاق ہوتے ہیں ۔ (مثلاً رحیم ، کریم ، عالم ، قادر وغیرہ)

اس حال میں اس کی اصل اور ریشہ وصفی معنی رکھتا ہے اور اصل میں یہ " وله " سے مشتق ہے ، جو " تحیر " کے معنی میں ہے کیونکہ اس کی ذاتِ پاک میں عقلیں حیران ہیں ، جیسا کہ ایک حدیث میں امیر المومنین علیؑ سے آیا ہے :

" اللہ معناہ المعبود الذی یأله فیه الخلق و یُؤله الیه ، واللہ هو المستور عن درك الابصار ، المحجوب عن الاوهام والخطرات "

" اللہ کا معنی ایک ایسا معبود ہے جس میں مخلوق حیران ہے اور اس سے عشق رکھتی ہے اللہ وہی ذات ہے جو آنکھوں کے ادراک سے مستور اور مخلوق کے افکار و عقول سے محجوب ہے [3]

بعض اوقات اسے " الاهة " (بروزن و بمعنی عبادت) کی اصل اور ریشہ سے بھی سمجھا گیا ہے اور اصل میں " الاله " ہے ، جو " تنہا معبودِ حقیقی " کے معنی میں ہے ۔

لیکن ۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ۔ اس کا ریشہ اور اصل چاہے جو بھی ہو ، بعد میں اس نے اسم خاص کی صُورت اختیار کر لی ہے اور یہ اسی جامع جمیع صفاتِ کمالیہ اور ہر قسم کے عیب و نقص سے خالی ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔

---

[1] [2] [3] "بحار الانوار" جلد ۳ ، ص ۲۲

اِس مقدّس نام کا قرآن مجید میں تقریباً " ایک ہزار " مرتبہ تکرار ہوا ہے اور خدا کے اسماء مقدسہ میں سے کوئی سا نام بھی اتنی مرتبہ قرآن میں نہیں آیا۔ یہ ایک ایسا نام ہے جو دل کو روشن کرتا ہے ☆ انسان کو قوت و توانائی اور سکون و آرام بخشتا ہے، اور اُسے نور و صفا کے ایک عالم میں غرق کر دیتا ہے۔

لیکن " احد " کا لفظ " وحدت " کے مادّہ سے ہی ہے اور اسی لیے بعض نے " احد " اور " واحد " کی ایک ہی معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ دونوں ہی اس ذات کی طرف اشارہ ہیں جو ہر لحاظ سے بے مثل و بے نظیر ہے۔ علم میں یگانہ ہے، قدرت میں بے مثل ہے، رحمانیت و رحیمیت میں یکتا ہے اور خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے بے نظیر ہے۔

لیکن بعض کا نظریہ یہ ہے کہ " احد " اور " واحد " میں فرق ہے۔ " احد " اس ذات کو کہا جاتا ہے جو کثرت کو قبول نہیں کرتا، نہ تو خارج میں اور نہ ہی ذہن میں۔ لہٰذا وہ شمار کرنے کے قابل نہیں ہے اور ہرگز عدد میں داخل نہیں ہوتا، " واحد " کے برخلاف کہ اُس کے لیے دوسرے اور تیسرے کا تصوّر ہوتا ہے، چاہے وہ خارج میں ہو یا ذہن میں۔ اسی لیے بعض اوقات ہم یہ کہتے ہیں کہ : احدی ازاں جمعیت نیامد، یعنی اُن میں سے کوئی شخص بھی نہیں آیا۔ لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ : واحدی نیامد (ایک نہیں آیا) تو ممکن ہے کہ دو یا چند افراد آئے ہوں[1]

لیکن یہ فرق قرآن مجید اور احادیث کے مواردِ استعمال کے ساتھ چنداں سازگار نہیں ہے۔

بعض کا یہ بھی نظریہ ہے کہ : احد (جنس و فصل اور ماہیّت و وجود) کے اجزائے ترکیبیہ خارجیہ یا عقلیہ کے مقابلہ میں خدا کی بساطتِ ذات کی طرف اشارہ ہے جب کہ واحد خارجی کثرتوں کے مقابلہ میں اس کی ذات کی یگانگت کی طرف اشارہ ہے۔

ایک حدیث میں امام محمّد باقر علیہ السّلام سے آیا ہے کہ " احد " فردِ یگانہ کو کہتے ہیں، اور " احد " اور " واحد " کا ایک ہی مفہوم ہے، اور وہ ایک ایسی منفرد ذات ہے جس کا کوئی مثل و نظیر نہیں ہے۔ اور " توحید " اس کی یگانگت، وحدت اور انفرادیت کا اقرار ہے۔

اِسی حدیث کے ذیل میں آیا ہے :

> " واحد عدد نہیں ہے، بلکہ واحد اعداد کی بنیاد ہے۔ عدد دو سے شروع ہوتا ہے، اس بنا پر اللہ احد " یعنی وہ معبود جس کی ذات کے ادراک سے انسان عاجز ہیں اور جس کی کیفیت کا احاطہ کرنے سے ناتواں ہیں " کا معنی یہ ہے کہ وہ الٰہیت میں فرد ہے اور مخلوقات کی صفات سے برتر ہے[2]

قرآن مجید میں " واحد " و " احد " دونوں کا خدا کی ذاتِ پاک پر اطلاق ہوا ہے۔

---

[1] " المیزان " جلد ۲۰، ص ۵۴۳۔

[2] " بحار الانوار " جلد ۳، ص ۲۲۲۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ توحید صدوق میں آیا ہے کہ جنگ جمل میں ایک اعرابی نے کھڑے ہوکر عرض کیا اے امیرالمومنین ! کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ خدا واحد ہے ؟ تو واحد کا کیا معنی ہے ؟

اچانک لوگوں نے ہر طرف سے اس پر حملہ کر دیا اور کہنے لگے : " اے اعرابی یہ کیا سوال ہے ؟ کیا تُو دیکھ نہیں رہا ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام مسئلہ جنگ کی فکر میں کتنے مشغول ہیں ؛ ہر سخن جائے و ہر نکتہ مقامی دارد ! ہر بات کا ایک موقع اور ہر نکتہ کا ایک مقام ہوتا ہے ۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا :

" اسے اس کی حالت پر چھوڑ دو کیونکہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہی چیز ہم اس دشمن گروہ سے چاہتے ہیں ۔ (وہ توحید کے بارے میں پوچھ رہا ہے ، ہم بھی مخالفین کو کلمۂ توحید ہی کی دعوت دے رہے ہیں)۔

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا :

" اے اعرابی یہ جو ہم کہتے ہیں کہ خدا " واحد " ہے تو اس کے چار معانی ہو سکتے ہیں جن میں سے دو معانی خدا کے لیے صحیح نہیں ہیں اور اس کے دو معانی صحیح ہیں ۔

" اب وہ دو جو صحیح نہیں ہیں ، ان میں سے ایک وحدت عددی ہے ۔ یہ خدا کے لیے جائز نہیں ہے (یعنی ہم یہ کہیں کہ وہ ایک ہے دو نہیں ہیں) کیونکہ اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے لیے دوسرے کا تصور ہو سکتا ہے لیکن وہ موجود نہیں ہے ۔ حالانکہ مسلّمہ طور پر حق تعالیٰ کی غیر متناہی ذات کے لیے دوسرے کا تصور ہو ہی نہیں سکتا ۔ کیونکہ جس چیز کا کوئی ثانی ہی نہیں ہے وہ باب اعداد میں داخل نہیں ہوتی ۔ کیا تُو دیکھتا نہیں کہ خدا نے ان لوگوں کی ، جنہوں نے یہ کہا تھا کہ : " ان اللہ ثالث ثلاثۃ " (خدا تین میں کا تیسرا ہے) ، تکفیر کی ہے ۔

" واحد کا دوسرا معنی جو خدا کے لیے صحیح نہیں ہے یہ ہے کہ وہ واحد نوعی کے معنی میں ہو ، مثلاً : ہم یہ کہیں کہ فلاں آدمی لوگوں میں سے ایک ہے ، یہ بھی خدا کے لیے صحیح نہیں ہے ۔ (کیونکہ خدا کی کوئی جنس اور نوع نہیں ہے) اس بات کا مفہوم تشبیہ ہے ، اور خدا ہر قسم کی تشبیہ اور نظیر سے برتر و بالاتر ہے ۔

" اب رہے وہ دو مفہوم جو خدا کے بارے میں صحیح اور صادق ہیں ، ان میں سے پہلا یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ خدا واحد ہے یعنی اشیاء عالم میں کوئی اس کی شبیہ نہیں ہے ، ہاں ! ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے ۔

" دوسرے یہ کہ یہ کہا جائے کہ ہمارا پروردگار احدی المعنی ہے ، یعنی اس کی ذات ناقابل تقسیم ہے ، نہ تو خارج میں نہ عقل میں اور نہ ہی وہم میں ، ہاں ! خدائے بزرگ ایسا ہی ہے ۔[1]

" خلاصہ یہ ہے کہ خدا واحد و احد ہے اور یگانہ و یکتا ہے ۔ واحد عددی یا نوعی و جنسی کے معنی میں نہیں بلکہ وحدت

---

[1] " بحارالانوار " جلد ۴ ، ص ۳۰۶ ، حدیث ۱

ذاتی کے معنی ہیں، زیادہ واضح عبارت میں اس کی وحدانیت کا معنی یہ ہے کہ اس کا کوئی مثل و نظیر اور مانند و شبیہ نہیں ہے"

اس بات کی دلیل بھی واضح و روشن ہے: وہ ایک ایسی ذات ہے جو ہر جہت سے غیر متناہی ہے اور مسلّم طور پر ہر جہت سے دو غیر متناہی ذاتیں ناقابلِ تصور ہیں، کیونکہ اگر دو ذاتیں ہوں گی تو وہ دونوں محدود ہو جائیں گی، اس میں اُس کے کمالات نہ ہوں گے اور نہ اُس میں اس کے کمالات (غور کیجئے)۔

بعد والی آیت میں اس یکتا ذاتِ مقدس کے بارے میں فرماتا ہے: "وُہ ایسا خدا ہے کہ تمام حاجت مند اسی کی طرف رُخ کرتے ہیں"۔ (اللہ الصمد)۔

"صمد" کے لیے روایات اور مفسّرین و اربابِ لُغت کے کلمات میں بہت زیادہ معانی بیان ہوئے ہیں۔

"راغب" "مفردات" میں کہتا ہے: صمد اس آقا اور بزرگ کے معنی میں ہے جس کی طرف کاموں کی انجام دہی کے لیے جاتے ہیں۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ "صمد" اس چیز کے معنی میں ہے جو اندر سے خالی نہ ہو بلکہ پُر ہو۔

"مقاییس اللغۃ" میں آیا ہے کی دو اصلی جڑ بُنیادیں ہیں: ایک قصد کے معنی میں ہے اور دُوسرا صلابت و استحکام کے معنی میں، اور یہ جو خدا کو "صمد" کہا جاتا ہے تو یہ اس بنا پر ہے کہ بندے اس کی بارگاہ کا قصد و ارادہ کرتے ہیں۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ ذیل کے متعدد معانی بھی لُغت کی کتابوں میں "صمد" کے لیے ذکر ہوئے ہیں:

ایسی بزرگ ہستی جو انتہائی عظمت میں ہو، اور ایسی ذات جس کی طرف لوگ اپنی حاجات لے کر جاتے ہیں، ایسی ذات جس سے برتر کوئی چیز نہیں ہے، ایسی ہستی جو مخلوق کے فنا و نابود ہونے کے بعد بھی دائم اور باقی رہنے والی ہے۔

اسی لیے امام حسین بن علی علیہما السلام نے ایک حدیث میں "صمد" کے لیے پانچ معانی بیان کیے ہیں: "صمد" اس ہستی کو کہتے ہیں جو انتہائی سیادت و آقائی میں ہو۔

"صمد" وہ ذات ہے جو دائم اور ازلی و ابدی ہو۔

"صمد" وہ موجود ہے جو جوف (اندر سے خلا) نہ رکھتا ہو۔

"صمد" وہ ہستی جو نہ کھاتی ہو نہ پیتی ہو۔

"صمد" وہ ہستی جو کبھی نہ سوتی ہو[1]

اور دوسری عبارتوں میں یہ آیا ہے کہ: "صمد اس ہستی کو کہتے ہیں جو قائم بہ نفس ہو اور غیر سے بے نیاز ہو"

"صمد" اس ہستی کو کہتے ہیں جس میں تغیرات اور کون و فساد نہیں ہے۔

امام علی بن الحسین علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"صمد" اس ہستی کو کہتے ہیں جس کا کوئی شریک نہ ہو کسی چیز کی حفاظت کرنا اس کے لیے مشکل نہ ہو اور کوئی چیز اس سے مخفی نہیں رہتی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "صمد" اس ذات کو کہتے ہیں کہ وہ جب بھی کسی چیز کا ارادہ کرے تو اُسے کہتا ہے

---

[1] "بحارالانوار" جلد ۳، ص ۲۲۳۔

ہوجا، تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ "اہلِ بصرہ" نے امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا اور "صمد" کے معنی دریافت کیے۔ امام علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا:

"بسم اللہ الرحمان الرحیم، امابعد قرآن میں آگاہی کے بغیر بحث و گفتگو نہ کرو، کیونکہ میں نے اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا ہے، آپ فرما رہے تھے: جو شخص علم کے بغیر بات کرے گا اسے آگ میں اس مقام پر رہنا پڑے گا جو اُس کے لیے معین ہے۔ خدا نے خود "صمد" کی تفسیر بیان فرمائی ہے "لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفوًا احد" نہ اُسے کسی نے جنا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور نہ ہی کوئی اس کی مانند اور مثل و نظیر ہے۔ ہاں! خداوند "صمد" وہ ہے جو کسی چیز سے وجود میں نہیں آیا، اور نہ ہی وُہ کسی چیز کے اندر موجود ہے۔ نہ کسی چیز کے اُوپر قرار پایا ہے، وہ تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا اور ان کا خالق ہے، تمام چیزوں کو وہی اپنی قدرت سے وجود میں لایا ہے۔ جن چیزوں کو اس نے فنا کے لیے پیدا کیا ہے وہ اس کے ارادہ سے متلاشی ہو جائے گی، اور جسے بقا کے لیے پیدا کیا ہے، وہ اس کے علم سے باقی رہے گی۔ یہ ہے خداوند صمد ..... "[1]

اور بالآخر ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ "محمد بن حنفیہ" نے امیرالمومنین علی علیہ السلام سے "صمد" کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

"صمد" کی تاویل یہ ہے کہ وہ نہ اسم ہے اور نہ جسم ہے، نہ اس کا کوئی مثل ہے نہ نظیر ہے، نہ صُورت ہے، نہ تمثال ہے، نہ حد ہے نہ حدُود ہے، نہ محل ہے، نہ مکان ہے، نہ حال ہے، نہ یہ ہے، نہ یہاں ہے، نہ وہاں ہے، نہ پُر ہے نہ خالی ہے، نہ کھڑا ہے، نہ بیٹھا ہے، نہ ساکن ہے، نہ متحرک ہے، نہ ظلماتی ہے، نہ نورانی ہے، نہ نفسانی۔ اس کے باوجود کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے اور کسی مکان میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ نہ وہ رنگ رکھتا ہے، نہ انسان کے دل میں سماتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی بُو ہے۔ یہ سب چیزیں اس کی ذاتِ پاک سے منتفی ہے۔[2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰، ص ۵۶۵

[2] "بحارالانوار" جلد ۳، ص ۲۳۰، حدیث ۲۱

یہ حدیث اچھی طرح سے نشان دہی کرتی ہے کہ "صمد" کا ایک بہت ہی جامع اور وسیع مفہوم ہے۔ جو اس کی ساحت قدس سے مخلوقات کی ہر قسم کی صفات کی نفی کرتا ہے۔ کیونکہ مشخص اور محدود اسماء، اور اسی طرح جسم و رنگ و بُو و مکان و سکون و حرکت و کیفیت و حد و حدود اور اسی قسم کی دوسری چیزیں، یہ سب ممکنات و مخلوقات کی صفات ہیں، بلکہ زیادہ تر عالم مادّہ کے اوصاف ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ خدا ان سب سے برتر و بالاتر ہے۔

آخری انکشافات سے معلوم ہوا ہے کہ جہانِ مادّہ کی تمام چیزیں بہت ہی چھوٹے چھوٹے ذرات سے مل کر بنی ہیں جنہیں "ایٹم" کہا جاتا ہے۔ اور "ایٹم" خود بھی دو عمدہ حصّوں کا مرکب ہے۔ مرکزی ذرہ اور وہ الکٹرون جو اس کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس ذرّہ اور الکٹرونوں کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہے۔ (البتہ یہ زیادہ ایٹم کے حجم کے اندازہ سے ہے) اس طرح سے کہ اگر یہ فاصلہ اُٹھا دیا جائے تو اجسام اس قدر چھوٹے ہو جائیں گے کہ وہ ہمارے لیے حیرت میں ڈالنے والے ہوں گے۔

مثلاً اگر ایک انسان کے وجود کے ایٹمی ذرات کے فاصلے ختم کر دیں اور اُسے مکمل طور پر دبا دیں تو ممکن ہے کہ وُہ ایک ذرّہ کی صُورت اختیار کر لے، جس کا آنکھ کے ساتھ دیکھنا مُشکل ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک انسان کے بدن کے سارے وزن کے برابر ہو گا۔ (مثلاً: یہی معمولی ذرہ ۶۰ کلو وزنی ہو گا)۔

بعض نے اس علمی انکشاف سے استفادہ کرتے ہوئے اور اس بات کی طرف توجہ دیتے ہوئے کہ "صمد" کا ایک معنی ایسا وجود ہے جو اندر سے خالی نہیں ہے، یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن اس تعبیر سے یہ چاہتا ہے کہ خدا سے ہر قسم کی جسمانیت کی نفی کر دے۔ کیونکہ تمام اجسام ایٹم سے بنے ہوئے ہیں اور ایٹم اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ اور اس طرح یہ آیت قرآن کے علمی معجزات میں سے ایک ہو سکتی ہے۔

لیکن اِس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ اہلِ لُغت میں "صمد" ایک ایسی عظیم ہستی کے معنی میں ہے جس کی طرف تمام حاجت مند رُخ کرتے ہیں اور وُہ ہر لحاظ سے کامل ہو، اور ظاہراً باقی تمام معانی اور تفاسیر جو اس کے لیے بیان کی گئی ہیں اِسی اصل کی طرف لوٹتی ہیں۔

اس کے بعد اگلی آیت میں نصاریٰ، یہُود اور مشرکینِ عرب کے عقائد کی رد پیش کرتے ہوئے ــــ جو خدا کے لیے بیٹے یا باپ کے قائل تھے ــــ فرماتا ہے: "اس نے نہ تو کسی کو جنا ہے اور نہ ہی وُہ خُود کسی سے پیدا ہوا ہے"۔ (لم یلد ولم یولد)۔

اِس بیان کے مقابلہ میں ان لوگوں کا نظریہ ہے جو تثلیث (تین خداؤں) کا عقیدہ رکھتے تھے، باپ خدا، بیٹا خدا اور رُوح القدس۔

نصاریٰ "مسیح" کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور یہود "عزیر" کو اس کا بیٹا سمجھتے تھے، وقالت الیھود عزیر ابن اللہ وقالت النصاریٰ المسیح ابن اللہ ذالک قولھم بافواھھم یضاھئون قول الذین کفروا من قبل قاتلھم اللہ انّٰی یؤفکون:

"یہود نے تو یہ کہا کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے یہ کہا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو وہ اپنی زبان سے کہتے ہیں اور ان کی یہ بات گزشتہ کافروں کے قول کے مانند ہے۔ ان پر خدا کی لعنت ہو، وہ حق سے کیسے منحرف ہو جاتے ہیں" (توبہ۔ ۳۰)

مشرکینِ عرب کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں' وخرقوالہ بنین و بنات بغیر علم: "انہوں نے جھوٹ اور جہالت کی بنا پر خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لی تھیں" (انعام ۔ ۱۰۰)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آیہ "لم یلد ولم یولد" میں تولد ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اُس سے ہر قسم کی مادّی و لطیف چیزوں کے خروج اس ذاتِ مقدس کے دوسری مادّی و لطیف چیزوں سے خروج کی نفی کرتا ہے۔

جیسا کہ اسی خط میں۔ جو امام حسینؑ نے "اہلِ بصرہ" کے جواب میں صمد کی تفسیر میں لکھا تھا: "لم یلد ولم یولد" کے جملہ کی اس طرح تفسیر کی گئی تھی: (لم یلد) یعنی کوئی چیز اس سے خارج نہیں ہوئی، نہ تو بیٹے جیسی کوئی مادّی چیز اور نہ ہی وہ تمام چیزیں جو مخلوق سے خارج ہوتی ہیں (جیسے ماں کی چھاتیوں سے دُودھ) اور نہ ہی نفس جیسی کوئی لطیف چیز اور نہ ہی قسم قسم کے حالات، جیسے خواب و خیال، حزن و اندوہ، خوشحال ہونا، ہنسنا اور رونا، خوف و رجا، شوق و ملالت، بھوک اور سیری وغیرہ۔ خدا اس سے برتر و بالاتر ہے کہ کوئی چیز اس سے خارج ہو۔

اور وہ اس بات سے بھی برتر و بالاتر ہے کہ وُہ کسی مادّی چیز سے متولد ہو۔۔۔۔ جیسا کہ کسی زندہ موجود کا کسی دوسرے زندہ موجود سے خارج ہونا اور گھاس کا زمین سے، پانی کا چشمہ سے، پھل کا درختوں سے اور اشیائے لطیف کا اپنے منابع سے جیسے نگاہ کا آنکھ سے، سماعت کا کان سے، سُونگھنے کا ناک سے، چکھنے کا مُنہ سے، گفتگو کا زبان سے، معرفت و شناخت کا دل سے اور آگ کی چنگاری کا پتھر سے نکلنا۔[1]

اِس حدیث کے مطابق تولد ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر قسم کے خروج اور ایک چیز کے کسی دوسری چیز کا نتیجہ ہونے کو شامل ہے، اور یہ حقیقت میں آیت کا دوسرا معنی ہے اور اس کا پہلا اور ظاہری معنی وہی تھا جو ابتدا میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا معنی پہلے معنی کی تحلیل کرنے سے پُورے طور پر قابلِ ادراک ہے کیونکہ اگر خدا کے بیٹا نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مادّی عوارض سے پاک و منزّہ ہے۔ یہی معنی تمام مادّی عوارض میں بھی صادق آتا ہے۔ (غور کیجئے)

اور آخر میں اس سُورہ کی آخری آیت میں خدا کے اوصاف کے بارے میں مطلب کو مرحلۂ کمال تک پہنچاتے ہُوئے فرماتا ہے: اور ہرگز اس کا کوئی شبیہ اور ہمسر نہیں ہے۔ (ولم یکن لہ کفوًا احد)[2]

"کفو" اصل میں مقام و منزلت اور قدر میں ہم پلّہ کے معنی میں ہے اور اس کے بعد اس کا ہر قسم کے شبیہ اور مانند پر اطلاق ہوا ہے۔

اِس آیت کے مطابق مخلوقات کے تمام عوارض اور موجودات کی صفات اور ہر قسم کا نقص و محدودیت اس کی ذاتِ پاک سے منتفی ہے۔ یہ وہی توحیدِ ذاتی و صفاتی ہے جو اُس توحیدِ عددی و نوعی کے مقابلہ میں ہے جس کی طرف اس سورہ کے

---

[1] "بحارالانوار" جلد ۳ ص ۲۲۴

[2] "احد" "کان" کا اسم ہے اور "کفوًا" اس کی خبر ہے۔

آغاز میں اشارہ ہوا ہے۔

اس بنا پر نہ تو ذات میں اس کا کوئی شبیہ ہے اور نہ صفات میں کوئی اس کے مانند ہے، اور نہ ہی افعال میں کوئی اس کا مثل و نظیر ہے۔ وہ ہر لحاظ سے بے مثل و بے نظیر ہے۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

"لم یلد" فیکون مولودًا "ولم یولد" فیصیر محدودًا ..... ولا "کفء" له فیکافئه "ولا نظیر له فیساویه"

اس نے کسی کو نہیں جنا کہ وہ خود بھی مولود ہو۔ اور وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا ورنہ وہ محدود ہو جاتا ..... اس کا کوئی مثل و نظیر نہیں ہے کہ وہ اس کا ہم پلہ ہو جائے اور اس کے لیے کسی شبیہ کا تصور نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کے مساوی ہو جائے۔[1]

اور یہ ایک ایسی عمدہ تفسیر ہے جو توحید کے عالیترین دقائق کو بیان کرتی ہے۔ (سلام اللہ علیک یا امیرالمومنین)

چند نکات

۱۔ توحید کے دلائل

توحید، یعنی ذاتِ خدا کا یکتا و یگانہ ہونا اور اس کا کوئی شریک و شبیہ نہ ہونا، دلائلِ نقلی اور قرآن مجید کی آیات کے علاوہ بہت سے عقلی دلائل سے بھی ثابت ہے جن میں سے ایک حصہ کو ہم مختصر طور پر یہاں نقل کرتے ہیں۔

۱۔ برہان صرف الوجود۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا وجودِ مطلق ہے اور اس کے لیے کوئی قید و شرط اور حد نہیں ہے۔ اس قسم کا وجود یقینی طور پر غیر محدود ہوگا، کیونکہ اگر اس میں محدودیت ہوگی تو وہ ضروری طور پر عدم سے آلودہ ہوگا، لیکن وہ ذاتِ مقدس جس کی ہستی و وجود خود بخود موجود ہے وہ ہرگز عدم و نیستی کا مقتضی نہیں ہوگا، اور وہ خارج میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو عدم کو اس پر ڈال دے۔ اس بنا پر وہ کسی حد کے ساتھ محدود نہیں ہوگا۔

دوسری طرف سے عالم میں دو غیر محدود ہستیاں تصور میں ہی نہیں آ سکتیں، کیونکہ اگر دو موجود پیدا ہو جائیں تو یقیناً ان میں سے ہر ایک دوسرے کے کمالات کا فاقد ہوگا۔ یعنی اس میں دوسرے کے کمالات نہیں ہوں گے۔ اس بنا پر وہ دونوں ہی محدود ہو جائیں گے، اور یہ خود ذات واجب الوجود کی یگانگت اور یکتائی پر ایک واضح دلیل ہے۔ (غور کیجیے)

۲۔ برہان علمی۔ جب ہم اس وسیع و عریض جہان پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ابتدا میں ہم عالم کو پراگندہ موجودات کی صورت میں دیکھتے ہیں، زمین و آسمان، سورج، چاند، ستارے، انواع و اقسام کی نباتات و حیوانات، لیکن ہم جتنا

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۱۸۶

زیادہ غور کرتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ اس عالم کے اجزاء و ذرات اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور پیوستہ ہیں کہ مجموعی طور پر وہ ایک منظم چیز بناتے ہیں اور اس جہان پر معین قوانین کا ایک سلسلہ حکومت کرتا ہے۔

انسانی علم و دانش کی پیش رفت جس قدر زیادہ ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس جہان کے اجزاء کا انسجام و وحدت زیادہ آشکار اور ظاہر ہوتا جا رہا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات ایک چھوٹے سے نمونہ (مثلاً ایک سیب کے درخت سے گرنے) کی آزمائش اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ ایک بہت بڑا قانون جو سارے عالم ہستی پر حکم فرما ہے، منکشف ہو جاتا ہے۔ (جیسا کہ "نیوٹن" اور "قانونِ جاذبہ" کے بارے میں ہے)۔

نظامِ ہستی کی یہ وحدت، اس پر حاکم قوانین اور اس کے اجزاء کے درمیان انسجام و یکتائی، اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اس کا خالق یکتا و یگانہ ہے۔

۳۔ برہان تمانع۔ (فلسفی علمی دلیل) دوسری دلیل جو علماء نے خدا کی ذات کی یکتائی اور وحدت کے لیے بیان کی ہے اور قرآن نے سورۂ انبیاء کی آیہ ۲۲ میں جس کے بارے میں ہدایت کی ہے، وہ برہان تمانع ہے، فرماتا ہے: لوکان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا فسبحان اللہ رب العرش عما یصفون "اگر زمین و آسمان میں خدائے واحد و یکتا کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو آسمان و زمین میں فساد ہو جاتا، اور نظام جہاں درہم و برہم ہو جاتا، پس وہ خدا جو عرش کا پروردگار ہے ان کی توصیف سے پاک و منزہ ہے۔

ہم اس دلیل کی جلد ۱۳ ص ۲۸۶ میں "برہان تمانع" کے عنوان کے ماتحت تفصیل کے ساتھ وضاحت کر چکے ہیں۔

۴۔ خداوند یگانہ کی طرف انبیاء کی عمومی دعوت: اثباتِ توحید کے لیے یہ ایک اور دلیل ہے کیونکہ اگر عالم میں دو واجب الوجود ہوتے تو دونوں کو ہی منبع فیض ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ ایک بے نہایت کامل وجود کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی نور افشانی میں بخل کرے، کیونکہ وجودِ کامل کے لیے عدمِ فیض نقص ہے۔ اور اس کے حکیم ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سب کو اپنا فیض پہنچائے۔

اس فیض کی دو شاخیں ہیں۔ (عالم خلقت میں) فیض تکوینی، اور (عالم ہدایت میں) فیض تشریعی۔ اس بنا پر اگر متعدد خدا ہوتے تو ضروری تھا کہ ان کی طرف سے بھی پیغمبر اور رسول آتے، اور ان کے فیضِ تشریعی سب کو پہنچاتے۔

حضرت علی علیہ السلام اپنے فرزند گرامی امام مجتبیٰ علیہ السلام کے وصیت نامہ میں فرماتے ہیں:

"واعلم یا بنی انہ لوکان لربک شریک لاتتک رسلہ ولرأیت آثار ملکہ وسلطانہ، ولعرفت افعالہ وصفاتہ، ولکنہ الٰہ واحد کما وصف نفسہ۔"

"اے بیٹا! جان لو کہ اگر تیرے پروردگار کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے بھیجے ہوئے نمائندے تیرے پاس آتے، اور تو اس کے ملک و سلطنت کے آثار کا بھی مشاہدہ کرتا، اور تو اس کی صفات و افعال سے بھی آشنا ہوتا، لیکن وہ

ایک اکیلا معبود ہے ۔ جیسا کہ خود اس نے اپنی توصیف فرمائی ہے[1]

یہ سب اس کی ذات کی یکتائی کے دلائل ہیں ۔ باقی رہا اس کی ذاتِ پاک میں ہر قسم کی ترکیب و اجزا کے نہ ہونے کی دلیل تو وہ روشن و واضح ہے کیونکہ اگر اس کے لیے اجزائے خارجیہ ہوں تو طبعاً وہ ان کا محتاج ہوگا، اور واجب الوجود کے لیے محتاج ہونا معقول نہیں ہے اور اگر " اجزائے عقلیہ " (ماہیت و وجود یا جنس و فصل کی ترکیب) مُراد ہو، تو وہ بھی محال ہے، کیونکہ ماہیت و وجود سے ترکیب اس کے محدود ہونے کی فرع ہے ۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اس کا وجود غیر محدود ہے، اور جنس و فصل کی ترکیب ماہیت رکھنے کی فرع ہے ۔ لیکن وہ ذات جس کی کوئی ماہیت نہیں ہے ، اس کی جنس و فصل بھی نہیں ہے

۲۔ توحید کی اقسام

عام طور پر توحید کی چار اقسام بیان کی جاتی ہیں :

۱۔ **توحید ذات** : (جس کی اُوپر تشریح کی گئی ہے)۔

۲۔ **توحید صفات** : یعنی اس کی صفات اس کی ذات سے الگ نہیں ہیں اور ایک دوسرے سے بھی جُدا نہیں ہیں ، مثلاً ہمارا " علم " و " قدرت " دو الگ الگ صفات ہیں جو ہماری ذات پر عارض ہیں ، ہماری ذات ایک الگ چیز ہے اور ہمارا علم و قدرت دوسری چیزیں ہیں جیسا کہ " علم " و " قدرت " بھی ہم میں ایک دوسرے سے جُدا ہیں ۔ ہمارے علم کا مرکز ہماری رُوح ہے ، جب کہ ہماری قدرتِ جسمانی کا مرکز ہمارے بازو اور عضلات ہیں ۔ لیکن خدا میں نہ اس کی صفات اس کی ذات پر زائد ہیں اور نہ ہی وُہ ایک دوسرے سے جُدا ہیں ، بلکہ وہ ایک ایسا وجود ہے جو سارا کا سارا علم ہے ، سارا کا سارا قدرت ہے اور سب کا سب ازلیت و ابدیت ہے ۔

اگر اس کے علاوہ صُورت ہو تو اس کا لازمہ ترکیب ہے اور اگر وُہ مرکب ہوگا تو اجزا کا محتاج ہوگا ، اور محتاج چیز ہرگز واجبُ الوجود نہیں ہوتی ۔

۳۔ **توحید افعالی** : یعنی ہر وجود ، ہر حرکت اور ہر حرکت جو دُنیا میں ہو رہی ہے اس کی بازگشت خدا کی پاک ذات کی طرف ہے ۔ وہی مسبب الاسباب ہے اور اس کی پاک ذات ہی علت العلل ہے ، یہاں تک کہ وُہ افعال بھی جو ہم سے سرزد ہوتے ہیں ایک معنی میں اسی کے افعال ہیں ، چونکہ اُسی نے ہمیں قدرت و اختیار اور ارادہ کی آزادی عطا فرمائی ہے ۔ اس بنا پر ہم اپنے افعال کے فاعل اور ان کے مقابلہ میں مسئول و جواب دہ ہونے کے باوجود ایک لحاظ سے فاعل خدا ہی ہے ، کیونکہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وُہ سب اسی کی طرف سے ہے ۔ (لا مؤثر فی الوجود الا اللہ) (عالمِ وجود میں خدا کے سوا اور کوئی مؤثر نہیں ہے) ۔

۴۔ **توحید در عبادت** : یعنی صرف اسی کی عبادت کرنا چاہیئے اور اس کا غیر لائقِ عبادت نہیں ہے ، کیونکہ عبادت ایسی ذات کی ہونا چاہیئے جو کمالِ مطلق اور مطلقِ کمال ہے ، جو سب سے بے نیاز اور تمام نعمتوں کا بخشنے والا

---

[1] " نہج البلاغہ " وصیت امام مجتبیٰ (حصہ خطوط خط ۳۱)۔

اور تمام موجودات کا پیدا کرنے والا ہے ، اور یہ صفات اس کی پاک ذات کے سوا کسی میں جمع نہیں ہو سکتیں۔

عبادت کا اصلی مقصد اس کمال مطلق اور بے پایاں ہستی کا قُرب حاصل کرنا اور اس کی صفاتِ جمال و کمال کو اپنی رُوح کے اندر منعکس کرنا ہے، جس کا نتیجہ ہوا و ہوس سے دُوری اور تہذیبِ نفس اور خُود سازی کی طرف رُخ کرنا ہے۔ یہ ہدف اور مقصد "اللہ" کی عبادت کے بغیر، جو وہی کمالِ مطلق ہے ، اِمکان پذیر نہیں ہے۔

۳۔ توحید افعالی کی اقسام

"پھر توحید افعالی کی بھی بہت سی اقسام ہیں جن میں سے ہم یہاں چھ اہم ترین اقسام کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ **توحیدِ خالقیت** ؛ جیسا کہ قرآن کہتا ہے : قل اللہ خالق کل شیء : "کہہ دیجئے خدا ہی ہر چیز کا خالق ہے" (رعد - ۱۶)

اس کی دلیل بھی واضح ہے - جب گزشتہ دلائل سے ثابت ہو گیا کہ واجب الوجود ایک ہی ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز ممکن الوجود ہے تو اس بنا پر تمام موجودات کا خالق بھی ایک ہی ہو گا۔

۲۔ **توحیدِ ربوبیت** ؛ یعنی عالمِ ہستی کا مدبّر و مدیر، مربّی اور اس کا نظام بخش صرف خدا ہے ، جیسا کہ قرآن کہتا ہے :- قل اغیر اللہ ابغی ربًّا وھو رب کل شیء "کہہ دیجئے کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا پروردگار مان لوں حالانکہ ہر چیز کا پروردگار وہی ہے"؟ (انعام - ۱۶۴)۔

اس کی دلیل بھی واجبُ الوجود کی وحدت اور عالمِ ہستی میں خالق کی توحید ہے۔

۳۔ **توحید تشریع و قانون گزاری** ؛ جیسا کہ قرآن کہتا ہے : ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون : "جو شخص اس کے مطابق حکم نہیں کرتا ، جو خدا نے نازل کیا ہے ، وُہ کافر ہے" (مائدہ - ۴۴)

کیونکہ جب ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ مدبر و مدیر وہی ہے، تو مسلّمہ طور پر اس کے غیر میں قانون گزاری کی صلاحیت نہیں ہو سکتی ، کیونکہ اس کے غیر کا تدبیرِ عالم میں کوئی حصّہ نہیں ہے - لہٰذا وہ نظامِ تکوین سے ہم آہنگ قوانین وضع نہیں کر سکتا۔

۴۔ **توحید در مالکیت** چاہے "حقیقی مالکیت" ہو یعنی کسی چیز پر "تکوینی تسلط" یا "حقوقی مالکیت" ہو، یعنی کسی چیز پر قانونی تسلط ، یہ سب اسی کے لیے ہیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے : "وللہ ملک السماوات والارض" "آسمانوں اور زمین کی مالکیت و حاکمیت خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ (آل عمران - ۱۸۹)

اور یہ بھی فرماتا ہے : "وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ" "خدا نے جن اموال میں تمہیں اپنا نمائندہ قرار دیا ہے، ان میں سے (راہِ خدا) میں خرچ کرو" (حدید - ۷)

اس کی دلیل بھی وہی توحید در خالقیت ہے - جب تمام اشیاء کا خالق وہی ہے ، تو طبعاً تمام چیزوں کی مالک بھی اسی کی ذات مقدس ہے ، اس بنا پر ہر ملکیت کا سرچشمہ اسی کی مالکیت کو ہونا چاہیئے۔

۵۔ توحیدِ حاکمیت

یقیناً انسانی معاشرہ حکومت کا محتاج ہے، کیونکہ اجتماعی زندگی حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ذمہ داریوں کی تقسیم، پروگراموں کی تنظیم، مدیریتوں کا اجراء اور تجاوزات کو روکنا، صرف حکومت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

ایک طرف تو انسانوں کی اصل آزادی یہ کہتی ہے کہ کوئی شخص کسی شخص پر حقِ حکومت نہیں رکھتا مگر جسے اصل مالک اور حاکمِ حقیقی اجازت دے، اور یہی وجہ ہے کہ ہم ہر اس حکومت کو جو حکومتِ الٰہی پر منتہی نہیں ہوتی مردود سمجھتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ہم حکومت کی مشروعیت کو صرف پیغمبرؐ کے لیے سمجھتے ہیں، اور پیغمبرؐ کے بعد آئمہ معصومین کے لیے اور ان کے بعد فقیہ جامع الشرائط کے لیے جانتے ہیں۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ لوگ کسی کو یہ اجازت دے دیں کہ وہ ان پر حکومت کرے، لیکن چونکہ پورے معاشرے کے تمام افراد کا اتفاق عادتاً ممکن نہیں ہے، لہٰذا عملی طور پر اس قسم کی حکومت ممکن نہیں ہے[1]

البتہ اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ توحیدِ ربوبیت عالم تکوین کے ساتھ مربوط ہے اور توحیدِ قانون گزاری و حکومت کا تعلق عالم تشریع کے ساتھ ہے۔

قرآن مجید کہتا ہے: ان الحکم الّا للہ": "حکم اور حکومت کرنا صرف خدا کے لیے ہے"۔ (انعام ۵۷)

۶۔ توحید اطاعت

یعنی جہاں میں واجبُ الاطاعت ہونے کا مقام صرف خُدا کی ذاتِ پاک کے لیے ہے اور ہر دوسرے مقام کی اطاعت کی مشروعیت کا سرچشمہ یہیں سے ہونا چاہیئے، یعنی اس کی اطاعت بھی خدا ہی کی اطاعت شمار ہوگی۔

اس کی دلیل بھی واضح ہے۔ جب حاکیت اسی کے ساتھ مخصوص ہے، تو مطاع ہونا بھی اُسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسی لیے ہم انبیاءؑ کی اطاعت، آئمہ معصومین کی اطاعت اور ان کے جانشینوں کی اطاعت کو بھی خدا ہی کی اطاعت کا پرتو شمار کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم: "اے ایمان لانے والو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اور صاحبانِ امر (آئمہ معصومین) کی اطاعت کرو۔ (نساء ۵۹)

البتہ اُوپر والے مباحث میں سے ہر ایک کے لیے بہت ہی زیادہ شرح و بسط کی ضرورت ہے اور ہم نے اس بناء پر کہ ہم بحثِ تفسیری سے خارج نہ ہو جائیں، انہیں اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

خداوندا! ہمیں ساری عمر توحید کے راستہ پر ثابت قدم رکھ۔

پروردگارا! شرک کی شاخیں بھی توحید کی شاخوں کی طرح بہت زیادہ ہیں، اور تیرے لُطف کے بغیر شرک سے

---

[1] اس بناء پر اگر کوئی حکومت عوام اور اکثریت کی رائے سے معین ہو تو ضروری ہے کہ وُہ فقیہ جامع الشرائط کے ذریعے نافذ ہو، تاکہ وہ مشروعیتِ الٰہیہ پیدا کر سکے۔

نجات ممکن نہیں ہے۔ تو ہمیں اپنے لطف کا مشمول قرار دے۔

بارِ الٰہا ! ہمیں توحید کے ساتھ زندہ رکھنا اور توحید کے ساتھ ہی ہمیں موت دینا۔ اور حقیقت توحید کے ساتھ ہمیں محشور کرنا۔

❖ ❖ ❖

آمین یا ربّ العالمین۔

سورۂ اخلاص کا اختتام

سُوْرَۃُ الْفَلَق

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا۔

❖ اس میں ۵ آیات ہیں۔

سُورۂ "فلق" کے مطالب اور اس کی فضیلت

ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا اگرچہ مفسّرین کی ایک دوسری جماعت اِسے "مدنی" سمجھتی ہے۔

اس سُورہ کے مطالب ایسی تعلیمات ہیں جو خُدا نے پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بالخصوص، اور سب مسلمانوں کو بالعموم، تمام اشرار کے شر سے، اس کی ذاتِ پاک سے پناہ مانگنے کے سلسلہ میں دی ہیں، تاکہ خُود کو اس کے سپُرد کر دیں اور اس کی پناہ میں ہر صاحبِ شر موجود کے شر سے امان میں رہیں۔

اِس سُورہ کے شانِ نزول کے بارے میں اکثر کُتبِ تفاسیر میں کچھ روایات نقل ہوئی ہیں جن کے مطابق بعض یہودیوں نے پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کر دیا تھا، جس سے آپ بیمار ہو گئے تھے۔ جبرئیل نازل ہوئے اور جس کنویں میں جادو کے آلات چھپائے ہوئے تھے اُس جگہ کی نشان دہی کی، اسے باہر نکالا گیا، پھر اس سُورہ کی تلاوت کی تو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حالت بہتر ہو گئی۔

لیکن مرحوم طبرسی اور بعض دوسرے محققین نے اس قسم کی روایات کو، جن کی سند صرف "ابنِ عباسؓ" اور عائشہؓ تک منتہی ہوتی ہے، قابلِ اعتراض سمجھا ہے اور درست قرار نہیں دیا، کیونکہ:

اوّلاً: یہ سُورہ مشہور قول کے مطابق مکّی ہے اور اس کا لب و لہجہ بھی مکّی سُورتوں والا ہے، جب کہ پیغمبرؐ کا یہودیوں سے واسطہ مدینہ میں پڑا اور خُود یہی بات اس قسم کی روایات کی عدم اصالت کی ایک دلیل ہے۔

دوسری طرف اگر پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادوگر اتنی آسانی کے ساتھ جادو کر لیا کریں کہ وہ بیمار پڑ جائیں اور بسترِ علالت پر دراز ہو جائیں تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آپؐ کو آپ کے عظیم ہدف اور مقصد سے آسانی سے روک دیں۔ مسلّمہ طور پر وہ خدا جس نے آپ کو اس قسم کی ماموریت اور عظیم رسالت کے لیے بھیجا ہے، وہ آپ کو جادوگروں

کے جادو کے نفوذ سے بھی محفوظ رکھے گا تاکہ نبوت کا بلند مقام ان کے ہاتھ میں بازیچہ اطفال نہ بنے۔

سوم اگر یہ مان لیا جائے کہ جادو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم میں اثر انداز ہو سکتا ہے، تو پھر ممکن ہے کہ لوگوں کے ذہن میں یہ وہم پیدا ہو جائے کہ جادو آپؐ کی روح میں بھی اثر انداز ہو سکتا ہے، اور یہ ممکن ہے کہ آپ کے افکار جادوگروں کے جادو کا شکار ہو جائیں - یہ معنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتماد کی اصل کو عام لوگوں کے افکار میں متزلزل کر دیں گے۔

اس لیے قرآن مجید اس معنی کی نفی کرتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا گیا ہو، فرماتا ہے: وقال الظالمون ان تتبعون الا رجلا مسحورا انظر کیف ضربوا لک الامثال فضلوا فلا یستطیعون سبیلا "

"اور ظالموں نے کہا تم تو ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کرتے ہو، دیکھو تو سہی! تیرے لیے انہوں نے کیسی کیسی مثالیں بیان کی ہیں اور ایسے گمراہ ہوئے ہیں کہ راستہ پا ہی نہیں سکتے" (فرقان - ۸، ۹)

"مسحور" چاہے یہاں اس شخص کے معنی میں ہو جس پر عقلی لحاظ سے جادو کیا گیا ہو یا اس کے جسم پر، دونوں صورتوں میں ہمارے مقصود پر دلالت کرتا ہے۔

بہرحال ایسی مشکوک روایات کے ساتھ مقام نبوت کی قدرت پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی فہم آیات کے لیے ان پر تکیہ کیا جا سکتا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے، آپؐ نے فرمایا:

"انزلت علی آیات لم ینزل مثلهن: المعوذتان"

"مجھ پر ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں کہ ان کی مثل اور مانند اور نازل نہیں ہوئیں اور وہ دو سورتیں "فلق" اور "ناس" ہیں۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے آیا ہے:

"جو شخص نماز وتر میں سورہ "فلق" و "ناس" اور "قل ھو اللہ احد" کو پڑھے گا، تو اس کو یہ کہا جائے گا کہ اے بندۂ خدا تجھے بشارت ہو، خدا نے تیری نماز وتر قبول کر لی ہے۔"[2]

ایک روایت میں پیغمبر اکرمؐ سے بھی آیا ہے کہ آپؐ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

"کیا تو چاہتا ہے کہ میں تجھے ایسی دو سورتوں کی تعلیم دوں جو قرآن کی سورتوں میں سب سے زیادہ افضل و برتر ہیں؟"

اس نے عرض کیا: ہاں! اے رسول اللہؐ - تو حضرت نے اسے معوذتین (سورہ فلق و ناس) کی تعلیم دی، اس کے بعد ان دونوں کی نماز صبح میں قرأت کی اور اس سے فرمایا، جب تو بیدار ہو یا سونے لگے تو ان کو پڑھا کر۔[3] یہ بات واضح ہے کہ یہ سب کچھ ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی روح و جان اور عقیدہ و عمل کو اس کے مطالب کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔

(حاشیہ جات اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہوں)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ
۲۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ
۳۔ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ
۴۔ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۙ
۵۔ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۧ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ کہہ دیجئے میں سفیدۂ صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔
۲۔ ان تمام چیزوں کے شر سے جو اُس نے پیدا کی ہیں۔
۳۔ اور ہر مزاحمت کرنے والے موجود کے شر سے جب کہ وُہ وارد ہو۔
۴۔ اور اُن کے شر سے جو گرہوں میں دَم کرتے ہیں۔ (اور ہر طرح کے اِرادہ کو کمزور کر دیتے ہیں)۔

(حاشیہ گزشتہ صفحہ)
لہ "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۶۱۷ و "مجمع البیان" جلد ۱۰، ص ۵۶۷
عہ "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۶۱۷ و "مجمع البیان" جلد ۱۰، ص ۵۶۷

۵۔ اور ہر حسد کرنے والے کے حسد سے جب وہ حسد کرے۔

تفسیر

مَیں سپیدۂ صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

قرآن اس سُورہ کی پہلی آیت میں خود پیغمبرؐ کو ایک نمونہ اور پیشوا کے عنوان سے اس طرح حکم دیتا ہے: کہہ دیجئے، مَیں سفیدۂ صبح کے پروردگار سے پناہ مانگتا ہوں جو رات کی سیاہی کو چیر دیتا ہے۔ (قل اعوذ برب الفلق)۔

ان تمام چیزوں کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہیں۔ (من شر ما خلق)۔

تمام شریر موجودات کے شر سے، شریر انسانوں سے، جنوں، حیوانات، شر کے پیش آنے والے واقعات اور نفسِ امّارہ کے شر سے۔

"فلق" (بروزن شفق) "فلق" (بروزن خلق) کے مادّہ سے اصل میں کسی چیز میں شگاف کرنے اور ایک کو دوسرے سے جُدا کرنے کے معنی میں ہے، اور چونکہ سفیدۂ صبح کے پھوٹنے کے وقت رات کا سیاہ پردہ چاک ہو جاتا ہے لہٰذا یہ لفظ طلوعِ صبح کے معنی میں استعمال ہوا۔ جیسا کہ "فجر" کا بھی اسی مناسبت سے طلوع صبح پر اطلاق ہوتا ہے۔

بعض اسے تمام موالید اور تمام زندہ موجودات کے معنی میں سمجھتے ہیں، چاہے وہ انسان ہو یا حیوان و نباتات کیونکہ ان موجودات کا پیدا ہونا، جو دانہ یا گٹھلی وغیرہ کے شگافتہ ہونے سے صورت پذیر ہوتا ہے، وجود کے عجیب ترین مراحل میں سے ہے اور حقیقت میں تولد کے وقت اس موجود میں ایک عظیم تحرک رُونما ہوتا ہے اور وہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں قدم رکھتا ہے۔

سُورۂ انعام کی آیہ ۹۵ میں آیا ہے: ان اللہ فالق الحب والنوٰی یخرج الحی من المیت ومخرج المیت من الحی "خدا دانہ اور گٹھلی کا شگافتہ کرنے والا ہے، جو زندہ کو مُردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے خارج کرتا ہے۔

بعض نے "فلق" کے مفہوم کو اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں لیا ہے اور اس کا ہر قسم کی آفرینش و خلقت پر اطلاق کیا ہے، کیونکہ ہر موجود کی آفرینش و خلقت سے عدم کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، اور وجود کا نور ظاہر و آشکار ہو جاتا ہے۔

ان تینوں معانی (طلوع صبح، زندہ موجودات کا تولد، اور ہر موجود کی خلقت و آفرینش) میں سے ہر ایک عجیب و غریب وجود میں آنے والی چیز ہے جو پروردگار اور اس کے خالق و مدبر کی عظمت کی دلیل ہے۔ اور اس وصف کے ساتھ خدا کی توصیف ایک عمیق مفہوم و مطلب رکھتی ہے۔

بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ " فلق " دوزخ میں ایک کنواں یا زندان ہے اور وہ جہنم کے وسط میں ایک شگاف کی مانند دکھائی دیتا ہے۔

یہ روایت ممکن ہے اس کے مصادیق میں سے ایک مصداق کی طرف اشارہ ہو، لیکن یہ " فلق " کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کرتی۔

"من شرّ ما خلق " کی تعبیر کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آفرینش و خلقتِ الٰہی اپنی ذات میں کوئی شر رکھتی ہے، کیونکہ آفرینشِ خلقت تو ایک ایجاد ہی ہے، اور ایجاد و وجود خیر محض ہیں، قرآن کہتا ہے : الّذی احسن کلّ شیء خلقہ " وہی خدا جس نے جس چیز کو بھی پیدا کیا بہتر اور زیادہ سے زیادہ اچھا کرکے پیدا کیا" (الم سجدہ - ۷)

بلکہ شر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مخلوقات قوانینِ آفرینش سے منحرف ہو جائیں اور معینہ راستے سے الگ ہو جائیں مثلاً ڈنک اور جانوروں کے کاٹنے والے دانت ایک دفاعی حربہ ہیں، جنہیں وُہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں استعمال کرتے ہیں اب اگر یہ ہتھیار اپنے موقع و محل پر استعمال ہوں تو خیر ہی خیر ہیں، لیکن اگر یہ بے موقع اور دوست ہی کے مقابلہ میں استعمال ہونے لگیں تو پھر شر اور بُرائی ہیں۔

بہت سے ایسے امور ہیں، جنہیں ہم ظاہر میں شر سمجھتے ہیں، لیکن وہ باطن میں خیر ہیں، مثلاً بیدار کرنے والے اور ہوشیار و خبردار کرنے والے حوادث بلائیں اور مصائب، جو انسان کو خوابِ غفلت سے بیدار کرکے خدا کی طرف متوجہ کرتے ہیں، یہ مُسلّمہ طور پر شر نہیں ہیں۔

اس کے بعد اس مطلب کی توضیح و تفسیر میں مزید کہتا ہے: " اور ہر مزاحمت کرنے والے موجود کے شر سے جب کہ وہ وارد ہوتا ہے" (ومن شرّ غاسق اذا وقب)۔

" غاسق " " غسق " (بروزن شفق) کے مادّہ سے " مفردات " میں " راغب " کے قول کے مطابق، رات کی ظلمت کی اس شدّت کے معنی میں ہے جو آدھی رات کے وقت ہوتی ہے، اسی لیے قرآن مجید نمازِ مغرب کے اختتام کے وقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : الیٰ غسق اللیل، اور یہ جو لغت کی بعض کتابوں میں " غسق " کی آغازِ شب کی تاریکی کے معنی میں تفسیر ہوئی ہے۔ بعید نظر آتا ہے، خصوصاً جب کہ اس کا اصلی ریشہ اور جڑ، امتلاء (پُر ہونے) اور بھنے کے معنی میں ہے، اور مسلمہ طور پر رات کی تاریکی اس وقت زیادہ یعنی پُر اور لبریز ہوتی ہے جب آدھی رات ہو جائے۔ اس کے مفاہیم میں سے ایک، جو اس معنی کا لازمہ ہے، ہجوم کرنا اور حملہ آور ہونا ہے، اس لیے یہ اس معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

اس بنا پر زیرِ بحث آیت میں " غاسق " کا معنی یا تو حملہ کرنے والا شخص ہے، یا ہر وہ شریر موجود ہے جو حملہ کرنے کے لیے رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھاتا ہے، کیونکہ نہ صرف درندے اور ڈنک مارنے والے جانور ہی رات کے وقت اپنے بلوں اور ٹھکانوں سے باہر نکل آتے ہیں، بلکہ شریر و ناپاک اور پلید افراد بھی اپنے بُرے مقاصد کے لیے عام طور پر رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

"وقب" (بروزن شفق) "وقب" (بروزن نقب) کے مادہ سے گڑھے اور خندق کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد اس کا فعل گڑھے میں داخل ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ گویا شریر اور نقصان پہنچانے والے موجودات رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے نقصان پہنچانے والے گڑھے کھود کر اپنے پلید اور گندے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اقدام کرتے ہیں۔ یا یہ ہے کہ یہ تعبیر "نفوذ کرنے" کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور ان کے شر سے جو گرہوں میں دَم کرتے ہیں"۔ (و من شرّ النفّاثات فی العقد)۔

"نفّاثات" "نفث" (بروزن حبس) کے مادہ سے اصل میں تھوڑی سی مقدار میں تھوکنے کے معنی میں ہے، اور چونکہ یہ کام پھونک مارنے کے ساتھ انجام پاتا ہے، لہٰذا "نفث" "نفخ" (پھونکنے اور دَم کرنے) کے معنی میں بھی آیا ہے۔

لیکن بہت سے مفسرین نے "نفاثات" کی "جادوگر عورتوں" کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ (نفاثات جمع مونث ہے اور اس کا مفرد "نفاثة" "نفث" کے مادہ سے صیغہ مبالغہ ہے) وہ عورتیں کچھ اوراد پڑھتی تھیں اور گرہوں پر دَم کیا کرتی تھیں اور اس طرح وہ جادو کرتی تھیں، لیکن کچھ لوگ اسے وسوسے پیدا کرنے والی عورتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو مسلسل مردوں کے، خصوصاً اپنے شوہروں کے کان بھرتی رہتی تھیں، تاکہ مثبت کاموں کے انجام دینے میں ان کے آہنی عزم کو کمزور کر دیں اور اس قسم کی عورتوں کے وسوسوں نے طول تاریخ میں کیسے کیسے حوادث پیدا کیے، کیسی کیسی آگ بھڑکائی، اور کیسے کیسے استوار و مضبوط اِرادوں کو کمزور کر کے رکھ دیا۔

"فخر رازی" کہتا ہے: عورتیں مردوں کے دلوں میں اپنی محبت کے نفوذ کی بنا پر تصرف کر لیتی ہیں[1]۔

یہ معنی ہمارے زمانہ میں ہر وقت سے زیادہ ظاہر ہے کیونکہ دنیا کے سیاست دانوں میں جاسوسوں کے نفوذ کرنے کا ایک اہم ترین ذریعہ جاسوسہ عورتوں سے فائدہ اُٹھانا ہے، کیونکہ ان "نفاثات فی العقد" کے ذریعے پوشیدہ بھیدوں کے صندوقوں کے تالے کھل جاتے ہیں اور وہ انتہائی مرموز اور پوشیدہ مسائل سے باخبر ہو جاتی ہیں، اور انہیں دشمن کے حوالے کر دیتی ہیں۔

بعض نے نفاثات کی "نفوسِ شریرہ" یا "وسوسے پیدا کرنے والی جماعتوں" کے ساتھ بھی تفسیر کی ہے جو اپنے مسلسل پروپیگنڈوں کے ذریعے پختہ اِرادوں کی گرہوں کو کمزور کر دیتے ہیں۔

بعید نہیں ہے کہ یہ آیت ایک عام اور جامع مفہوم رکھتی ہو جو ان تمام معانی کو شامل ہو، یہاں تک کہ سخن چینی کرنے والوں اور چغل خوروں کی باتوں کو بھی، جو محبت کے مراکز کو سُست، کمزور اور ویران کر دیتے ہیں۔

البتہ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ سابقہ شانِ نزول سے قطع نظر، آیت میں کوئی ایسی نشانی موجود نہیں ہے کہ اُس سے خصوصیت کے ساتھ جادوگروں کا جادو مُراد ہو اور بالفرض اگر ہم آیت کی اس طرح تفسیر بھی کریں، تو بھی یہ اس شانِ نزول کی صحت

---

[1] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۲ ص ۱۹۶

پر دلیل نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جادوگروں کے شر سے خدا کی پناہ مانگ رہے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح سے جیسے صحیح و سالم افراد سرطان کی بیماری سے پناہ مانگتے ہیں، چاہے وہ ہرگز بھی اس میں مبتلا نہ ہوئے ہوں۔

اس سورہ کی آخری آیت میں فرماتا ہے: اور ہر حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے" (ومن شرّ حاسد اذا حسد)۔

یہ آیت اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ حسد بدترین اور قبیح ترین صفاتِ رذیلہ میں سے ہے، کیونکہ قرآن نے اسے درندہ جانوروں، ڈسنے والے سانپوں اور وسوسے ڈالنے والے شیاطین کے کاموں کے ساتھ قرار دیا ہے۔

چند نکات

۱۔ شر و فساد کے اہم ترین سرچشمے

اس سورہ کے آغاز میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ وہ تمام شریر مخلوقات کے شر سے خدا کی پناہ مانگیں، اس کے بعد اس کی وضاحت میں تین قسم کے شروں کی طرف اشارہ کرتا ہے:

۱۔ اُن تاریک دل حملہ کرنے والوں کے شر سے جو تاریکیوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حملہ آور ہوتے ہیں۔

۲۔ ان وسوسہ پیدا کرنے والوں کے شر سے جو اپنی باتوں اور بُرے پروپیگنڈوں سے، ارادوں، ایمانوں، عقیدوں محبتوں اور رشتوں کو سُست اور کمزور کر دیتے ہیں۔

۳۔ اور حسد کرنے والوں کے شر سے۔

اس اجمال و تفصیل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شرور و آفات کا سرچشمہ یہی ہیں، اور شر و فساد کے اہم ترین منابع یہی تینوں ہیں۔ اور یہ بات بہت ہی پُر معنی اور قابلِ غور ہے۔

۲۔ آیات کا تناسب

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس سورہ کی پہلی آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ شر والی تمام موجودات کے شر سے "فلق" کے پروردگار سے پناہ مانگ: "ربّ فلق" کا انتخاب شاید اس بنا پر ہے کہ شریر موجودات سلامتی و ہدایت کے نور اور روشنی کو منقطع کر دیتے ہیں، لیکن فلق کا پروردگار ظلمتوں اور تاریکیوں کو شگافتہ کرنے والا ہے۔

۳۔ جادو کی تاثیر

ہم نے پہلی جلد میں، سورہ بقرہ کی آیہ ۱۰۲ و ۱۰۳ کے ذیل میں، گزشتہ اور موجودہ زمانہ میں جادو کی حقیقت

کے بارے میں، اور اسلام کی نظر میں جادو کے حکم، اور اس کے اثر کرنے کی کیفیت کے سلسلے میں تفصیلی بحث کی ہے۔ اور ان مباحث میں ہم نے جادو کی تاثیر کو اجمالی طور پر قبول کیا ہے، لیکن اس صورت میں نہیں، جیسا کہ خیالی پلاؤ پکانے والے، اور بیہودہ لوگ اس کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ زیادہ وضاحت کے لیے اسی بحث کی طرف رجوع کریں۔

لیکن وہ نکتہ جس کا ذکر کرنا یہاں ضروری ہے یہ ہے کہ اگر وہ زیرِ بحث آیات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم دے رہا ہے کہ جادوگروں کے جادو یا اس کے مانند چیزوں سے خدا کی پناہ مانگو تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ پیغمبرؐ پر انہوں نے جادو کر دیا تھا۔ بلکہ اس کی ٹھیک مثال یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر قسم کی غلطی اور خطا و گناہ سے بھی خدا کی پناہ مانگتے تھے۔ یعنی خدا کے لطف سے استفادہ کرتے ہوئے ان خطرات سے بچے رہیں۔ اور اگر خدا کا لطف نہ ہوتا تو آپ پر جادو کے اثر کرنے کا امکان تھا۔ یہ بات تو ایک طرف رہی۔

دوسری طرف ہم پہلے ہی یہ بیان کر چکے ہیں کہ اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ "النفاثات فی العقد" سے مراد جادوگر ہوں۔

۴۔ حاسدوں کا شر

"حسد" ایک بری شیطانی عادت ہے جو مختلف عوامل جیسے ایمان کی کمزوری، تنگ نظری اور بخل کی وجہ سے انسان میں پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا مطلب دوسرے شخص کی نعمت کے زوال کی درخواست اور آرزو کرنا ہے۔ حسد بہت سے گناہانِ کبیرہ کا سرچشمہ ہے۔

حسد، جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے، انسان کے ایمان کو کھا جاتا ہے اور اسے ختم کر دیتا ہے، جیسا کہ آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان الحسد لیأکل الایمان کما تأکل النار الحطب"[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے:

"آفة الدین الحسد والعجب والفخر"

"حسد" "خود کو بڑا سمجھنا" اور ایک دوسرے پر "فخر" کرنا، دین کے لیے آفت ہے۔[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ حسد کرنے والا حقیقت میں خدا کی حکمت پر اعتراض کرتا ہے کہ اس نے کچھ افراد کو نعمت سے کیوں نوازا ہے؟ اور انہیں اپنی عنایت کا مشمول کیوں قرار دیا ہے؟ جیسا کہ سورۂ نساء کی آیہ ۵۴ میں آیا ہے: ام یحسدون الناس علی ما اٰتاھم اللہ من فضلہ۔

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۷۳، ص ۲۳۷

[2] "بحار الانوار" جلد ۷۳، ص ۲۴۸

حسد کا معاملہ ممکن ہے کہ اس حد تک پہنچ جائے کہ محسود سے نعمت کے زوال کے لیے حاسد خود کو پانی اور آگ تک میں ڈال کر نابود کرلے، جیسا کہ اس کے نمونے داستانوں اور تواریخ میں مشہور ہیں۔

حسد کی مذمت میں بس یہی کافی ہے کہ دُنیا میں جو سب سے پہلا قتل ہوا وہ "قابیل" کی طرف سے "ہابیل" پر "حسد" کرنے کی وجہ سے ہوا تھا۔

"حسد کرنے والے" ہمیشہ ہی انبیاء و اولیاء کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے رہے ہیں، اسی لیے قرآن مجید پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ حاسدوں کے شر سے خدا اور ربّ فلق سے پناہ مانگیں۔

اگرچہ اس سورہ میں اور بعد والے سُورہ میں خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مخاطب ہے، لیکن مسلّمہ طور پر اس سے نمونہ اور اُسوہ مراد ہے، اور سب لوگوں کو حاسدوں کے شر سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

خداوندا! ہم بھی حاسدوں کے شر سے تیری مقدس ذات سے پناہ مانگتے ہیں۔

پروردگارا! ہم تجھ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ تُو ہمیں بھی دوسروں پر حسد کرنے سے محفوظ رکھ۔

بارِ الٰہا! ہمیں نفّاثات فی العقد اور راہِ حق میں وسوسے ڈالنے والوں کے شر سے بھی محفوظ رکھ۔

آمین یا ربّ العالمین

اختتام سُورۂ فلق

❖ ❖ ❖

سُورَۂ اَلنَّاس

❖ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا۔

❖ اِس میں ۶ آیات ہیں۔

سُورۂ "النّاس" کے مطالب اور اس کی فضیلت

اِنسان ہمیشہ انسانی وسوسوں کی زد میں ہے اور شیاطینِ جن و انس کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ اس کے قلب و رُوح میں نفوذ کریں۔ انسان کا مقام علم میں جتنا بالا ہوتا جاتا ہے اور اس کی حیثیت اجتماع اور معاشرے میں جتنی بڑھتی جاتی ہے شیاطین کے وسوسے اتنے ہی زیادہ شدید ہوتے چلے جاتے ہیں، تاکہ اس کو راہِ حق سے منحرف کردیں اور ایک دانش وَر عالِم کے فساد و خرابی سے سارے جہان کو تباہ و برباد کر ڈالیں۔

یہ سُورہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک نمونہ و اُسوہ کے طور پر اور پیشوا و رہبر کی حیثیت سے یہ حکم دے رہی ہے کہ تمام وسوسے ڈالنے والوں کے شر سے خدا کی پناہ طلب فرمائیں۔

اِس سُورہ کے مطالب ایک لحاظ سے سُورۂ " فلق " سے مشابہ ہیں، اور دونوں میں ہی شرور و آفات سے خداوندِ بزرگ کی پناہ مانگنے کو بیان کیا گیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ سُورۂ فلق میں شرور کے مختلف انواع و اقسام بیان کیے گئے ہیں، لیکن اس سُورہ میں صرف نظر نہ آنے والے وسوسہ گروں (وسواس الخنّاس) پر تکیہ ہوا ہے۔

اس بارے میں بھی کہ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا ہے یا مدینہ میں، مفسّرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ اسے "مکّی" سمجھتا ہے جب کہ دُوسری جماعت اسے "مدنی" شمار کرتی ہے۔ لیکن اس کی آیات کا لب و لہجہ "مکّی" سُورتوں سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ روایات کے مطابق یہ سُورہ اور سُورۂ فلق اکٹھے نازل ہوئے ہیں، اور سُورۂ فلق ایک کثیر جماعت کے نظریہ کے مطابق مکّی ہے چنانچہ بہت ممکن ہے کہ یہ سُورہ مکّی ہی ہو۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ ایک

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت بیمار پڑ گئے تو (خدا کے دو عظیم فرشتے) جبرئیل و میکائیل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے۔ جبرئیل تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر کی طرف بیٹھ گئے اور میکائیل پاؤں کی طرف۔ جبرئیل نے سورہ "فلق" کی تلاوت کی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے ذریعے خدا کی پناہ میں دے دیا اور میکائیل نے سورہ "قل اعوذ برب الناس" کی تلاوت کی۔[1]

ایک روایت میں جو امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی اور ہم اس کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، یہ آیا ہے کہ:

"جو شخص نمازِ وتر میں "معوذتین" (سورۂ فلق و ناس) اور "قل ھو اللہ احد" کی تلاوت کرے گا تو اس سے کہا جائے گا، اے بندۂ خدا! تجھے بشارت ہو کہ خدا نے تیری نمازِ وتر کو قبول کر لیا ہے۔"

❖ ❖ ❖

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵، ص ۷۶۴ و "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۵۶۹۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ
۲۔ مَلِكِ النَّاسِ ۙ
۳۔ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ
۴۔ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۙ
۵۔ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ
۶۔ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۧ

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ کہہ دیجیے میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔
۲۔ لوگوں کے مالک و حاکم کی۔
۳۔ لوگوں کے خُدا اور معبُود کی۔
۴۔ خنّاس کے وسوسوں کے شر سے
۵۔ جو انسانوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔
۶۔ چاہے وُہ جنّات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

تفسیر

لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں

اس سُورہ میں ، جو قرآن مجید کا آخری سُورہ ہے، لوگوں کے لیے نمونہ اور پیشوا ہونے کے لحاظ سے خُود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رُوئے سُخن کرتے ہوئے فرماتا ہے : " کہہ دیجئے ، میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں". (قل اعوذ برب الناس) .

" لوگوں کے مالک و حاکم کی " (ملک الناس) .

" لوگوں کے خدا و معبُود کی " (الٰہ الناس) .

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں خدا کے عظیم اوصاف میں سے تین اوصاف (ربوبیت، ملکیت اور الوہیت) کا ذکر ہوا ہے جو سب کی سب براہِ راست انسان کی تربیت اور وسوسے ڈالنے والوں کے چنگل سے نجات کے ساتھ ارتباط رکھتی ہیں۔

البتہ خدا سے پناہ مانگنے سے مُراد یہ نہیں ہے کہ انسان صرف زبان سے یہ جُملہ کہے ، بلکہ فکر و نظر اور عقیدہ و عمل کے ساتھ بھی انسان خُود کو خدا کی پناہ میں قرار دے۔ شیطانی راستوں ، شیطانی پروگراموں ، شیطانی افکار و تبلیغات ، شیطانی مجالس و محافل سے خُود کو دُور رکھے ، اور رحمانی افکار و تبلیغات کے راستے کو اختیار کرے۔ ورنہ وُہ انسان جو عملی طور پر ان وسوسوں کے طوفان میں ٹھہرا رہے گا وہ صرف اس سُورہ کے پڑھنے اور ان الفاظ کے کہنے سے کہیں نہیں پہنچے گا۔

وہ " ربّ الناس "، کہنے کے ساتھ پروردگار کی ربوبیت کا اعتراف کرتا ہے اور خُود کو اس کی تربیت میں قرار دیتا ہے۔

" ملک الناس " کہنے سے خُود کو اس کی ملکیت سمجھتا ہے اور اس کے فرمان کا بندہ ہو جاتا ہے۔

اور " الٰہ الناس " کے کہنے سے اس کی عبودیت کے راستہ میں قدم رکھ دیتا ہے اور اس کے غیر کی عبادت سے پرہیز کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ جو شخص ان تینوں صفات پر ایمان رکھتا ہو اور خُود کو ان تینوں کے ساتھ ہم آہنگ کرلے ، وہ وسوسہ ڈالنے والوں کے شر سے امان میں رہے گا۔

درحقیقت یہ تینوں اوصاف تین اہم تربیتی درس ، پیش رفت کے تین پروگرام اور وسوسے ڈالنے والوں کے شر سے نجات کے تین ذریعے ہیں اور یہ سُورہ انسان کا ان کے مقابلہ میں بیمہ کر دیتا ہے۔

اسی لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے : " وسوسے ڈالنے والے خنّاس کے شر سے " (من شرّ الوسواس الخنّاس)۔

" وہی جو انسانوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتے ہیں " (الّذی یوسوس فی صدور النّاس) ۔
" جنّوں اور انسانوں میں سے وسوسے ڈالنے والے " (من الجنّة والنّاس) ۔

" وسواس " کا لفظ " مفردات " میں " راغب " کے قول کے مطابق اصل میں ایسی آہستہ آواز ہے جو آلاتِ زینت کے آپس میں ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے ۔

اس کے بعد ہر آہستہ آواز پر بولا جانے لگا اور اس کے بعد ایسے نامطلوب اور بُرے افکار و خیالات پر جو انسان کے دل و جان میں پیدا ہوتے ہیں ، اور ایسی آہستہ آواز کے مشابہ جو کان میں کہی جاتی ہے ، اطلاق ہوا ہے ۔

" وسواس " مصدری معنی رکھتا ہے ، لیکن بعض اوقات " فاعل " (وسوسہ ڈالنے والا) کے معنی میں بھی آتا ہے اور زیرِ بحث آیت میں یہی معنی ہے ۔

" خنّاس " " خنوس " (بروزن خسوف) کے مادہ سے ، صیغہ مبالغہ ہے ، جو جمع ہونے اور پیچھے جانے کے معنی میں ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خدا کا نام لیا جاتا ہے تو شیاطین پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور چونکہ یہ کام پنہاں ہونے کے ساتھ توام ہے ، لہٰذا یہ لفظ " اختفاء " کے معنی میں بھی آیا ہے ۔

اس بنا پر آیات کا مفہوم اس طرح ہوگا : " کہہ دیجئے میں شیطان صفت وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو خدا کے نام سے بھاگتا ہے اور پنہاں ہو جاتا ہے ، خدا کی پناہ مانگتا ہوں " ۔

اصولاً " شیاطین " اپنے پروگراموں کو چھپ کر کرتے ہیں اور بعض اوقات انسان کے دل کے کان میں اس طرح سے پھونک مارتے ہیں کہ انسان یہ یقین کر لیتا ہے کہ یہ فکر خود اسی کی فکر ہے اور خود اسی کے دل میں خود بخود پیدا ہوئی ہے ، اور یہی بات اس کے بھٹکنے اور گمراہی کا سبب بن جاتی ہے ۔

شیاطین کا کام زینت دینا ، باطل کو حق کے لعاب میں چھپانا ، جھوٹ کو سچ کے چھلکے میں لپیٹ کر گناہ کو عبادت کے لباس میں اور گمراہی کو ہدایت کے سرپوش میں پیش کرنا ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ خود بھی مخفی ہوتے ہیں اور ان کے پروگرام بھی پنہاں ہوتے ہیں ، اور یہ راہِ حق کے ان تمام رہ روؤں کے لیے ایک تنبیہ ہے جو یہ توقع نہیں رکھتے کہ شیاطین کو ان کے اصلی چہرے اور قیافہ میں دیکھیں یا ان کے پروگراموں کو انحرافی شکل میں مشاہدہ کریں ۔ سوچنے کی بات ہے ، وسوسے ڈالنے والے خنّاس ہوتے ہیں اور ان کا کام چھپانا ، جھوٹ بولنا ، دھوکہ دینا ، ریاکاری کرنا ، ظاہر سازی اور حق کو پوشیدہ کرنا ہے ۔

اگر وہ اصلی چہرے میں ظاہر ہو جائیں ، اگر وہ باطل کو حق کے ساتھ نہ ملائیں ، اگر وہ صریح اور صاف بات کریں تو علی علیہ السلام کے قول کے مطابق لم یخف علی المرتادین : خدا کی راہ پر چلنے والوں پر مطلب مخفی نہ رہتا ۔

وہ ہمیشہ کچھ حصّہ تو " اِس " سے لیتے ہیں ، اور کچھ حصّہ " اُس " سے ، اور انہیں آپس میں ملا دیتے ہیں ، تاکہ لوگوں پر مسلط ہو سکیں ، جیسا کہ امیرالمومنین علیہ السلام اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں : فھنالک یستولی الشیطان علی اولیائہ " [1]

---

[1] " نہج البلاغہ " خطبہ ۵۰

"الذی یوسوس فی صدور الناس" کی تعبیر، اور لفظ "وسوسہ" کا انتخاب، اور لفظ "صدور" (سینے) بھی اسی معنی کی تاکید ہیں۔

یہ سب کچھ تو ایک طرف، دوسری طرف سے "من الجنۃ والناس" کا جملہ خبردار کرتا ہے کہ "وسوسے" میں ڈالنے والے خناس، صرف ایک ہی گروہ، ایک ہی جماعت، ایک ہی طبقہ، اور ایک ہی لباس میں نہیں ہوتے، بلکہ یہ جن و انس میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہر لباس اور ہر جماعت میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان سب پر نظر رکھنی چاہیئے اور ان سب کے شر سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

نامناسب دوست، منحرف ہم نشین، گمراہ اور ظالم پیشوا، جبار اور طاغوتی کارندے، فاسد مقررین اور لکھنے والے، ظاہر فریب الحادی و التقاطی مکاتب اور اجتماعی طور پر وسوسے ڈالنے والوں کے وسائل ارتباط وغیرہ سب کے سب "وسواس خناس" کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں کہ جن کے شر سے انسان کو خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

چند نکات

۱۔ ہم خدا کی پناہ کیوں مانگتے ہیں؟

انسان کے لیے ہر لمحہ انحراف کا امکان موجود ہے اور اصولی طور پر جب خدا اپنے پیغمبر کو یہ حکم دے رہا ہے کہ "وسواس خناس" کے شر سے خدا کی پناہ مانگیں، تو یہ خناسوں اور وسوسہ ڈالنے والوں کے دام فریب میں گرفتار ہونے کے امکان کی دلیل ہے۔

باوجود اس کے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لطف الٰہی، غیبی امدادوں اور اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنے کی بنا پر ہر قسم کے انحراف سے محفوظ تھے، لیکن پھر بھی وہ ان آیات کو پڑھتے تھے اور ان کے ذریعے وسواس خناس کے شر سے پناہ مانگتے تھے۔ ان حالات میں دوسروں کا معاملہ واضح و روشن ہے۔

لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ان مخرب وسوسہ ڈالنے والوں کے مقابلہ میں مومن بندوں اور راہِ حق کے رہروؤں کی مدد کے لیے آسمانی فرشتے آتے ہیں۔ ہاں! مومن تنہا نہیں ہیں، فرشتے ان پر نازل ہوتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں": ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ "(حٰم سجدہ۔ ۳۰)

لیکن بہرحال مغرور ہرگز نہیں ہونا چاہیئے، اور خود کو موعظ و پند و نصائح اور خدائی امدادوں سے بے نیاز نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ ہمیشہ اس سے پناہ مانگنی چاہیئے اور ہمیشہ بیدار اور ہوشیار رہنا چاہیئے۔

۲۔ اس بارے میں کہ تین آیات میں "ناس" کا تکرار کیوں ہوا ہے؟ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ہر مقام پر الگ الگ معنی ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ خدا کی ان تین صفات کی عمومیت کی تاکید کے لیے ہے اور تینوں مقام پر ایک ہی

معنی رکھتا ہے۔

۳۔ ایک روایت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیا ہے:

"ما من مؤمن الا ولقلبه فی صدره اذنان: اذن ینفث فیها الملك واذن ینفث فیها الوسواس الخناس فیؤید الله المؤمن بالملك فهو قوله سبحانه: وایده بروح منه:

"ہر مومن کے دل میں دو کان ہوتے ہیں، ایک کان میں تو فرشتہ پھونک مارتا ہے اور دوسرے کان میں وسواس خناس پھونک مارتا ہے۔ پس خدا مومن کی فرشتہ کے ذریعے تائید فرماتا ہے۔ اور آیہ "وایدہ بروح منہ" کا مطلب یہی ہے"۔[1]

ایک لرزہ خیز اور پُرمعنی حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیا ہے کہ:

"جب آیہ والذین اذا فعلوا فاحشة او ظلموا انفسهم ذکروا الله فاستغفروا لذنوبهم: "وہ لوگ جو کبھی کوئی بُرا کام انجام دیتے ہیں، یا خود اپنے اُوپر ظلم کرتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے ہیں، اور اپنے گناہوں کے لیے استغفار کرتے ہیں) نازل ہوئی، تو ابلیس مکہ میں ایک پہاڑ کے اُوپر گیا اور اُونچی آواز کے ساتھ فریاد بلند کی اور اپنے لشکر کے سرداروں کو جمع کیا۔

اُنہوں نے کہا: اے آقا! کیا ماجرا ہے، آپ نے ہمیں کیوں بُلایا ہے۔؟

اس نے کہا: یہ آیت نازل ہوئی ہے (اس آیت نے میری کمر میں لرزہ پیدا کر دیا ہے اور یہ آیت نجاتِ بشر کا باعث) تم میں سے کون ہے جو اس کا مقابلہ کرے؟

بزرگ شیطانوں میں سے ایک نے کہا: مَیں ایسا کر سکتا ہوں، میرا منصوبہ یہ ہے۔

ابلیس نے اس کے اس منصوبہ کو ناپسند کر دیا! تو دُوسرا کھڑا ہوا اور اس نے اپنا منصوبہ پیش کیا، لیکن یہ بھی قبول نہ کیا گیا۔

اس موقع پر "وسواس خناس کھڑا ہوا اور اس نے کہا: مَیں اس کام کو انجام دوں گا۔

ابلیس نے کہا: وہ کیسے؟

اس نے کہا: میں انہیں وعدوں اور آرزوؤں میں سرگرم کر دوں گا، یہاں تک کہ وہ گناہ میں آلودہ ہو جائیں گے۔ جب وہ گناہ کر لیں گے تو میں انہیں توبہ کرنا بُھلا دوں گا۔

ابلیس نے کہا: تُو اس کام سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ (تیرا منصوبہ بہت ماہرانہ اور عالی ہے) اور یہ کام قیامت

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰، ص ۵۷۱

تک اس کو سپرد کر دیا۔[1]

خداوندا! ہمیں ان سب وسوسہ ڈالنے والوں کے شر سے اور خناس کے تمام وسوسوں سے محفوظ فرما۔

پروردگارا! دامِ فریب سخت ہے، اور دشمن بیدار اور اس کے منصوبے مخفی اور پنہاں ہیں اور تیرے لطف کے بغیر نجات ممکن نہیں ہے۔

بارِ الٰہا! ہم نہیں جانتے کہ اس عظیم نعمت کا شکر تیری بارگاہ میں کس طرح پیش کریں کہ تُو نے ہم پر یہ احسان کیا ہے اور ہمیں یہ عظیم افتخار اور توفیق عطا فرمائی ہے کہ ہم نے اس وقت تقریباً پندرہ سال کے بعد اس تفسیر کو مکمل کر دیا ہے۔

خدایا! تو جانتا ہے کہ اس لمحہ ایک ایسی ناقابلِ توصیف خوشی اور شکر کے ساتھ ملی ہوئی شادمانی ہمارے سارے وجود میں موجزن ہے، ایسا احساس جس کی کسی بیان کے ساتھ تشریح اور اس کے شکر کی ہم میں توانائی نہیں ہے، ہم تیری بارگاہ میں ہاتھ اُٹھا کر دعا کرتے ہیں۔

آفریدگارا! ممکن ہے ہم سے ان آیات کی تفسیر میں کچھ لغزشیں ہو گئی ہوں، تو وہ سب ہمیں بخش دے اور ہم اُمید رکھتے ہیں کہ تیرے بندے بھی ہمیں بخش دیں گے۔

اور آخری جملہ میں ہم یہ عرض کرتے ہیں:

اے خدائے رحیم و مہربان! اپنے کرم سے یہ ناچیز خدمت ہم سب سے قبول فرمالے اور اسے ہماری معاد اور روزِ جزا کا ذخیرہ قرار دے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

سورۃ الناس اور جلد ۲۷ کا اختتام

در تاریخ ۱۴/۴/۱۳۶۶

مطابق آٹھ ذیقعد ۱۴۰۷ قمری

تفسیر نمونہ ختم شد

خداوندا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تُو نے اس حقیر پُرتقصیر کم علم و عقل کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ تقریباً چھ سال کے عرصہ میں اس تفسیر کا ترجمہ، جو قم مقدس میں شروع ہوا تھا، اور قم ہی میں اپنے مکان پر بروز بدھ بوقت صبح دس بجکر نو منٹ پر بتاریخ ۹ شوال ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۹۸۸ء اختتام پذیر ہوا۔ خداوندا! ممکن ہے مجھ سے کچھ فروگزاشتیں ہو گئی ہوں تو انہیں معاف فرمادے، اور اپنی بارگاہ میں اسے قبول فرما اور میری اور میرے والدین کی آخرت کے لیے اسے ذخیرہ قرار دے اور مومنین اور اہلِ اسلام کو اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی توفیق عنایت فرما، والحمد للہ اولاً و آخراً و صلی اللہ علیٰ محمد و آلہ

احقر صفدر حسین
۸۸-۵-۲۵

---

[1] "المیزان" جلد ۲۰، ص ۵۵۷)

تفسیر نمونہ میں اجتماعی کام کا طریقہ

مختلف طبقات کے تفسیر نمونہ کے بہت سے قارئین یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس تفسیر میں کام کا طریقہ کس طرح تھا اور دس افراد کا گروہ (اور کبھی اس سے کم) تقریباً ۱۵ سال تک اُستاد کے زیر نظر کیسے آپس میں ہم آہنگ اور مسلسل کوشش کرتے رہے۔ شاید اس پروگرام کی تفصیل دوسرے علمی اجتماعی کاموں کی پیش رفت میں مدد کر سکے۔

اصولی طور پر یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وسیع اور جامع کام انفرادی قوت سے بہت کم آگے بڑھتے ہیں اور اگر آگے بڑھیں بھی تو اس کے لیے بہت طولانی وقت کی ضرورت ہے۔ لیکن گروہی اور اجتماعی کام زیادہ تیز بھی ہوتے ہیں اور زیادہ عمیق اور گہرے، اور خطا و غلطی سے دُور بھی۔ اگرچہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ماحول میں گروہی اور اجتماعی کام بہت ہی کم انجام پاتا ہے اور اگر انجام پائے بھی تو عام طور پر بہت کم تکمیل کو پہنچتا ہے۔ جب کہ دوسرے لوگوں میں تقریباً تمام کاموں کی بنیاد گروہی اور اجتماعی کام پر قائم ہوتی ہے اور انہوں نے اس سے بہت سے نتائج اخذ کیے ہیں۔

بہرحال ہدف و مقصد یہ نہیں ہے کہ تفسیر نمونہ کے کام کے شروع کرنے کے اسباب کی تشریح کی جائے، کیونکہ اس تفسیر کی مختلف جلدوں کے مقدموں میں اس سلسلہ میں کافی گفتگو ہو چکی ہے، بلکہ ہدف و مقصد یہ ہے کہ اس تفسیر کے لکھنے کا طریقہ اور طرزِ عمل بیان کیا جائے۔ شاید برادرانِ اہلِ علم اور محققینِ اسلامی، جو گروہی کام انجام دینے کی طرف مائل ہوں، وُہ اس تجربہ سے اپنے کاموں میں فائدہ اُٹھا سکیں اور مسائلِ اسلامی کو زیادہ جامع صورت میں ہمارے معاشرے کے سامنے، جو اس کے لیے بہت زیادہ تشنگی رکھتا ہے، پیش کر سکیں۔

اِس تفسیر میں طریقہ کار اور طرزِ عمل کا کئی مراحل میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ **تقسیم آیات**: اس مرحلہ میں اُستادِ گرامی قدر اور محقق توانا آیات کو برادران میں تقسیم کر دیتے اور ہر ایک کا حصّہ قرآن مجید کے ایک سے دو صفحات تک جا پہنچتا اور ہر جلد کے لیے یہ تقسیمِ آیات کئی مرتبہ صورت پذیر ہوتی ہے، اور اس طرح سے ہر شخص کی ذمّہ داری معیّن ہو جاتی ہے۔

۲۔ **انفرادی کام کا مرحلہ**: تقسیمِ آیات کے بعد ہر شخص (اور ابتداء میں دو دو افراد مل کر کام کرتے) کی یہ ذمّہ داری ہوتی تھی کہ وہ اسلام کے بزرگ علماء کی ان مختلف تفاسیر کو جو وُہ یادگار کے طور پر چھوڑ گئے ہیں۔ چاہے وہ شیعہ ہوں یا اہلِ سنّت ــ تحقیق و مطالعہ کرے اور کافی مطالعہ کے بعد اپنے حاصلِ مطالعہ اور ان سے اخذ کردہ

نتائج کو خاص قسم کے کاغذوں پر — جن پر " حلیہ تفسیر " کا عنوان چھپا ہوا ہوتا تھا — لکھ کر حا کے حوالے کرے۔
وہ تفاسیر جن کا مطالعہ کیا جاتا تھا عام طور پر وہ وہی ہوتی تھیں جن کے نام ہر جلد کے آغاز میں لکھے گئے ہیں، اور بعض اوقات دوسری تفاسیر بھی ہوتی تھیں۔

۳۔ **مشترک جلسہ میں مطالعہ** : روزانہ حضرت استاد اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ ایک جلسہ منعقد ہوتا تھا اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان جلسوں میں کسی قسم کی کوئی تعطیل نہیں ہوتی تھی اور یہ سارے سال میں بغیر استثناء کے منعقد ہوتے تھے، یہاں تک کہ مخصوص سوگواری اور تعطیلی دنوں میں بھی (سوائے اس صورت کے کہ کوئی مسافرت پیش آجائے) یہاں تک کہ ان دنوں میں بھی جب اُستاد " مہاباد " اور " انارک نائین " میں اژیم طاغوت کے زمانہ میں جلا وطن تھے، تفسیر کا کام معطل نہیں ہوا اور ساتھی باری باری (ہر دس دن میں دو افراد) کام کو جاری رکھنے کے لیے جلاوطنی کے مقام کی طرف سفر کرتے تھے اور صبح اور عصر کے وقت بحثِ تفسیر کو جاری رکھتے تھے۔

بہرحال مشترک جلسہ میں شرکاء جلسہ اپنی باری کے مطابق اپنی تحریر کی قرأت کرتے تھے۔

۴۔ **آیات کی تفسیر میں اجتماعی غور و خوض** : مذکورہ تحریروں کی قرأت کے بعد حضرت استاد آیات کے حساس نکات کی طرف — جن پر غور کرنا ضروری ہوتا — توجہ فرماتے اور تمام ساتھیوں کی یہ ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ زیرِ بحث آیات کے خاص حساس نکات یا مبہم اور پیچیدہ مطالب کو مختلف اسلامی تفاسیر میں — جو اس مجلس میں ان کے پاس ہوتی تھیں — ملاحظہ کرکے بیان کریں اور اگر انہیں کوئی اور نیا اور عمدہ نکتہ ملے تو اُسے پڑھیں یا اس کا خلاصہ بیان کریں اور اس طرح سے ہر آیت اور ہر نکتہ پر کافی غور و بحث ہوتی تھی۔ لیکن جن باتوں میں اختلاف ہوتا تھا اُن میں اُستاد کے نکتہ نظر کو مقدم رکھا جاتا تھا۔

۵۔ **مطالب کا اِملاء اور ان کی تحریر** : اس مرحلہ کے بعد مطالب کو لکھنے کی نوبت آتی تھی۔ اس موقع پر حضرت اُستاد زیرِ بحث مطالب کو اپنے نظریات اور ان یادداشتوں کے ساتھ، جو انہوں نے پہلے سے تیار کرکے رکھی ہوئی ہوتی تھیں، ملا کر انہیں جلسہ تفسیر کے مخصوص کاغذوں پر ایک تیز نویس برادر کے ذریعے لکھواتے۔ (حقیقت میں انشاء اور قلم انہیں کا ہوتا تھا۔

اوسطاً روزانہ تقریباً چار صفحے لکھے جاتے تھے (البتہ گرمیوں اور تعطیل کے دنوں میں جب ایک سے زیادہ جلسے ہوتے تھے، یہ مقدار دس صفحات یا اس سے کچھ زیادہ تک پہنچ جاتی تھی)۔

۶۔ **تصحیح اور تحقیق و مطالعہ** : یہ بات واضح ہے کہ جلسہ میں املا چاہے جتنے غور اور مہارت سے ہو اس کی مکمل طور پر تحریر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا حضرتِ اُستاد اِن تحریروں کو دوبارہ خود پڑھتے تھے اور اس میں ہر قسم کی ضروری اصلاح اور کمی بیشی عمل میں لاتے تھے۔

۷۔ **آیات کا ترجمہ** : جیسا کہ آپ تفسیر میں ملاحظہ فرماتے ہیں آیات کے بعد ترجمہ حروف ریز کے ساتھ آیا ہے

اور پھر آیات کی تفسیر بیان ہوئی ہے۔

آیات کا ترجمہ حضرتِ اُستاد خُود تحریروں کو دوبارہ پڑھنے اور تصحیح کرنے کے بعد لکھتے تھے، تاکہ ترجمہ مکمل طور پر تفسیرِ آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور مطالعہ کرنے والے ترجمہ کے مطالعہ سے آیات کی اس تفسیر کو جو جمع بندی کے بعد انتخاب ہوئی ہے سمجھ سکیں اور جو لوگ یہ چاہتے ہوں کہ صرف قرآن کے ترجمہ سے استفادہ کریں تو خالص ترجمہ بغیر کسی زحمت کے ان کے اختیار میں ہو۔

۸۔ **چھپائی کے لیے حروف چینی کا مرحلہ** : اَب تفسیر کے مطالب چھاپنے کے لیے تیار ہیں، مطالب کی فوٹو کاپی لینے کے بعد چھاپنے اور نشر کرنے کے مسئول کے حوالے کر دی جاتی، (فوٹو کاپی اس لیے لی جاتی ہے کہ اگر کوئی چیز گُم ہو جائے، تو دوبارہ اسے فراہم کرنے کے لیے دردسری نہ ہو۔ علاوہ ازیں فوٹو کاپی کے تمام مجلدات ایک خطی مجلد کے طور پر خوبصورت قسم کی جلد کر کے مدرسہ امیرالمومنین کے کتاب خانہ میں خاص طور پر تفسیر کی اصلی سند کے عنوان سے محفوظ کر لی جاتی ہے)۔

مسئول چاپ و نشر بھی اُسے دقت و باریک بینی کے ساتھ پڑھتا ہے تاکہ اگر کوئی سوال یا ابہام اس نسخہ میں اس کی نظر میں آئے تو حضرتِ اُستاد کے سامنے پیش کر دے۔

۹۔ **آخری تصحیح** : حروف چینی اور مقدماتی چھاپ کے بعد ایک نسخہ تصحیح اور مدارک کے ساتھ مقابلہ کے لیے جلسہ تفسیر میں بھیجا جاتا ہے اور نئے سرے سے کنٹرول کے لیے جلسہ کے شرکاء میں تقسیم ہو جاتا ہے، تاکہ ہر ایک اپنے حصّہ کو اچھی طرح سے دیکھ لے اور اگر مطلب یا کوئی مدرک غلط ہو تو اس کی اصلاح کریں اور اگر کسی بات میں ان کو شک ہو تو اس پر نشان لگا دیں اور فہرست کو بھی تیار کر کے سب کچھ اُستاد کے حوالے کر دیں۔

۱۰۔ **مکرر غور و مطالعہ** : اُستاد ایک مرتبہ پھر غلطیوں کی اصلاح کے بعد اسے اور فہرست کو کنٹرول کرتے اور اگر بعض مطالب میں کچھ ابہام ہوتا تو اصلاح کرتے اور ضروری اصلاح کے بعد چھاپنے کی اجازت دے دیتے اور مسئول چاپ اسے چھاپ کر ملک کے نشر و اشاعت کے مراکز میں بھیج دیتے۔

اس کے باوجود چونکہ یہ ایک وسیع کام ہے اور انسان بہرحال جائز الخطا ہے، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ چھپائی میں غلطیاں ہو گئی ہوں، یا اتفاقیہ بعض آیات یا مطالب میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو عام طور پر فاضل قارئین اس کی طرف توجہ دلا دیتے اور دفتر کو لکھتے، ایسے تمام خطوط اور اصلاحی نظریات ایک فائل میں جمع کیے جاتے تاکہ دوسری مرتبہ چھپائی کے موقع پر اس پر توجہ دی جائے اور اگر خطوں میں کوئی ایسا اعتراض ہو جو وارد نہ ہوتا ہو تو خط کے جواب میں غلط فہمی کو رفع کر دیا جاتا ہے۔

اور اسی وجہ سے یہاں پھر ایک مرتبہ تمام قارئینِ محترم اور صاحبانِ نظر سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ اگر مطالعہ کے بعد کسی حصّہ میں کوئی غلطی نظر آئے تو مضائقہ نہ کریں اور ہمیں لکھیں اور مطمئن رہیں اگر وہ اعتراض صحیح ہوا تو نہ صرف بلا تعصب اس کی اصلاح کر دی جائیگی بلکہ اس عظیم کام کی تکمیل میں ہمکاری کرنے کی بنا پر ہم ممنون و متشکر بھی ہوں گے۔

هیئت همکاران تفسیر نمونه

کلامِ حق تفسیر نمونہ کے ذریعے جلوے دکھاتا ہے

شہرستان فسا کے برادر آقای " احمد شریعتی " کے اشعار بدیع ۔
ان کے اشعار کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی چونکہ وہ بہت زیادہ تعریف اور اظہارِ محبت پر مشتمل تھے لہٰذا انہیں مصلحتاً مختصر کرکے نقل کیا جاتا ہے، ان کے شکریہ کے ساتھ :۔

آن زمان کز ترکش جہل و ضلال و بُت پرستی
نسلِ آدم را بدل بنشستہ ، صد تیر نمونہ

سرنگوں در چاہ عصیاں و اسیر جاہلیت
در تلاشِ حضر گور خود بہ تحقیر نمونہ

ماندہ تنہا از کتاب انبیا برگی محرف
صدق و عدل و مردمی پامال تزویر نمونہ

راستی در کاستی ، کذب و رذائل در فزونی
قلب ہا را دست شیطان کردہ تسخیر نمونہ

باسر انگشت جہالت ، پارہ منشور عدالت
رُوحِ انسانیت از ہر در بہ تحقیر نمونہ

بر نجاتِ آدمی از تنگنای ایں مصیبت
عاملی بایست پر قدرت بہ تاثیر نمونہ

خوش بیاباں آمد از الطافِ حق دوران فترت
فطرتِ انسان شگو فاشد بہ تفجیر نمونہ

فجر صادق بر دمید و شد ہمہ آفاق روشن
صفحۂ گیتی منوّر شد بہ تنویر نمونہ

آدمی را خود بکف منشور آزادی کہ آمد
خوش بر او نازل ہمی فرمان تحریر نمونہ

تا کلام اللہ اعظم بر رسولِ اللہ اکرم
از مقامِ وحی نازل شد به تقریر نمونه

نغمۂ جان بخش جاء الحق رسید از حق سبحان
مژده ها بخشید عالم را به تبشیر نمونه

نور و قرآن و کتاب آورد و برهان بر خلائق
آدمی را مکرمت بخشید و توقیر نمونه

وه که الباد حیاتِ آدمی در برگرفته
بطن در بطن کلامِ حق به تدبیر نمونه

چون کتاب امر و تدوین از کتاب خلق تکوین
هست یک فهرست نام آور به تعبیر نمونه

خود بقرآن مُبین مطرح بود با استقامت
حرف حرف عالمِ خلقت به تجهیز نمونه

با دو علم از چهرهٔ تکوین و تدوین پرده گیر
آدمی دانای کار آمد به تشمیر نمونه

❖

علم در موضوع تکوین خارج از گفتارِ حاضر
باید از تدوین سُخن گفتن به تیسیر نمونه

علم تفسیر است کز چهر عروس علوی ما
پرده برگیرد پیاپی خود به تکریر نمونه

وز همان روز نخستین نزول وحی آمد
واجب و لازم بر آن تفسیر و تبصیر نمونه

هر کسی چندان که در تاب و توان ذاتی او
بوده و باشد، قلم در کف به تسطیر نمونه

بادجود این تنوع در تفاسیری که دائم
با زبان مختلف در حال تکثیرِ نمونه

مقتضای عصرِ حاضر در مقامِ ارزیابی
بود تفسیری ثمین با عرض تسعیر نمونه

تا نمونه آید از هر بعد و باب و درک دیدی
وز همه گلها گلی باشد به تعطیرِ نمونه

در هزار و سیصد و پنجاه و دو تفسیر قرآن
با چنین وضع و شرایط دید تصویرِ نمونه

این مهم را خوش تکفل کرده با عزمی توانا
جمعی از فرزانگان عصر و تحریر نمونه

جمله از قرآن شناسان جامع فضل و "مکارم"
"ناصر دین" با چنین مجمع به تنصیر نمونه

پانزده سال از شروع کار بگزشت و برآمد
ماه "تفسیر نمونه" با چه تحریر نمونه

راستی کاین گل ز هر باغی نمونه زانکه داد
خوبی خوبان همه در حد تحصیر نمونه

هست انموذج ز هر تفسیر و خود بالنفس قائم
آفرین بر این "اثر" وین طرزِ تاثیر نمونه

با زبان روز و علم روز و بحث روز دارد
مردم امروز را تبشیر و تنذیر نمونه

با بیانی روشن و امثال روشن فکر روشن
رهروان را راه آسان شد به تیسیر نمونه

در نکات مجملش بنهفته صد باب مفصل
کز نمودار زمان بنموده تصویر نمونه

از دل ناپاک مفرض، هر تعارض هر نشانه
برگرفته سخت و محکم، کرده تطهیر نمونه

نیک بایی و نیکیها خود بر این تفسیر شاید
نام (تفسیر نمونه) ده چه تعبیر نمونه

"جلوه ها دارد کلام حق به تفسیر نمونه"[1]

---

[1] قابل توجه بات یہ ہے کہ آخری مصرع تکمیل تفسیر کا مادہ تاریخ ہے جو (سال ۱۳۶۶) کو لطیف و زیبا تعبیر میں بیان کرتا ہے۔

خُدا کے نام سے

مکتب قرآن

فاقرءوا ما تیسر من القرآن

بخواں آیات بس زیبای قُرآن
کلام نغمہ و رُوح افزای قُرآن

سحرگاہاں تلاوت کن باخلاص
پس اندیشہ در معنای قُرآن

بخواں ایں معجزہ و آنگہ بیندیش
ہمیں بس شاہد گویای قُرآن

شفای آنچہ درد است ومصائب
بجوی از مکتب والای قُرآن

ہدایت آفرین است و سعادت
اطاعت گرکنی فتوای قُرآن

ہمی بر اہل عصیان و منافق
زیاں آرد شگفتی ہائ قُرآن

بلی ، آثار ذات کبریائ
نمودار است در ہرجای قُرآن

نگنجد فہم اسرارش بہ افکار
کہ بی پایاں بود دریای قُرآن

بخواں تا میتوانی علم تفسیر
ولی کوشش نما اجرای قُرآن

خدایا رحمتی فرما بہ ذوقی
شود جو بندہ و دانای قُرآن

تہران عبدالغفور ذوقی طالقانی

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِشاریہ

تفسیرِ نمونہ

اُردو ترجمہ

جلد : ۲۷

ترتیب وتدوین:

سیّد شکیل حُسین مُوسوی

اصُول وعقائد	۴۲۴	عُلماء ودانشور	۴۴۳
احکام	۴۲۶	کُتبِ آسمانی	۴۴۴
اخلاقیات	۴۲۷	کُتبِ تاریخ، تفسیر وسیرت	۴۴۹
اقوامِ گزشتہ	۴۲۸	لُغاتِ قرآن	۴۵۱
شخصیات	۴۲۸	مُتفرق موضُوعات	۴۵۶

اُصُول وعقائد

اسماء باری تعالیٰ

اللہ ۳۳، ۵۹، ۸۱، ۱۰۱، ۱۲۱
۱۳۵، ۱۴۷، ۱۷۱، ۱۸۵، ۱۹۱
۲۰۳، ۲۱۷، ۲۳۱، ۲۴۳، ۲۵۹
۲۷۱، ۲۸۹، ۳۰۳، ۳۰۹، ۳۲۱
۳۳۱، ۳۴۳، ۳۵۷، ۳۷۱، ۳۹۱، ۴۰۲
رب ۸۸، ۱۰۱، ۱۰۶، ۱۲۱، ۱۴۷
۱۵۵، ۱۷۱، ۱۹۱، ۲۱۷، ۲۸۹
۳۰۳، ۳۲۱، ۳۴۳، ۳۹۱، ۴۰۲
رحمٰن ۳۳، ۵۹، ۸۱، ۱۰۱، ۱۲۱
۱۳۵، ۱۴۷، ۱۷۱، ۱۸۵، ۲۰۳
۲۱۷، ۲۳۱، ۲۴۳، ۲۵۹، ۲۷۱
۲۸۹، ۳۰۳، ۳۰۹، ۳۲۱، ۳۳۱
۳۴۳، ۳۵۷، ۳۷۱، ۳۹۱، ۴۰۲
رحیم ۳۳، ۵۹، ۸۱، ۱۰۱، ۱۲۱
۱۳۵، ۱۴۷، ۱۷۱، ۱۸۵، ۲۰۳
۲۱۷، ۲۳۱، ۲۴۳، ۲۵۹، ۲۷۱
۲۸۹، ۳۰۳، ۳۰۹، ۳۲۱، ۳۳۱
۳۴۳، ۳۵۷، ۳۷۱، ۳۹۱، ۴۰۲

توحید

.. ہم نے انسان کو تکلیف میں پیدا کیا۔ ۴۳
.. قوم ثمود کو ارتکابِ گناہ پر تباہ کر دیا وہ (خدا) سزا دینے سے ہرگز نہیں ڈرتا۔ ۶۹
.. قسم ہے اس کی جس نے مذکر و مونث پیدا کیے۔ ہم اس کی راہوں کو آسان بنا دیں گے۔ ۸۲
.. ہدایت کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ دنیا و آخرت ہمارے لیے ہے۔ ۸۸
.. ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا۔ ۱۳۵ تا ۱۳۶
.. پڑھ پروردگار کے نام سے جس نے جہاں کو پیدا کیا۔ تیرا پروردگار سب سے زیادہ مکرم و باعزت ہے۔ ۱۴۷
.. ہم نے قرآن شبِ قدر میں نازل کیا۔ ۱۷۱
.. کیا وہ نہیں جانتا کہ خدا اس کے اعمال کو دیکھتا ہے۔ ۱۵۶
.. اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ خدا کی عبادت کریں اور شرک سے توحید کی طرف لوٹ آئیں۔ ۱۸۶
.. تیرے پروردگار نے اُسے وحی کی ہے۔ ۲۰۴
.. اُس دن اُن کا پروردگار اُن سے مکمل طور پر باخبر ہے۔ ۲۱۸
.. تیرے پروردگار نے اصحابِ فیل کے ساتھ کیا کیا۔ ۲۸۹
.. اس گھر کے پروردگار کی عبادت کریں جس نے بھوک اور خوف سے نجات بخشی۔ ۳۰۳
.. ہم نے تجھے کوثر عطا کی۔ ۳۲۱ تا ۳۲۶
.. میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی

تم عبادت کرتے ہو۔ ۲۳۴
.. میں تمھیں توحید کا اقرار کرنے اور بتوں کو ترک کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ ۳۵۵
.. جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ ہر نماز کے بعد سورۂ اخلاص پڑھے۔ ۳۶۸
.. سورۂ اخلاص عقاید کے ایک حصّہ کو بیان کرتا ہے۔ ۳۶۹
.. کہہ دیجئے خدا یکتا و یگانہ ہے۔ سب حاجت مند اسی کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ نہ اس نے کسی کو جنا ہے نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ ہرگز ہرگز کوئی اس کا ہم پلّہ نہیں ہے۔ ۳۷۱
.. توحید کے دلائل، توحید کی چار اقسام ۳۸۰ تا ۳۸۳
.. توحیدِ افعالی کی چھ اہم اقسام ہیں۔ ۳۸۲ تا ۳۸۵

عدل

.. تولنے کی ترازو وہی عدل ہے۔ ۲۳۵

نبوّت

.. رسُول نے ان سے کہا کہ اللہ کے ناقے کو پانی پینے کے لیے چھوڑ دو مزاحمت نہ کرو۔ ۶۹
.. اللہ نے آپ کو ہرگز نہیں چھوڑا۔ آپ کو اس قدر دے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔ یتیموں پر مہربانی فرمائیں۔ ۹۹
.. خُدا نے ہرگز تجھے نہیں چھوڑا اور نہ تجھ پر غصّہ ہُوا۔ ۱۰۱
.. تجھے یتیم پایا پناہ دی۔ گمشدہ تھا رہنمائی کی، فقیر پایا تو بے نیاز کر دیا۔ ۱۰۶
.. سینہ کو کشادہ کیا۔ بھاری کمر توڑ بوجھ برطرف کیا۔ ذکر کو بُلند کیا۔ ۱۲۱ - ۱۲۲
.. پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ کہ تیرا پروردگار مکرّم و باعزّت ہے۔ ۱۴۷
.. خدا کی طرف سے ایسا رسول جو پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرے۔ ۱۸۶
.. ہم نے تجھے کوثر (بہت زیادہ خیر و برکت) عطا کی۔ ۳۲۱

جنّت

.. بے شک جنّت سختیوں کے درمیان گھری ہُوئی ہے۔ (جناب امیر) ۵۰
.. جہنّم کی آگ سے دُوری اتقی (زیادہ متقی افراد) سے مخصوص ہے۔ ۹۱
.. اہلِ ایمان، اعمال صالح انجام دینے والوں کے لیے بہشت کے جاودانی باغات ہیں ہمیشہ رہیں خدا ان سے اور وہ خدا سے خوش ہیں۔ اس دن جس کا میزان عمل وزنی ہوگا وہ پسندیدہ زندگی میں ہوں گے۔ ۲۳۲

جہنّم

.. ان کو آگ نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ۴۸
.. دوزخ شہوات کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ ۵۰
.. جس وقت وہ جہنم میں گرے گا تو اموال فائدہ نہ دیں گے۔ ۸۲
.. جہنم میں خلود (ہمیشہ رہنا) کفار کے ساتھ مخصوص ہے۔ ۹۱
.. ہم بھی عنقریب دوزخ کے مامورین کو پکاریں گے۔ ۱۶۰
.. اہل کتاب اور مشرک کفار جہنم میں جائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۱۹۱
.. اس کی پناہ گاہ ہاویہ (جہنم) ہوگی ۲۳۲
.. تم یقینی طور پر جہنم کو دیکھو گے۔ ۲۴۸
.. سب لوگ دوزخ کا مشاہدہ کریں گے۔ ۲۵۲
.. تو کیا جانے 'حطمہ' کیا ہے۔ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ ۲۷۲
.. خلق جہنم میں ایک کنواں یا زنداں ہے۔ ۳۹۳

معجزہ

.. ایک بے نظیر معجزہ (اس گھر کا ایک مالک ہے) ۲۹۵
.. ابرہہ کے لشکر سے مقابلہ کے لیے ابابیل کی سنگباری اور لشکر کی تباہی ۲۹۶ - ۲۹۷
.. اس معجزہ کے نتائج ۲۹۷
.. معمولی وسیلہ سے سخت ترین سزا ۲۹۷
.. داستانِ فیل کے اہداف ۲۹۸
.. ایک مسلّم تاریخی روئیداد ۲۹۸، ۲۹۹
.. ابولہب اور اس کی بیوی کا ایمان نہ لانا اعجازِ قرآن کی نشانی ہے۔ ۳۶۲

احکام

نماز

.. سجدہ کر اور تقرب حاصل کر۔ ۱۶۱
.. سو رکعت نماز پڑھو، رات بھر بیدار رہو۔ (صادقؑ) ۱۷۸
.. سوائے اس کے اور کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ عبادت کریں۔ نماز پڑھیں۔ ۱۸۸
.. ان نماز گزاروں پر وائے ہے۔ جو اپنی نمازوں کو بھول جاتے ہیں۔ ۳۰۹، ۳۱۱
.. اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔ ۳۲۱
.. فسبح بحمد ربك واستغفر اپنے رب کی حمد و تسبیح کر اور استغفار کر۔ ۳۴۳

زکوٰۃ

.. نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ ۱۸۸

جہاد

.. جہاد کی عظمت: جہاد اور راہِ خدا کے

مجاہدین کی عظمت کے بارے میں قرآن نے بہت زیادہ گفتگو کی ہے۔ ۲۲۸

اِنفاقِ اموال

.. جو اپنا مال راہ خدا میں انفاق کرتا ہے۔ اس کا مقصد حصولِ رضائے خدا ہے ۹۱
.. اور ایسا آدمی عنقریب خوشنود ہو جائے گا۔ ۹۲
.. انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت ۹۴
.. خدا کے نزدیک محبوب ترین عمل۔ ضرورت مند مومن کا دل خوش کرنا، پیر کرنا یا قرض ادا کرنا ہے۔ (رسول پاکؐ) ۹۵

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ

.. یتیم مسکین کو کھانا کھلانا غلام آزاد کرنا۔ ۴۸
.. جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا وہ فلاح پاگیا۔ ۶۰
.. ابو الاحداح کا ایک بخیل سے چالیس درختوں کے عوض ایک درخت خرما خریدنا اور رسولِ پاکؐ کی خدمت میں پیش کرنا، اور آپ کا نادار مومن کو بخشنا۔ ۸۳ ، ۸۵
.. مجاہدین کہ جن کے گھوڑوں کے دوڑنے، حملہ کرنے اور دشمن کی صفوں کو درہم برہم کرنے کی خدا قسمیں کھاتا ہے۔ ۲۲۶

اخلاقِ رذیلہ

.. وہ کہتا ہے میں نے بہت سا مال اچھے کاموں میں تلف کر دیا۔ ۳۴
.. جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہ بدبخت ہیں۔ ۴۸
.. وہ شوم اور بدبخت لوگ ہیں ان کا نامۂ عمل بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ ۴۸
.. جس نے نفس کو آلودۂ معصیت کیا وہ نامراد ہوا۔ ۶۰
.. شقی ترین انسان (قدار بن سالف) اٹھ کھڑا ہوا۔ ۶۹
.. بخیل کا درخت سے گرے ہوئے خرمے بچوں سے چھین لینا۔ منہ تک سے نکال لینا۔ اس درخت کو جنت میں درخت کے بدلے رسولِ پاکؐ کو فروخت کرنے سے انکار۔ (دالیل کی شانِ نزول) ۸۲ ، ۸۳
.. بدبخت ترین لوگوں کے سوا اس (جہنم) میں کوئی داخل نہیں ہوگا۔ ۸۹
.. وہ بخیل انسان جو خود کھاتا ہے۔ نعمات کو دوسروں سے روکتا ہے۔ ۲۲۶
.. کبر و غرور صفاتِ رذیلہ کی وجہ سے ہی دوسروں کی تحقیر و تذلیل کی جاتی ہے۔ ۲۷۹
.. مال جمع کرنے کی حرص ایک عرب شاعر کے

اشعار۔ ۲۸۰
.. روزِ جزاء کا انکار، یتیم و مسکین کی حقارت، بھوکوں کو کھانا نہ کھلانا، نماز سے غفلت، ریاکاری، لوگوں سے عدم تعاون، حقیر چیز بھی نہ دینا صفاتِ رذیلہ ہیں۔ ۳۱۳
.. تظاہر و ریاکاری بہت بڑی اجتماعی مصیبت ہے ۳۱۴
.. حسد۔ صفتِ رذیلہ جسے قرآن نے ڈسنے والے سانپوں، وسوسے ڈالنے والے شیاطین کے کاموں کے ساتھ قرار دیا۔ ۳۹۵
.. شر و فساد کے اہم ترین چشمے ۳۹۵

اقوامِ گذشتہ

قومِ ثمود

.. قوم ثمود نے سرکشی کی وجہ سے (اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی۔ اونٹنی کی کونچیں کاٹ کر ہلاک کر دیا۔ خدا نے اس جرم میں انھیں برباد کر دیا۔ ۶۹
.. قوم ثمود کی سرکشی کا خلاصہ ۷۴
.. اہل کتاب نے اختلاف نہیں کیا مگر واضح دلیل پہنچ جانے کے بعد ۱۸۶

❖ ❖ ❖

شخصیات

ابراہیم بن ادہمؒ

.. مشہور زاہد و پاکباز ۲۸۰

ابراہیمؑ خلیل اللہ

.. قسم ہے باپ کی میں باپ سے مراد ابراہیمؑ ہیں۔ ۳۳

ابرہہ

.. ارياط کے خلاف بغاوت کر کے یمن کا بادشاہ بن گیا۔ ہاتھیوں کا لشکر لے کر خانہ کعبہ کو برباد کرنے آیا اور خود برباد ہو گیا۔ ۲۸۷

ابن ابی الحدید

.. جناب امیرؑ کے خطبہ ۲۲۱ کے بارے میں ایک طویل بیان۔ یہ خطبہ فصحاءِ عرب کے سامنے پڑھا جائے تو سب سجدہ کریں۔ ۲۴۶

ابن ابی کبشہ

.. معاویہ نے اس لقب سے حضورؐ پاک کی طرف اشارہ کیا۔ ۱۳۰

❖ ❖ ❖

ابن مردویہ

.. جناب امیرؑ کی روایت اے علیؑ تم اور تمہارے شیعہ خیر البریہ ہیں۔ میری اور تمہاری وعدہ گاہ حوض کوثر ہے تمہیں "غر المحجلین" (سفید پیشانیوں والے) کہہ کر پکارا جائے۔ (حدیثِ رسولؐ) ۱۹۶

ابن مقلہ

.. معروف خطاط (عرب کے ایک شاعر نے اپنے اشعار میں ذکر کیا) ۲۸۰

ابو الدحداح (یا ابو الاحداح

.. ایک نخیل سے کھجور کا ایک درخت چالیس درختوں کے بدلے خریدا۔ ۸۳

.. راہِ خدا میں بہت مال خرچ کیا۔ ۸۵

ابو برزہ اسلمی

.. اے علیؑ تیری اور میری وعدہ گاہ حوضِ کوثر ہے تو اور تیرے شیعہ خیر البریہ ہیں۔ ۱۹۵

ابو جعفر احول

.. (محمد بن علی لقمانی عرف مومن طاق)، امام صادقؑ کا ایک صحابی ۳۳۴

ابو جہل

.. رسولِ پاک کی دعوت و تبلیغ کے آغاز سے آمادۂ سرکشی ہوا۔ ۱۵۷

ابو رافع

.. حضرت عباس بن عبد المطلب کا غلام جنگِ بدر کے حالات بیان کرنے پر اسے ابو لہب نے بہت مارا۔ ۳۶۰

ابو سعید خدریؓ صحابی

.. رسول پاک سے "فمن یعمل مثقال ذرۃ" پر سوال کیا۔ ۲۰۱

.. جنگل بیاباں میں ہو تو بلند آواز سے اذان دو۔ حضور پاکؐ نے فرمایا کہ جن و انس اور پتھر کا ہر ٹکڑا جو اسے سنے گا قیامت میں گواہی دے گا۔ ۲۰۶

.. حضور پاکؐ سے اعمال پر مکالمہ (کوئی شخص اپنے عمل سے مستحق جنت نہ ہو گا جب تک خدا کا کرم شامل حال نہ ہو) ۲۱۱

ابو سفیان

.. دو بڑے اونٹ نحر کر کے کھاتا اور اپنے دوستوں کو کھلاتا تھا۔ ایک یتیم کے مانگنے پر اسے مارا۔ ۳۰۸

.. فتح مکہ کے موقع پر ابو سفیان کا پناہ حاصل کرنا اور بہ اکراہ ایمان لانا۔ ۳۴۸

⁂

ابُوشاکر دیصانی

.. ایک زندیق، ابوجعفر احول سے سورۂ کافرون کی تکرار پر معترض ہوا۔ ۳۳۴

ابوطالبؑ

.. چھ سال کی عمر میں والدہ، آٹھ سال کی عمر میں دادا انتقال کر گئے۔ تو ہم نے چچا ابوطالب کی کفالت میں دے دیا۔ تنہا کبھی نہیں چھوڑا۔ ۱۰۷

ابولہب

.. دولت مند، مغرور، دشمن خدا و رسول جس نے حضور کی دعوت پر زبانِ طعن دراز کی۔ (نام عبدالعزیٰ کنیت ابولہب) ۳۵۵

اخنس بن شریق

.. کینہ ور مخالفِ رسول ۲۷۲

ارياط

.. نجاشی کا ایک سپہ سالار جو ذونواس کی سرکوبی کے لیے ایک بڑا لشکر لے کر آیا۔ ۲۹۱

اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ

.. قسم ہے بیٹے کی۔ یہاں بیٹے سے مُراد اسمٰعیل علیہ السلام ہیں۔ ۳۳

افلاطُون

.. مشہور طبیب ۱۳۸

ام الفضل

.. عباس کی زوجہ، جس نے ابولہب کے سر پر ایک چھڑی سے وار کیا۔ ابولہب کا سر پھٹ گیا۔ زخم بڑھتے بڑھتے اس کی ہلاکت کا موجب ہُوا۔ ۳۶۰

اُمِّ جمیل

.. زوجہ ابولہب (ابوسفیان کی بہن) جو رسولِ پاک کو مارنے کے لیے ہاتھ میں پتھر اٹھائے پھرتی تھی۔ ۳۵۵

اُمیّہ بن خلف

.. کینہ ور مخالفِ رسول ۲۷۲

بدیل

.. ابوسفیان کا ایک دوست جو لشکرِ اسلام کو دیکھنے کے لیے نکلا تھا۔ ۳۴۸

جابر بن سمرہ

.. حدیثِ رسُول کا بیان اشقی اوّلین و اشقی آخرین کون تھا۔ ۷۵

❖ ❖ ❖

جابر بن عبداللہ

.. اِس کعبہ کے خدا کی قسم یہ (علیؑ) اور اس کے شیعہ قیامت کے دن رستگار اور کامیاب ہوں گے۔ (حدیثِ رسولؐ) ۱۹۵

جالینوس

.. مشہور طبیب ۱۳۸

جبرائیل

.. (رسول پاکؐ سے عرض کیا) یہ سخیرہ نہیں ہے۔ نماز میں تکبیر کے وقت ہاتھوں کو بلند کرنا ہے۔ ۳۲۳

جعفرؑ بن محمدؑ (صادقؑ)

.. جو شخص واجب نمازوں میں سورہ بلد پڑھے گا وہ صالحین میں شمار ہوگا۔ انبیاء شہداء اور صلحاء اس کے دوست ہوں گے۔ ۳۱

.. جس نے اطاعت کی وہ نجات پا گیا جس نے نافرمانی کی وہ نا امید و محروم ہو گیا۔ ۶۶

.. میرے نزدیک کوئی چیز مومنین کے دیدار اور زیارت کے برابر نہیں سوائے اس کو کھانا کھلانے کے، پھر خدا پر واجب ہے کہ اُسے جنت کا کھانا کھلائے۔ ۹۵

.. (رسول پاکؐ نے اپنی بیٹی سے فرمایا) دنیا کی تلخی کو آخرت کی شیرینی کے لیے برداشت کر۔ ۱۰۵

.. خدا نے جو کچھ بخشا، برتری عطا کی، احسان کیا، ہدایت کی سب کو بیان کر۔ ۱۱۱

.. خدا نے کسی پیغمبر کو مبعوث نہیں کیا جب تک اُس سے بھیڑ بکریوں کی چوپانی کا کام نہ لیا۔ تاکہ انسانوں کی نگہبانی کر سکے۔ ۱۱۳

.. جب تو فارغ ہو جائے تو علیؑ کی ولایت کے لیے نصب کر دے۔ ۱۲۸

.. جبرائیل ملائکہ میں سے ہے۔ روح ملائکہ سے زیادہ عظیم ہے۔ کیا اللہ نے نہیں فرمایا کہ ملائکہ اور روح نازل ہوتے ہیں۔ ۱۷۴

.. شبِ قدر رمضان کی اکیسویں اور تئیسویں رات ہے۔ ۱۷۷

.. تقدیر مقدرات انیس کو، ان کا حکم اکیس کو اور تصدیق و منظوری تئیسویں رات کو ہوتی ہے۔ ۱۷۷

.. (علی بن حمزہ ثمالی سے) شب قدر کی فضیلت اکیسویں اور تئیسویں شب میں تلاش کرو۔ سو رکعت نماز پڑھو ۱۷۸

.. جو سورہ زلزلہ کو تلاوت کرے، نافلہ نمازوں میں پڑھے ہرگز زلزلہ یا کسی آفت میں گرفتار نہ ہوگا۔ ۲۰۲

.. درود پاک میزانِ عمل کی سنگینی کا سبب ہے۔ ۲۳۷

.. کوئی شخص تکبر و فخر نہیں کرتا مگر اس ذلت کی وجہ سے جو وہ اپنے نفس میں پاتا ہے۔ ۲۴۸
.. خدا کو ناراض کر کے لوگوں کو راضی نہ کرنا یقین کی صحیح نشانی ہے۔ ۲۵۱
.. نعیم سے مراد ہم اہل بیت ہیں۔ خدا نے ہمارے وجود کے ذریعہ بندوں کو نعمت عطا کی۔ ۲۵۳
.. والعصر — عصر سے مراد حضرت مہدی کے قیام کا زمانہ ہے۔ ۲۶۰
.. جو تیرے غیر کے پاس جائیں گے، وہ مایوس ہوں گے۔ ۲۶۳
.. جو واجب نمازوں میں سورۂ ہمزہ پڑھے گا۔ فقر و فاقہ دور ہوگا۔ بُری موت دور ہوگی اور روزی کشادہ ہوگی۔ ۲۶۹
.. سونے اور چاندی سے مراد وہ چیزیں ہیں جو دین کو ختم کر دیں اور کفر و بے ایمانی کا موجب ہوں ۲۸۰، ۲۸۱
.. اگر حسنات حق ہیں اور ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر مال جمع کرنا کس لیے؟ ۲۸۱
.. جو سورۂ فیل کو واجب نمازوں میں پڑھے گا۔ قیامت میں ہموار زمین، ہر پہاڑ اور ڈھیلا اس کی نماز گزاری کی گواہی دے گا۔ ۲۸۷، ۲۸۸
.. جو شخص لوگوں کے لیے عمل کرے گا اس کا ثواب و اجر لوگوں پہ ہی ہو گا۔ ۳۱۵
.. کوثر جنت میں ایک نہر ہے جو خدا نے پیغمبرؐ کو فرزند (عبداللہ) کے فوت ہونے کے بدلے عطا کی۔ ۳۲۲
.. نماز کے آغاز میں ہاتھوں کو اس طرح بلند کرو کہ ان کی ہتھیلیاں رو بقبلہ ہوں۔ ۳۲۴
.. ابلیس مکہ کی پہاڑیوں پہ گیا۔ گروہِ شیاطین کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ ۴۰۷، ۴۰۸

حارث بن قیس

.. مشرکینِ مکہ کا ایک سرغنہ ۳۲۲

حسّان بن ثابت شاعر

.. رسولِ پاکؐ کی مدح میں قصیدہ کے اشعار ۱۲۵، ۱۲۶

حسنؑ بن علیؑ (امام دوم)

.. آپ نے اہلِ بصرہ کے خط کے جواب میں صمد کے معنی بیان فرمائے۔ ۳۷۷

حسینؑ بن علیؑ (امام سوم)

.. سورۂ اخلاص کی تشریح میں صمد کے پانچ معنی بیان فرمائے۔ ۳۷۶

خدیجۃ الکبریٰؑ (اُمّ المومنین)

بحالتِ مفلسی و ناداری تیری طرف دولتمند خدیجہ کو متوجہ کیا۔ ۱۰۹

دوس

.. نجران کا ایک شہری جو جان بچا کر ذونواس کے مظالم بیان کرنے قیصرِ روم کے پاس گیا۔ ۲۹۱

ذونواس

.. ابرہہ سے قبل یمن کا بادشاہ تھا۔ ۲۹۰

ربیع بن عباد

.. جس نے حضور کو تبلیغ کرتے اور ابولہب کو طعن کرتے دیکھا۔ ۳۵۹

زبیر بن بکار

.. نہ شیعہ تھا نہ معاویہ سے دشمنی رکھتا تھا نے منیرہ کے بیٹے سے ایک روایت معاویہ کی تنقیص میں بیان کی۔ ۱۲۹ ، ۱۳۰

زرارہ

.. صادقؑ کا ایک صحابی جس سے آپ نے فرمایا۔ 'ریا' شرک ہے۔ ۳۱۵

زربن جیشن

.. ہم عذابِ قبر کے بارے میں شک کیا کرتے تھے۔ ہم نے جناب امیر سے "نا الھکم التکاثر عذاب قبر پر دلیل ہے۔ ۲۴۷

زلیخا

.. (عزیزِ مصر کی بیوی) جناب یوسفؑ سے گفتگو ۷۶

سحبان

.. عرب کا ایک معروف فصیح ۲۸۰

سعد بن عبادہ

.. علمدارِ لشکرِ اسلام، جس نے فتح مکہ کے دن انتقام کا نعرہ لگایا۔ ۳۵۰

سلمان فارسیؓ (صحابی)

.. آپ کی ایک شخص کے جواب میں گفتگو۔ آغاز گندے نطفہ سے انجام مُردار، لیکن قیامت میں جس کا میزانِ عمل بھاری وہ بزرگوار، جس کا ہلکا، وہ پست و ذلیل۔ ۲۳۷ ، ۲۳۸

سلیمانؑ نبی

.. یہ میرے پروردگار کا فضل ہے تاکہ آزمائے" میں شکر ادا کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت"۔ (نمل ۴۰) ۳۴۶

شیطان

.. درہم و دینار کو شیطان کا پسند کرنا۔ ۲۸۲

❖ ❖ ❖

صالح نبی

.. اپنی قوم ثمود سے کہا کہ اونٹنی کو پانی پینے کے لیے آزاد چھوڑ دو۔ ۶۹

طارق محاربی

.. جس نے ذی المجاز کے بازار میں حضورؐ کی آواز تبلیغ سنی ۲۵۸

طاؤس

.. فخر رازی نے نقل کیا یہ والضحیٰ اور الم نشرح کو ایک سورہ جانتے تھے اور نماز میں دونوں کو ملا کر تلاوت کرتے تھے۔ ۱۱۹

عاص بن وائل

.. کینہ ور دشمنِ رسول ۲۷۲

.. حضورؐ مسجد الحرام سے نکلے، عاص نے ملاقات کی۔ قریش کے دریافت کرنے پر کہا کہ اس (نعوذ باللہ) ابتر سے ملاقات کی۔ ۳۱۹

عباس بن عبد المطلبؓ

.. مکہ سے مدینہ کی طرف جا رہے تھے۔ رسول فتح مکہ کے لیے آ رہے تھے۔ راستے میں ملاقات۔ ۳۴۷ ، ۳۴۸

عبدُ المطلب

.. آپؐ کی پرورش سردارِ مکہ آپ کے دادا عبد المطلبؑ نے کی۔ ۱۰۷

.. سردارِ مکہ نے اصحابِ فیل کے خلاف اللہ سے مدد چاہی۔ ۲۹۱ ، ۲۹۲

عبداللہ بن سلامؓ

.. بعض کے نزدیک خدا کی صفات بیان کرنے کا سوال عبداللہ بن سلام نے کیا تھا۔ ۳۶۷

عبداللہ بن صوریا

.. مشہور یہودی سردار جس نے رسولِ پاک سے خدا کی صفات بیان کرنے کا تقاضا کیا۔ ۳۶۷

عبداللہ بن عباسؓ (صحابی)

.. مفسرین نے ابن عباس سے اللیل کی شانِ نزول لکھی ہے جسے علامہ طبرسی سے نقل کیا ہے۔ ۱۱۲

.. رسولِ خداؐ کی نماز۔ ابوجہل کا آنا اور منع کرنا۔ رسولِ پاکؐ کا جھڑکنا۔ ابوجہل نے کہا۔ نہیں معلوم میری قوم و قبیلہ سب سے زیادہ ہے۔ ۱۹۳

.. اے علیؑ! یہ آیت تمہارے اور شیعوں کے بارے میں ہے۔ تم محشر میں ایسے آؤ گے کہ خدا تم سے اور تم خدا سے خوش ہو گے۔ ۱۹۴

.. ایک شخص نے والعدیات کے معنی مجھ سے اور جناب امیرؑ سے پوچھے تفصیل ۲۲۰
.. یہ وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کرتے اور دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں۔ ۲۷۳
.. درہم و دینار کو شیطان کا پسند کرنا اور انسان کا اس کی محبت میں مبتلا ہونا۔ ۲۸۲
.. قریش۔ ایک بہت بڑے سمندری جانور کا نام ہے جو ہر دبلے موٹے جانور کو کھا جاتا ہے۔ ۳۰۴

عبداللہ بن عبدالمطلبؑ

.. آپ رسولِ پاک کی ولادت سے قبل وفات پا گئے۔ ۱۰۷

عبداللہ بن مسعودؓ (صحابی)

.. سورہ رحمٰن کی تلاوت (بالمقابل قریش مکہ) کے لیے تیار ہوئے۔ ۱۶۱
.. بدر میں ابوجہل کا سر قلم کر کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے پیغمبرؐ کے پاس لائے ۱۶۲
.. سب سے زیادہ محکم آیت (من یعمل مثقال ذرہ ...) ہے۔ ۲۱۰، ۲۱۱

عثمان بن صہیب

.. حدیث پیغمبرؐ "شقی اولین و شقی آخرین" کون تھا" بیان کی۔ ۷۵

❖ ❖ ❖

علیؑ ابن ابی طالبؑ

.. قرآن میں دلوں کی بہار اور علم و دانش کے سرچشمے ہیں۔ کوئی چیز بھی قرآن کی طرح دل کو روشن نہیں کرتی۔ ۲۶
.. قرآن کے ہوتے ہوئے کوئی شخص محتاج نہیں اور قرآن کے بغیر غنی نہیں۔ ۲۷
.. تعجب ہے انسان پر جو چربی کے ایک ٹکڑے (آنکھ) سے دیکھتا ہے۔ گوشت کے ٹکڑے سے بولتا، ہڈی سے سنتا اور سوراخ سے سانس لیتا ہے۔ ۴۴، ۴۵
.. بے شک جنت سختیوں کے درمیان گھری ہوئی ہے اور دوزخ شہوات کے درمیان۔ ۵۰
.. مال خرچ کرنے سے کم اور علم خرچ کرنے سے زیادہ ہوتا ہے۔ ۶۵
.. "عاقر الناقۃ" وہ شخص جس نے اونٹنی کو ہلاک کیا وہ شقی ترین تھا۔ ۷۰
.. ناقہ ثمود کو ایک شخص نے ہلاک کیا مگر معذب سب ہوئے اس لیے کہ سب اس پر رضامند تھے۔ ۷۲
.. سب سے زیادہ امید بخش آیت "ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ" ہے۔ ۱۰۵
.. خدا جمیل ہے جمال و زیبائی کو دوست رکھتا اور پسند کرتا ہے کہ اپنے بندوں پر اپنی نعمتوں کے آثار دیکھے۔ ۱۱۲

.. خدا کو یاد رکھو! یتیم کو کبھی سیر کبھی بھوکا نہ رکھو تمہارے سامنے وہ ضائع نہ ہوں۔ ۱۱۴

.. ایک عورت نے اپنے شوہر (جبکہ وہ مفلس تھا) کی خرچ نہ دینے کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا:۔ ان مع العسر یسرًا۔ ۱۲۷

.. وہ گھر جس میں سرکہ اور زیتون سالن کے طور پر استعمال ہوتا ہے وہ کبھی کھانے سے خالی نہ ہوگا۔ یہ پیغمبروں کی غذا ہے۔ ۱۳۹

.. مساجد کے مختلف حصوں میں نماز پڑھا کرو۔ کیونکہ زمین کا ہر ٹکڑا گواہی دے گا جس پر نماز پڑھی۔ ۲۰۷

.. قیامت کے دن گواہی دینا کہ میں نے حق کے ساتھ تجھے پڑکیا تھا اور حق کے ساتھ خالی کیا ہے۔ ۲۰۷

.. امیرالمومنینؑ اور وہ آئمہ جو آپ کی ذریت میں ہیں وہی تولنے کی ترازو ہیں۔ ۲۳۵

.. میزان سے شہادتین کو اٹھا لیا تو ہلکا اور میزان میں رکھ دیا تو بھاری ہو جائے گا۔ ۲۳۷

.. مقصد سے دُور کیسے زیارت کرنے والے ہیں۔ رسوا کرنے والا افتخار۔ (طویل خطبہ) ۲۴۵ ، ۲۴۶

.. حرص، بخل، دنیا پرستی، فخر و مباہات اور اظہارِ برتری مفاسد کے عوامل ہیں۔ ۲۴۹

.. نعیم سے مراد تازہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی ہے۔ ۲۵۲

.. انسان کا ہر سانس موت کی طرف اس کا ایک قدم ہے۔ ۲۶۲

.. تمہارے وجود کی قیمت جنت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم اُسے کمتر شے کے بدلے بیچ ڈالو۔ ۲۶۳

.. مستی کی چار اقسام ہیں۔ مستیٔ اموال، مستی اقتدار، مستی شراب اور نیند کی مستی۔ ۲۸۱

.. جو شخص اپنے اموال کو دوسرے کی میزان میں دیکھے خدا اُسے دوزخ میں اور اس کے وارث کو جنت میں داخل کرے گا۔ ۲۸۱

.. خواب میں خضرؑ سے گفتگو، رسُولِ پاکؐ سے اس کا بیان، آپؐ نے فرمایا، اے علی تمہیں اسم اعظم کی تعلیم دی گئی ہے۔ ۳۷۳

.. واحد کی تشریح بیان فرمائی۔ ۳۷۵

.. صمد کے معنیٰ بیان فرمائے ۳۷۷

.. اس نے کسی کو نہیں جنا کہ وہ خود بھی موجود ہو۔ وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا ورنہ محدود ہو جاتا۔ کوئی اس کا شبیل و نظیر نہیں۔ (نہج البلاغۃ) ۳۸۰

.. اے بیٹا جان لو کہ تمہارے رب کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے نمائندے بھی تیرے پاس آتے۔ ۳۸۱

.. خدا کی راہ پر چلنے والوں پر مطلب مخفی نہ رہنا۔ ۴۰۵

علی بن الحسین

.. سورۂ فیل کی شانِ نزول کے بارے میں ایک طویل حدیث بیان فرمائی۔ ۲۹۰
.. صمد اس ہستی کو کہتے ہیں جس کا کوئی شریک نہ ہو۔ ۳۷۶

علیؑ بن موسیٰؑ

.. قرآن کا جتنا مطالعہ ہوتا ہے۔ نشر و اشاعت ہوتی ہے اتنا ہی تر و تازہ کیوں ہوتا ہے۔ ۲۵، ۲۶
.. کھانا کھلانا اور انتظامات ۵۲
.. انجیر منہ کی بدبو دور کرتا ہے۔ مسوڑھوں اور ہڈیوں کو مضبوط کرتا ہے۔ بالوں کو اگاتا ہے۔ درد و تکلیف کو برطرف کرتا ہے۔ جنت کے پھلوں سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ ۱۳۸، ۱۳۹
.. روغن زیتون ایک اچھی غذا ہے۔ منہ کو خوشبودار اور بلغم کو دور کرتا ہے چہرے کی رنگت نکھارتا ہے۔ مقوئ اعصاب ہے۔ بیماری درد اور ضعف کو دور کرتا ہے اور غصہ کی آگ کو بجھاتا ہے۔ ۱۴۰
.. پانچ خصلتوں کے بغیر مال جمع نہیں ہو سکتا۔ بخلِ شدید، طولِ امل، حرصِ غالب، قطع رحمی، اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا۔ ۳۷۵، ۳۷۶

عمارؓ بن یاسر (صحابی)

.. حدیثِ پیغمبر اشقی اولین و اشقی الآخرین کون تھا۔ ۷۵

عمرؓ بن خطاب (صحابی)

.. فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان کو قتل کرنے پر آمادہ ہوئے۔ ۳۴۸

عمر بن عبدالعزیز

.. والضحیٰ اور الم نشرح کو ایک سورہ جانتے تھے۔ نماز میں دونوں کو ملاکر تلاوت کرتے تھے۔ (رازی) ۱۱۹

عمر بن عبدِ وُد

.. جناب ایمنؑ نے اسلام پیش کیا تو کہا جو مال میں نے تمہاری مخالفت میں خرچ کیا اس کا کیا بنے گا۔ ۳۸

قدار بن سالف

.. قومِ ثمود کا اشقیٰ جس نے صالحؑ پیغمبر کی اونٹنی کو ہلاک کیا۔ ۷۰

کھودیا سارہ

.. حاطب بن ابی بلتعہ کا خط لے کر مکہ جارہی تھی

حضرت علی اسے پکڑ کر مدینہ لے آئے۔ ۳۴۷

لقمان

.. ایک مشہور حکیم و دانا ۲۸۰

محمد بن حنفیہ

.. صمد کے معنی جناب امیرؑ سے دریافت کیے۔ ۳۷۷

محمدؐ بن عبداللہ رسول پاکؐ

.. قرآن میں درخشاں ستارے ہیں ان پر اور ستارے ہیں۔ نہ عجائبات ختم ہوتے ہیں نہ مطالب پرانے ہوتے ہیں اس میں ہدایت کے چراغ اور حکمت کی منزلیں ہیں۔ ۲۵

.. جو شخص سورہ بلد تلاوت کرے گا خدا اُسے قیامت میں اپنے غضب سے امان دے گا۔ ۳۱

.. انسان کی آنکھوں کو پلکوں سے اور زبان کو ہونٹوں سے ضبط میں رکھا گیا ہے۔ ۴۲

.. لوگو! تمھارے لیے دو (خیر اور شر کی) سرزمینیں موجود ہیں۔ ۴۵، ۴۹

.. دشوار گزار گھاٹی سے بھاری بوجھ والے نہیں گذر سکیں گے۔ میں چاہتا ہوں اس بوجھ کو ہلکا کر دوں۔ ۴۹

.. غلاموں کو آزاد اور گردنوں کو (طوقِ غلامی سے) رہائی دے۔ جن رشتہ داروں نے تجھ سے قطع رحمی کی ان سے بھی اچھا سلوک کر، بھوکوں کو کھلا، امر و نہی کر، زبان بند رکھ ۵۱

.. خداوندا! میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا فرما۔ تو ولی و مولیٰ ہے تزکیہ فرما۔ ۶۶، ۶۷

.. جس کے نفس کا خدا نے تزکیہ کیا وہ نجات پا گیا۔ جسے خیر سے محروم کر دیا وہ نا امید ہو گیا۔ ۶۷

.. من اشقی الأخرین۔ جناب امیرؑ نے فرمایا۔ نہیں معلوم۔ فرمایا، جو شخص تیرے سر پر ضرب لگائے گا۔ ۷۱

.. خدا کے نزدیک پسندیدہ عمل بھوکے کو کھانا کھلانا، قرضہ ادا کرنا، مومن کا دل خوش کرنا۔ ۹۵

.. جو شخص مسلمانوں کے کسی گھرانے کی ایک دن رات پذیرائی کرے، خدا اس کے گناہوں کو بخش دے گا۔ ۹۶

.. جو شخص والضحیٰ کی تلاوت کرے گا۔ اللہ اس سے راضی اور محمدؐ اس کے شفیع ہوں گے۔ ۹۹

.. قسم ہے دن اور روشنی کی، رات اور سکون کی، خدا نے تجھے نہیں چھوڑا، تیری آخرت دنیا سے بہتر ہے۔ اِس قدر عطا کیا جائے گا کہ تو خوش ہو گا۔ ۱۰۲، ۱۰۳

.. میں قیامت میں اِس تعداد میں سفارش کروں گا کہ خدا فرمائے گا۔ اے محمدؐ کیا تم راضی ہُوئے۔ (امام باقرؑ اپنے آباء سے) ۱۰۴ ، ۱۰۵

.. یتیم پایا تو پناہ دی گمشدہ تھا تو رہنمائی کی، مفلس تھا بے نیاز کر دیا۔ یتیم کو حقیر نہ سمجھ۔ سائل کو نہ جھڑک اپنے رب کی نعمتوں کو یاد کر۔ ۱۰۶

.. یتیم کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھ ہاتھ کے نیچے جتنے بال ہیں ان کے برابر قیامت میں ایک نور حاصل ہوگا۔ ۱۱۰

.. جب خدا بندہ کو نعمت دیتا ہے تو یہ پسند کرتا ہے کہ اس پر عطا نعمت کے آثار دیکھے۔ ۱۱۱

.. جب نعمت دی جائے اس پر اس کے آثار نمایاں نہ ہوں تو وہ دشمن خدا اور نعمتوں کا مخالف شمار ہوگا۔ ۱۱۲

.. یتیم کے رونے سے عرش الٰہی کانپ جاتا ہے۔ فرشتو! جو اس کو چپ کرائے گا میں اُسے قیامت میں خوش کروں گا۔ یتیم روتا ہے تو اس کے آنسو خدا کے ہاتھ پر پڑتے ہیں۔ میں اور یتیم کا کا سرپرست دونوں پہلو بہ پہلو جنت میں ہوں گے۔ ۱۱۴

.. یتیم کو اکیس دانہ خرما عطا فرمائے ،ور یتیم کی سرپرستی پر توجہ دلائی۔ ۱۱۵

.. سورہ الم نشرح کی تلاوت کرنے والے کو اس شخص کا ثواب ملے گا جس نے رسُولِ پاکؐ کو غمزدہ پاکر آپ کا غم دُور کیا ہو۔ ۱۲۰

.. تیرے سینہ کو کشادہ کیا۔ کمر توڑ بھاری بوجھ کو کم کیا۔ ذِکر کو بلند کیا۔ پس سختی کے ساتھ آسانی ہے۔ اپنے کام سے فارغ ہو اور اپنے ربّ کی طرف رغبت کر۔ ۱۲۱ تا ۱۲۹

.. اپنے پروردگار کے حکم کا منتظر رہ، یونس کی طرح نہ ہو جا۔ ۱۲۲ تا ۱۲۳

.. جس وقت میرا نام لیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ تیرا نام بھی لیا جاتا ہے، اور یہ تیرے مقامِ عظمت کے لیے کافی ہے۔ (قولِ خدا) ۱۲۵

.. جان کو سختیوں کے ساتھ آسانی ہے۔ صبر کے ساتھ کامیابی ہے۔ غم و اندوہ کے ساتھ خوشحالی ہے۔ ۱۲۷

.. روغن زیتون کھاؤ۔ بدن پر مالش کرو۔ یہ ایک مبارک درخت ہے۔ ۱۴۰

.. ہاں! خدا احکم الحاکمین ہے اور میں اس کا گواہ ہوں۔ ۱۴۲

.. حمد کے لائق وہی ہے جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی بخشی خدا ۱۵۳

.. خُدا کی اس طرح عبادت کر کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے۔ اگر تو نہیں تو یقیناً وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ ۱۵۹

.. میرے زمانے کا فرعون، فرعونِ موسٰے سے بدترین، اُس نے آخری وقت ایمان کا اقرار کر لیا تھا۔ ۱۶۲

.. بندہ بحالتِ سجدہ سب سے زیادہ خُدا کے قریب ہوتا ہے۔ ۱۶۴

.. جو سورۂ قدر کی تلاوت کرے ایسا ہے کہ اس نے ماہِ صیام کے روزے رکھے اور شبِ قدر کا احیاء کیا۔ ۱۶۹

.. بنی اسرائیل میں ایک شخص نے ہزار ماہ لباسِ جنگ پہنے رکھا۔ جہاد میں مشغول رہا۔ اصحاب نے تعجب کیا۔ بنی اسرائیل کے چار افراد کی اسّی سال معصیت کے بغیر خدا کی عبادت۔ ۱۷۳

.. میری امّت کو شبِ قدر عطا ہوئی۔ یہ نعمت پہلے کسی کو نہیں ملی۔ ۱۷۸

.. سورۂ بینہ کو ازل سے فرشتے تلاوت کر رہے ہیں۔ جو شخص تلاوت کرے گا اس کے دین و دُنیا کی حفاظت کریں گے اور اس کیلئے رحمت و بخشش طلب کریں گے۔ ۱۸۴

.. جو سورہ زلزلہ کی تلاوت کرے، سورۂ بقرہ کی تلاوت کا ثواب پائے گا۔ ۲۰۱

.. قیامت میں زمین زن و مرد کے اعمال کی گواہی دے گی۔ وضو اور نماز کی حفاظت کرو، زمین پر جو اچھا برا کام کرو گے وہ اس کی گواہی دے گی تم بیابان میں ہو تو بلند آواز سے اذان دو جن و انس اور پتھر کا ٹکڑا اسے سن کر گواہی دے گا۔ ۲۰۶

.. ایک شخص کا سوالِ تعلیم۔ حضورؐ کا اسے صحابی کے سپرد کرنا۔ صحابی کا سورہ زلزلہ تعلیم کرنا۔ وہ واپس ہوا تو فقیہ تھا (ابوسعید سے مکالمہ برائے اعمال) ۲۱۱

.. کنود وہ ہے جو خود اکیلا کھاتا ہے دوسروں سے روکتا ہے۔ غلاموں کو مارتا ہے۔ ۲۲۳، ۲۲۴

.. کوئی عمل لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بغیر قبول نہ ہوگا۔ یہ کلمہ ہی میزانِ عمل کو بھاری کرے گا۔ ۲۳۷

.. غیر شرعی طریقے سے مال جمع کرنا "تکاثر" ہے۔ ۲۴۹

.. تیرا مال صرف وہ ہے جو تو کھاتا ہے اور لباس جو پہنتا ہے۔ صدقات جو ادا کرتا ہے۔ ۲۵۰

.. اگر اس کا یقین اور پختہ ہوتا تو پانی تو کیا ہوا پر چلتا۔ ۲۵۱

.. جو سورہ ہُمزہ تلاوت کرے گا، اُسے ان لوگوں کی تعداد سے دس گُنا حسنات ملیں گے جنھوں نے رسول اور اصحابِ رسول کا مذاق اڑایا۔ ۲۶۹

.. بہت زیادہ چغل خوری کرتے۔ دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتے۔ پاکیزہ افراد کے عیب تلاش کرتے ہیں۔ ۲۷۴

.. لوگوں میں سب سے زیادہ ذلیل شخص وہ ہے جو لوگوں کی توہین و تذلیل کرے۔ ۲۷۴
.. پیغمبر اکرمؐ کا شبِ معراج جبرئیلؑ سے سوال۔ دوزخیوں کا گوشت کاٹ کر انھیں کھلانا۔ ۲۷۹
.. ہر شخص کا عمل میں حصّہ اس کی نیت کے مطابق ہوگا۔ جو شخص خُدا کے لیے جہاد کرے اس کا اجر خدا پر ہے۔ ۳۱۴
.. ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگوں کے باطن قبیح گندے اور آلودہ ہوں گے۔ جبکہ ظاہر زیبا اور خوب صورت۔ ۳۱۵
.. ریاکار کو قیامت میں چار ناموں سے پکارا جائے گا۔ کافر، فاجر، حیلہ گر، خاسر، زیاں کار۔ ۳۱۵
.. جو شخص سورہ کوثر تلاوت کرے۔ اللہ اسے جنّت کی نہروں سے سیراب کرے گا۔ ۳۲۰
.. جو سورۂ کافرون تلاوت کرے تو گویا اس نے چوتھائی قرآن پڑھا۔ قیامت کی گھبراہٹ سے امن میں رہے گا۔ ۳۲۹، ۳۳۰
.. بستر پر جائے تو سورۂ کافرون کی تلاوت چاروں قل اور نصر کی تلاوت کر۔ ۳۳۰
.. جو شخص سورۂ نصر کی تلاوت کرے ایسا ہے جیسے فتح مکّہ کے دن رسولِ خدا کے ساتھ تھا۔ ۳۴۲
.. جو شخص سورۂ تبّت تلاوت کرے امید کہ خدا اُسے اور ابولہب کو ایک گھر میں اکٹھا نہیں کرے گا۔ ۳۵۴
.. جو شخص سورۂ اخلاص پڑھے اس نے ایک تہائی قرآن پڑھا۔ کثرتِ تلاوت کے باعث سعد بن معاذ کے جنازہ پر ستر ہزار فرشتوں نے نماز پڑھی۔ خدا اُسے اور اس کے والدین کو بخش دے گا۔ ۳۶۸
.. ہر مومن کے دل میں دو کان ہیں ایک میں فرشتہ پھونک مارتا ہے اور دوسرے میں وسواس خنّاس۔ خُدا مومن کی فرشتہ سے تائید کرتا ہے۔ ۴۰۷

محمدؐ بن علیؑ باقرؑ

.. جس نے اطاعت کی وہ نجات پاگیا۔ جس نے نافرمانی کی وہ نا امید و محروم ہوگیا۔ ۶۶
.. جو سورۂ قدر کو بلند آواز میں پڑھے اس نے راہِ خدا میں تلوار کھینچی جس نے آہستہ پڑھا وہ گویا اپنے خون میں غلطاں ہُوا۔ ۱۶۹
.. ہم شبِ قدر کو کیسے نہ جانیں فرشتے اس رات ہمارے گرد طواف کرتے ہیں۔ ۱۷۵
.. جو سورہ قارعہ کو پڑھے خدا اسے دجّال کے فتنہ اور اس پر ایمان لانے سے

محفوظ رکھے گا۔ ۲۳۰
.. میزانِ عمل میں سب سے زیادہ وزنی محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود کی تلاوت ہے۔ جس کا ظاہر باطن سے بہتر ہے قیامت میں اس کا میزانِ عمل ہلکا ہوگا۔ ۲۳۷
.. ستاروں کے ذریعہ بارش کی طلب، نسب پر فخر، خاندانی شرافت پر طعن کرنا جاہلیت کے اعمال ہیں۔ ۲۴۹
.. اسلام سے ایک درجہ بالاتر ایمان، پھر تقویٰ، پھر یقین بالاتر ہے۔ یقین کی حقیقت اللہ پر توکل کرنا ہے۔ ۲۵۰
.. جو شخص سورۂ ماعون فریضہ یا نافلہ نمازوں میں پڑھے تو خدا اس کے نماز روزہ کو قبول کرلے گا۔ ۳۰۸
.. اے محمدؐ! یہ ہمارے خدا ہیں تو بھی اپنے خدا کی تعریف کر، ہم اسے دیکھیں اور ادراک کریں۔ ۳۷۲
.. جو شخص نماز وتر میں معوذتین اور اخلاص تلاوت کرے گا اس کی نمازِ وتر قبول ہوگی۔ ۳۹۰، ۴۰۲۰

محمود

.. ابرہہ کے ہاتھی کا نام جس پر وہ سوار ہو کر کعبہ پر حملہ آور ہوا۔ ۲۹۳

معاذ بن جبل

.. ایک یتیم کے سر پر دستِ شفقت رکھنا، دعا دینا۔ ۱۱۵

مُعاویہ

.. خدا کی قسم قریش کے لیے علیؑ کے سوا کسی نے فصاحت و بلاغت کی بنیاد نہیں رکھی۔ ۲۴۶

مغیرہ بن شعبہ

.. جس نے اپنے بیٹے سے معاویہ کی تنقیص کی ۱۲۹، ۱۳۰

موسیٰؑ بن عمران (نبی)

.. میمنہ کا گلہ سے نکل جانا، تلاش کرنا، شفقت سے کندھے پر اُٹھا کر لانا، پس یہ پیش خیمہ تھا کہ انسانوں سے برتاؤ کے لیے پیغمبر منتخب کیا۔ ۱۱۳
.. فرعون کی طرف بھیجنا کہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔ آپ کی دُعا، رب الشرح لی صدری۔ ۱۲۲

نجاشی

.. روم کی ذیلی ریاست حبشہ کا حکمران ۲۹۱

نفس ذکیہ

.. حضرت امام حسن کے فرزند محمد بن عبداللہ

کالقب جو منصور دوانقی کے ہاتھوں ۱۴۵ھ میں شہید ہوئے۔ ۳۲۵

ورقہ بن نوفل

.. حضورؐ پاک پر وحی کا نزول۔ جناب خدیجہؑ کا دلجوئی فرمانا اور ورقہ بن نوفل کا مشورہ اور پیش گوئی ۱۴۸ تا ۱۵۱

ولید بن مغیرہ

.. پس پشت رسول پاکؐ کی غیبت اور سامنے طعن و تشنیع کرتا تھا۔ ۲۷۲

یوسفؑ بن یعقوبؑ

.. زلیخا سے گفتگو اور فرمانا انه من یتق و یصبر فان الله لا یضیع اجر المحسنین ۷۶

.. حکومت حاصل ہونے پر اللہ کی بارگاہ میں دعا اور شکریہ (یوسف: ۱۰۱) ۳۴۶

عُلماء ودانشور

آلوسی (مفسر روح المعانی) ۹۴، ۱۹۷
ابن ابی الحدید (شرح نہج البلاغۃ) ۱۲۹
ابن اثیر (کامل) ۳۵۶
ابن عساکر ۱۹۶
ابن مردویہ ۷۵
ابوالفتوح رازی ۱۴۸، ۲۲۳، ۲۳۵، ۳۳۲، ۳۳۵
ابونعیم اصفہانی ۱۹۷
احمد بن حنبل ۷۵
ثعلبی ۷۵
جلال الدین سیوطی ۱۹۶، ۳۳۲
حاکم حسکانی ۹۴، ۱۲۸
حر عاملی ۳۰۲
خطیب بغدادی ۷۵
خطیب خوارزمی ۱۹۷
راغب اصفہانی ۳۶، ۵۰۰، ۶۵، ۶۶، ۷۲، ۱۰۹، ۱۲۲، ۱۴۹، ۱۷۳، ۱۸۹، ۲۴۵، ۲۶۱، ۲۶۵، ۲۷۷، ۳۱۰، ۳۵۸، ۴۰۵
زمخشری ۱۲۹، ۲۳۵
سلیمان شیخ قندوری (ینابیع المودۃ) ۱۹۷
طباطبائی علامہ (یقین پر آپ کے ارشادات) ۲۵۳
طبرسی (مفسر) ۳۶، ۸۲، ۱۴۸، ۳۳۲، ۳۳۵، ۳۵۶، ۳۵۸
طبری موصلی ۷۵، ۱۱۹، ۱۹۷
فخرالدین رازی (تفسیر کبیر) ۹۲، ۱۱۹، ۱۸۷، ۲۳۵، ۲۶۱
قرطبی ۳۳۲

نیوٹن مشہور سائنسدان (قانونِ جاذبیت) ۳۸۱
واحدی ۷۵

کتب آسمانی

سورۂ بلد کی فضیلت اور مضامین

.. پہلے حصہ میں پُرمعنی قسمیں، انسانی زندگی کے شدائد، انسان پر اللہ کی نعمات، ناشکری، اصحاب میمنہ و مشئمہ۔ تلاوت کرنے والا قیامت میں خدا کے غضب سے مامون ہوگا۔ ۳۰، ۳۱

سورہ شمس کے مطالب و فضیلت

.. تہذیب نفس اور دلوں کو پاک کرنے والی آیات پر مشتمل ہے۔ خدا کی قسم کھائی ہے۔ سرکش اقوام کا ذکر بھی ہے۔ جو سورہ شمس پڑھے گا تو گویا اس نے ان چیزوں کے برابر صدقہ دیا جن پر سورج چاند طلوع کرتے ہیں۔ (رسول پاکؐ) ۵۷

سورۃ اللیل کے مطالب و فضیلت

.. مضامین قیامت، جزاء و سزا اور ان کے عوامل پر مشتمل ہیں۔ جو اس سورہ کو تلاوت کرے گا خدا اُسے اس قدر عطا کرے گا کہ وہ راضی ہو جائے گا۔ سختیوں سے نجات ملے گی اور دین و دنیا کی راہیں آسان ہوں گی۔ ۸۰

شانِ نزول

.. ابوالاحداح (مومن) کا ایک بخیل سے درخت خرما خرید کر رسول پاک کو ہدیہ کرنا۔ ۸۳
.. جنابِ امیرؑ اور حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت پر بحث ۹۲ تا ۹۴

سورۂ والضحیٰ کے مضامین اور فضیلت

.. اے رسول اللہ نے آپؐ کو ہرگز نہیں چھوڑا۔ اس قدر عطا کرے گا کہ آپؐ خوش ہو جائیں گے۔ بطورِ شکریہ یتیموں اور حاجت مندوں پر مہربانی کریں۔ والضحیٰ کی تلاوت سے خدا راضی ہوگا محمدؐ شفاعت فرمائیں گے۔ ہر یتیم اور سائل کے برابر نیکیاں ملیں گی۔ (رسول پاکؐ) ۹۹
.. والضحیٰ کو الم نشرح اور فیل کو لایلٰف میں جمع کر کے پڑھنا چاہیے۔ ۱۰۰

شانِ نزول

.. بقول ابن عباسؓ یہود نے ذوالقرنین اور اصحابِ کہف کے بارے میں سوال کیا۔ وحی کا موقوف رہنا۔ مشرکین کا استہزا کرنا۔ وحی کی آمد اور جواب۔ ۱۰۲

الم نشرح کے مضامین اور فضیلت

.. نعماتِ خدا کا شمار، تین نعمتوں کا ذکر، خدا کی طرف توجہ، عبادت کی تحریص۔ ۱۱۹

.. تلاوت کا ثواب یہ ہے کہ اس نے پیغمبر کو غمگین دیکھا ہو اور آپ کا غم دُور کیا ہو۔ ۱۲۰

سورۂ التین کی فضیلت و مطالب

.. انسان کی خلقت زیبا، تکامل و ارتقاء، انحطاط و پستی کی بحث، تلاوت کے ثواب میں دو نعمتیں سلامتی و یقین عطا ہوں گی۔ ۱۳۲

سُورۂ علق کے مضامین اور فضیلت

.. نزولِ وحی کا آغاز، ناشکرے انسانوں پہ گفتگو جو شخص کسی رات یا دن میں تلاوت کرے اگر اس دوران مرجائے تو شہید مبعوث ہوگا۔ ۱۴۵ ، ۱۴۶

شانِ نزول

.. غارِ حرا میں جبرئیلؑ کی آمد وحی کا آغاز۔ جناب خدیجہؑ کا دلجوئی فرمانا۔ ورقہ بن نوفل کا مشورہ ۱۴۸ تا ۱۵۱

وحی کا آغاز حرکتِ علمی کے ساتھ ہوا

.. انسان کی خلقت کے فوراً بعد قلم کی عزت کا بیان۔ حمد کے لائق ہے وہ خدا جس نے موت کے بعد حیات بخشی (رسولِ پاکؐ) آپ کی چند دعائیں۔ ۱۵۲ تا ۱۵۴

سورۂ قدر کے مطالب و فضیلت

.. شبِ قدر میں قرآن کا نزول۔ پیغمبرؐ کا خواب اور تسلّی۔ ثوابِ تلاوت یہ ہے کہ جیسے اس نے پورے ماہ روزے رکھے شبِ قدر کا احیاء کیا۔ (رسول پاکؐ) ۱۶۹

سورۂ بیّنہ کے مطالب و فضیلت

.. اہلِ کتاب سے گفتگو۔ نماز و زکوٰۃ کی تاکید۔ پیغمبرِ گرامی کی ہمہ گیر رسالت کے مضامین۔ ۱۸۴

.. خدا کی قسم! مقرب فرشتے زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت سے اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ جو تلاوت کرے گا فرشتے اس کی دنیا و دین کی حفاظت کریں گے۔ (رسول پاکؐ) ۱۸۴

سُورۂ زلزلہ کے مطالب و فضیلت

.. معاد کی گفتگو۔ انسان کے اعمال کی زمین گواہ ہے۔ نیک اور بد لوگوں کے گروہ اپنے اعمال کا نتیجہ پائیں گے جو اس سورہ کی تلاوت کرے۔ گویا اس نے سورۂ بقر کی تلاوت کی۔ اس کا ثواب، جو تھائی

قرآن تلاوت کرنے کے برابر ہے۔ (رسولِ پاکؐ) ۲۰۱

سورۂ والعادیات کے مطالب و فضیلت

.. قسموں پر تکیہ، معاد کی گفتگو، جہاد کے مسائل کفر و بخل کا ذکر ۲۱۵
.. تلاوت کرنے کا ثواب۔ مزدلفہ میں قیام کرنے والوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں ملیں گی۔ ۲۱۶
.. جو والعادیات پڑھے۔ جناب امیر کے ساتھ مبعوث ہوگا۔ (صادقؑ) ۲۱۶

شانِ نزول

.. یہ سورۂ ذات السلاسل کی جنگ کے بعد نازل ہوئی۔ مساعی صلح ناکام ہو کر جنگ ہوئی۔ جناب امیرؑ نے شدید حملہ کر کے درہم برہم کر دیا۔ پیغمبر خداؐ نے رات گزرنے کے بعد صبح کی نماز میں اس سورہ کی تلاوت فرمائی۔ ۲۱۸ ، ۲۱۹

سورۂ قارعہ کے مطالب و فضیلت

.. معاد کی گفتگو اعمال کا تولا جانا۔ جزا و سزا۔ جو سورۂ قارعہ کو پڑھے گا۔ دجال کے فتنہ اور اس پر ایمان لانے سے محفوظ رہے گا۔ (امام محمد باقرؑ) ۲۳۰

❖ ❖ ❖

سورۂ تکاثر کے مطالب و فضیلت

.. موہوم مطالب کی بنیاد پر فخر کرنے والوں کی سرزنش و ملامت، قیامت و معاد اور نارِ جہنم پر تنبیہ۔ نعمتوں کے بارے میں سوال، جو تلاوت کرے خدا اس سے نعمتوں کا حساب نہ لے گا۔ (رسولِ پاکؐ) واجب اور مستحب نمازوں میں اس کی تلاوت شہداء کا درجہ عطا کرے گی (صادقؑ) ۳۴۱

شانِ نزول

.. ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرنے والے قبائل کے بارے میں نازل ہوا قریش مکہ یا انصار کے دو گروہوں یا کوئی اور فخر و مباہات کی نفی واضح ہے۔ ۳۴۴

سورۂ والعصر کے مطالب و فضیلت

.. قرآن کے تمام علوم و مقاصد کا خلاصہ ایمان اور عمل صالح اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت۔ جو والعصر کو نافلہ نمازوں میں پڑھے گا۔ قیامت میں نورانی چہرہ لبِ خنداں، آنکھوں میں نعمتوں کی ٹھنڈک ہوگی۔ (جناب صادقؑ) ۲۵۷

سورۂ ہمزہ کے مطالب و فضیلت

.. مال جمع کرنا، مفلسوں کو حقارت سے دیکھنا ان کے لیے دوزخ کی آگ۔ ثوابِ تلاوت پر رسول پاکؐ اور جنابِ صادق کی احادیث ۲۶۹

شانِ نزول

.. یہ سورہ ولید بن مغیرہ کے بارے میں جو حضورؐ پر طعن و تشنیع اور پسِ پشت غیبت کرتا تھا نازل ہوئی۔ بعض دوسرے لوگوں اخنس بن شریق، امیہ بن خلف اور عاص بن وائل کے بارے میں بھی۔ ۲۷۲

سورۂ فیل کے مطالب و فضیلت

.. مشہور تاریخی داستان کا بیان جو رسولِ پاکؐ کی ولادت کے سال واقع ہوئی۔ خدا نے لشکر کو برباد کر دیا۔ ۲۸۶

.. جو سورۂ فیل کو واجب نمازوں میں پڑھے گا۔ قیامت میں ہر پہاڑ ہموار زمین، ہر ڈھیلا اس کی نماز گزاری کی گواہی دے گا۔ (جناب صادقؑ) ۲۸۷ ، ۲۸۸

شانِ نزول

.. ابرہہ کا لشکر لے کر کعبہ پر چڑھائی کرنا خدائی مدد کی آمد۔ اور لشکر کا تباہ و برباد ہو جانا۔ ۲۹۰

سورۂ قریش کے مطالب و فضیلت

.. یہ سورہ فیل کی تکمیل۔ قریش پر خدا کی نعمت الطاف و محبت کا بیان۔ ۳۰۲

.. جو شخص یہ سورہ تلاوت کرے اُسے خانۂ کعبہ کا طواف کرنے والوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں دی جائیں گی۔ (رسولِ پاکؐ) ۳۰۲

سورۂ ماعون کے مطالب و فضیلت

.. قیامت اور منکرینِ قیامت کی صفات اور ایمان کو پانچ مرحلوں میں بیان کیا ہے جو واجب نمازوں میں یہ سورہ تلاوت کرے گا اللہ اس کی نمازوں اور روزوں کو قبول کرے گا۔ ۳۰۸

سورۂ ماعون کے مباحث کی جمع بندی

.. روزِ جزاء کا انکار، یتیموں کو حقیر جاننا، بھوکوں کو کھانا کھلانا، نماز سے غفلت، ریاکاری، لوگوں سے عدم تعاون، حقیر سی چیز بھی نہ دینا۔ ۳۱۳ ، ۳۱۴

سورۂ کوثر کے مطالب و فضیلت

.. عاص بن وائل کا آپؐ کو ابتر کہنا۔ قریش کا خوش ہونا۔ اللہ کی بشارت۔ جو یہ سورہ تلاوت کرے گا۔ خدا اُسے جنت کی نہروں سے سیراب کرے گا۔ (رسولِ پاکؐ) ۳۲۰

سورہ کافرون کے مطالب و فضیلت

- مکی سورہ، مشرکین کی ہٹ دھرمی اور رسولِ پاک کی ثابت قدمی، جو سورہ کافرون تلاوت کرے تو گویا اس نے چوتھائی قرآن پڑھا۔ روزِ قیامت گھبراہٹ سے امان میں ہوگا۔ (رسول پاکؐ) ۳۲۹ ، ۳۳۰
- سونے سے پہلے کافرون کو پڑھ کافرون چوتھائی قرآن ہے۔ (صادقؑ) ۳۳۰

سورۂ کافرون میں تکرار کس لیے

- ایک مضمون کی تکرار پر مفسرین کی رائے ۳۳۴ تا ۳۳۷

سورہ نصر کے مطالب و فضیلت

- اللہ کی مدد سے ایک عظیم کامیابی اور لوگوں کے جوق در جوق اسلام میں داخلہ کی بشارت دی گئی۔
- جو یہ سورہ تلاوت کرے تو ایسا ہے کہ وہ فتح مکہ کے دن رسولؐ کے ساتھ تھا۔ (رسول پاکؐ) جو یہ سورہ نافلہ یا واجب نمازوں میں تلاوت کرے تو خدا اُسے تمام دشمنوں پر فتحیاب کرے گا۔ (جناب صادقؑ) ۳۴۱ ، ۳۴۲

سورہ تبت کے مطالب و فضیلت

- ابولہب اور اس کی بیوی کی سرزنش
- جو شخص یہ سورہ تلاوت کرے اللہ اُسے اور ابولہب کو ایک جگہ جمع نہیں کرے گا۔ ۳۵۴

شانِ نزول

- پیغمبرِ اکرم نے انذار کے لیے قریش کو آواز دی۔ وہ سب جمع ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ایک خدا کی عبادت کرو ابولہب نے طعن و تشنیع کی۔ یہ سورہ نازل ہوا۔ ۳۵۵

سورۂ اخلاص کے مطالب و فضیلت

- توحید پر گفتگو، سورۂ اخلاص ایک تہائی قرآن ہے۔ (رسول پاکؐ)
- سعد بن معاذؓ کے جنازہ پر ستر ہزار فرشتوں نے نماز پڑھی کہ وہ سورہ اخلاص کا ورد کرتے تھے۔ (حدیثِ رسول بذریعہ امام صادقؑ) جو پانچ وقت کی نمازوں میں ایک دفعہ بھی سورۂ اخلاص نہ پڑھے وہ نمازی نہیں ہے۔ جو خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ سورۂ اخلاص کو ترک نہ کرے۔ ۳۶۸

سورۂ فلق کے مطالب و فضیلت

- تمام مسلمانوں کو تمام اشرار سے پناہ مانگنے کی تعلیم۔

.. مجھ پر ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں کہ ان کی مثل و مانند اور نہیں ہیں۔ وہ دو سورتیں فلق اور ناس ہیں۔ (رسول پاک) ۳۹۰
.. جو شخص وتر میں سورۂ فلق و ناس و اخلاص پڑھے اس کی نماز وتر قبول ہوگی (امام باقرؑ) ۳۹۰

سورۂ ناس کے مطالب و فضیلت

.. تمام وسوسے ڈالنے والوں کے شر سے خدا کی پناہ طلب کریں۔
.. جو شخص نماز وتر میں سورہ توحید و فلق و ناس کی تلاوت کرے اُسے کہا جائے گا کہ تجھے بشارت ہو کہ تیری نمازِ وتر قبول ہوئی۔ (امام باقرؑ) ۴۰۲

کتب تاریخ تفسیر و سیرت

المنجد ۵۳
اصولِ کافی ۹۵ ، ۲۰۲
۲۴۸ ، ۲۷۴ ، ۳۱۲
۳۱۳ ، ۳۱۵ ، ۳۶۹
اوّلین دانشگاہ و آخرین پیغمبر ۱۲۹
بحار الانوار ۲۵ ، ۲۶ ، ۹۵ ، ۱۱۳
۱۳۹ ، ۱۴۰ ، ۲۱۹
۲۳۵ ، ۲۴۹ ، ۲۵۰
۲۵۱ ، ۲۷۴ ، ۲۸۱
۲۹۰ ، ۲۹۲ ، ۳۶۱
۲۶۳ ، ۳۷۴ ، ۳۷۵
۳۷۶ ، ۳۷۷ ، ۳۷۹
۳۹۶
بلوغ ادب ۲۹۰ ، ۲۹۴
تحف العقول ۲۶۲
تفسیر ابوالفتوح رازی ۵۲ ، ۵۳ ، ۱۰۵ ، ۲۳۵ ، ۳۳۲ ، ۳۵۶
" القرآن ۳۵۹
" المیزان ۵۲ ، ۳۶۷
۳۷۴ ، ۴۰۸
" برہان ۱۴۶ ، ۱۷۴ ، ۱۷۵
" بیضاوی ۲۲۳
" درّ المنثور ۶۷ ، ۱۷۳ ، ۱۹۶
۲۵۰ ، ۲۶۶ ، ۳۳۲
۳۵۶
" رُوح البیان ۳۹ ، ۷۳
" رُوح المعانی ۹۴ ، ۱۲۹ ، ۱۶۹
۱۹۷ ، ۲۰۱
" طبری ۱۹۷
" طنطاوی ۲۷۹
" عبدہٗ ۱۱۰ ، ۲۹۷
" علی بن ابراہیم ۳۳۵
" فخر الدین رازی ۴۹ ، ۹۲ ، ۱۱۴
۱۲۰ ، ۱۶۱ ، ۱۷۵
۱۷۷ ، ۲۳۵ ، ۲۴۷
۲۶۲ ، ۳۲۵ ، ۳۵۶

تفسیر فی ظلال القرآن ۱۶۳ ، ۳۵۶
• قرطبی ۴۶ ، ۴۹ ، ۷۱
۹۲ ، ۱۱۲ ، ۱۲۸
۲۲۰ ، ۳۳۲ ، ۳۵۶
• کشاف ۸۶ ، ۱۲۹ ، ۲۳۵
• مجمع البیان ۳۱ ، ۳۵ ، ۳۶
۳۷ ، ۳۸ ، ۳۹
۴۶ ، ۴۹ ، ۵۱
۵۷ ، ۶۶ ، ۶۷
۷۱ ، ۷۲ ، ۸۰
۸۲ ، ۸۳ ، ۹۹
۱۰۲ ، ۱۰۵ ، ۱۱۰
۱۱۱ ، ۱۱۴ ، ۱۱۵
۱۱۹ ، ۱۲۰ ، ۱۲۳
۱۳۳ ، ۱۴۲ ، ۱۴۸
۱۴۹ ، ۱۵۸ ، ۱۶۹
۱۸۴ ، ۲۰۲ ، ۲۰۶
۲۲۰ ، ۲۲۴ ، ۲۳۰
۲۴۱ ، ۲۴۷ ، ۲۵۳
۲۵۷ ، ۲۵۹ ، ۲۸۸
۲۹۰ ، ۲۹۴ ، ۳۰۲
۳۰۸ ، ۳۱۹ ، ۳۲۰
۳۲۴ ، ۳۳۲ ، ۳۴۲
۳۴۶ ، ۳۵۱ ، ۳۵۴
۳۵۶ ، ۳۵۸ ، ۳۶۸
۳۶۹ ، ۳۷۷ ، ۴۰۷

تفسیر نورُ الثقلین ۳۱ ، ۳۸ ، ۴۲
۵۱ ، ۷۵ ، ۱۱۴
۱۲۷ ، ۱۳۷ ، ۱۷۷
۲۰۶ ، ۲۳۷ ، ۲۳۸
۲۵۰ ، ۲۶۰ ، ۲۷۶
۲۷۷ ، ۲۸۱ ، ۲۹۰
۳۱۲ ، ۳۱۳ ، ۳۹۱
توحید صدوقؒ ۲۸۱
دائرۃ المعارف ۱۳۷
روضۃ الواعظین ۲۹۰
سیرۃ ابن ہشام ۲۹۰ ، ۲۹۴
شرح نہج البلاغۃ ۱۳۰ ، ۲۴۶
شواہد التنزیل ۷۵ ، ۹۴
۱۲۷ ، ۱۹۴
صحیح مسلم ۲۵۰
صواعق محرقہ ۱۹۶
فروع کافی ۱۱۲
قاموس اللغت ۶۶
کامل ابن اثیر ۳۵۱ ، ۳۵۶
کتاب وسائل (حُر عاملی) ۳۰۲
کفایت الخصام ۱۹۷
لسان العرب ۷۲
لئالئ الاخبار ۲۰۷
محجۃ البیضاء ۷۶
مفرداتِ راغب ۳۶ ، ۵۰ ، ۶۵
۶۶ ، ۷۲ ، ۱۰۹

۱۲۲، ۱۴۹، ۱۷۳
۱۸۹، ۲۴۵، ۲۶۱
۲۶۵، ۲۷۷، ۳۱۰
۳۵۸ ، ۴۰۵
مقائیس اللغت ۲۷۶
نور الابصار ۱۹۶
نہج البلاغۃ ۲۶، ۲۷، ۴۵
۵۰، ۶۵، ۷۲
۱۱۲، ۱۲۹، ۲۴۶
۲۶۲ ، ۲۶۳
۳۸۰ ، ۴۰۵
نہج الفصاحت ۱۱۱
وسائل الشیعہ ۳۱۴ ، ۳۱۵
نیا بیع الموودہ ۱۹۷

لغاتُ القرآن

الف

ابتر : بے اولاد، بلا عقب، مقطوع النسل۔ ۳۱۹

اثرن : مادہ 'اثارہ' غبار یا دھوئیں کو پراگندہ کرنا۔ ۲۲۲

اثقال : جمع 'ثقل' (وزن فکر) کی، بوجھ، بار ۲۰۵

احد : مادہ 'وحدت' واحد ۳۷۴

استغنیٰ : بے نیازی چاہتا ۸۶

اشتات : شت (بروزن شط) کی جمع پراگندہ، متفرق۔ ۲۰۸

اعطیٰ : راہِ خدا میں خرچ کرنا۔ ۸۵

الہاکم : مادہ 'لہو' چھوٹے چھوٹے کاموں میں مشغول ہو جانا۔ ۲۴۵

الہمہا : مادہ 'الہام' کسی چیز کا نگلنا، پینا خدا کی طرف سے کسی روح میں کسی مطلب کو القا کرنا۔ ۶۴

افتحم : مادہ 'اقتحام' سخت اور خوفناک کام میں داخل ہونا۔ ۵۰

انقض : مادہ نقض، رسّی کی گرہ کھولنا۔ 'انتقاض' وہ آواز جو عمارت کے ٹکڑوں کو جدا کرتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ عہد و پیمان توڑنا۔ ۱۲۴

ب

بُخل : اعطیٰ کا نقطۂ مقابل، کنجوسی ۸۶

بُعثر : مادہ "بعثرہ" (بروزن منقبہ) زیر و زبر کرنا، باہر نکالنا۔ ۲۲۵

بیّنہ : روشن دلیل یا رسول پاکؐ ۱۸۷

ت

تب : تباب (بروزن خراب) دائمی خسارہ ۳۵۸

تردّی : مادہ 'ردایت' ردّی ہلاکت،

بلندی سے گرنا۔ ۸۷

تضلیل : گمراہی ۔ گمراہ کرنا۔ ۲۹۵

تقویٰ : مادہ "وقایہ" نگہداری، اپنے وجود کو گناہوں اور آلودگیوں سے محفوظ رکھنا۔ ۶۵

تقہر : مادہ "قہر" ایسا غلبہ جس میں تحقیر بھی ہو۔ ۱۰۹ ، ۱۱۰

تکاثر : مادہ "کثرت" تفاخر، مباہات، بڑائی جتلانا۔ ۲۴۵

تلاہا : پیچھے آنا۔ ۶۱

تلظّی : مادہ "لظیٰ" (بروزن قضا) خالص شعلہ، جہنم۔ ۹۰

تواصوا : مادہ "تواصی" بعض افراد کا بعض دوسرے افراد کو نصیحت کرنا۔ ۲۶۵

تنہر : مادہ "نہر" سختی سے دھتکارنا نہر جو پانی کو تیزی سے دھکیلتی ہے۔ ۱۱۰

ج

جلاہا : مادہ "تجلیہ" اظہار و ایراد، روشنی کا پھیل جانا۔ ۶۱

جید : (بروزن دید) گردن ۳۶۱

ح

حامیہ : مادہ "حمیٰ" (بروزن نفی) حرارت کی شدت، جہنم کی آگ ۲۳۶

حسنیٰ : حسن کی مونث، بہت زیادہ اچھی ۸۵

خصّل : مادہ "تحصیل" مغز کو چھلکے سے باہر نکالنا، حاصل کرنا، صاف کرنا۔ ۲۲۶

حطمہ : مادہ "حطم" صیغہ مبالغہ، درہم برہم کرنا، جہنم۔ ۲۷۷

حنفاء : مادہ "حنف" حنیف کی جمع۔ گمراہی سے راہ مستقیم پر مائل ہونا۔ ۱۸۹

خ

خاب : مادہ "خیبہ" مطلوب تک نہ پہنچنا محروم ہونا، نقصان اٹھانا۔ ۶۶

خسر : (بروزن عسر) سرمایہ کا کم ہوتے جانا (فخر رازی نے ایک برف فروش سے خسران کے معنیٰ سیکھے جو کہے جا رہا تھا۔ اس پر رحم کرو جس کا مال پگھلا جا رہا ہے۔ ۲۶۱

خناس : مادہ "خنوس" (بروزن خسوف) صیغہ مبالغہ۔ جمع ہونا، پیچھے جانا۔ ۴۰۵

د

دسّاہا : مادہ "دس" کسی چیز کو کراہت و ناپسندیدگی سے داخل کرنا۔ دسیسہ نقصان دہ، مخفی کام۔ (تزکیہ کا نقطۂ مقابل) ۶۶

دمدم : مادہ "دمدمہ" ہلاک کرنا، عذاب مکمل سزا ۷۲

ز

زبانیہ : 'زبنیہ' کی جمع زبن (بروزن تمن) دفع کرنا۔ ضرب لگانا۔ فرشتگان عذاب، دوزخ کے مامورین۔ ۱۶۳

زرتم : زیارت مادہ 'زور' (بروزنِ قول) سینہ کا اوپر کا حصہ۔ زیارت و ملاقات کرنا۔ ۲۴۵

زکّٰھا : مادہ 'تزکیہ' رشد و نمو ۶۵

س

ساہون : مادہ 'سہو' خطا جو غفلت کی بنا پر ہو۔ ۳۱۱

سجیل : (فارسی سنگ + گِل) ایسی چیز جو پتھر جیسی سخت اور مٹی جیسی نرم نہ ہو۔ ۲۹۵

سواہا : مادہ 'تسویہ' انسان کے روحی قوٰے۔ صیحۂ عظیم، صاعقہ اور زلزلہ سے صفایا کرنا۔ ۴۲

سینین : سینہ کی جمع درخت ۱۲۶

ش

شانئ : مادہ 'شنئان' (بروزن ضربان) عداوت، دشمنی، کینہ وری بدخلقی ۳۲۶

شتّٰی : مادہ "شت" شتیت کی جمع۔ جماعت کو منتشر کرنا۔ ۸۵

ص

صحف : صحیفہ کی جمع وہ اوراق جن پر لکھا جاتا ہے۔ ۱۸۸

صمد : وہ ذات جو دائم، ازلی اور ابدی ہو، دیگر تشریحات۔ ۳۷۶

ض

ضحٰی : سورج کی روشنی پھیلنا ۶۱

ضبح : (بروزن مدح) تیزی و سرعت سے دوڑنا۔ ۲۱۹

ط

طحاہا : مادہ طحو (بروزن سہو) بچھانا، پھیلانا دھکیلنا، دور کرنا۔ ۶۳

طغوٰی : طغیان حد سے زیادہ تجاوز کرنا۔ حدودِ الٰہی سے تجاوز کرنا۔ ۷۰

ع

عائل : عیال دار شخص، فقیر کے معنٰی میں بھی مستعمل ہے۔ ۱۰۹

عادیات : مادہ 'عدو' (بروزن صبر) گزرنا، جدا ہونا، دوڑنا۔ ۲۱۹

عدد : مادہ 'عد' شمار کرنا، گننا۔ مادہ 'عدہ' (بروزن غدہ) اموال کو بڑے دن کے لیے ذخیرہ کرنا۔ ۲۷۵

عصف : (بروزنِ حذف) وہ پتے جو زراعت پر ہوتے ہیں اور خشک ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ مُراد گھاس۔ ۲۹۵

عقبیٰ : اختتام، اِنتہا، انجام کار ۷۴

عقروہا : مادہ 'عقر' (بروزنِ ظلم) اصل جڑ، بنیاد۔ ۷۱

عمد : عمود لکڑی یا لوہے کے قطعات ۲۷۸

عہن : دُھنی ہوئی رنگین روئی ۲۳۴

عیشہ راضیہ : خوش و خرم زندگی ۲۳۶

غ

غاسق : مادہ غسق (بروزنِ شفق) نصف شب، گھنگھور تاریکی، ہجوم کرنا حملہ آور ہونا۔ ۳۹۳

ف

فجور : مادہ 'فجر'۔ وسیع شگاف، پردۂ شب چاک ہونا۔ ارتکابِ گناہ کا دیانت کے پردہ کو چاک کرنا۔ ۶۴

فراش : فراشہ کی جمع۔ پروانہ، ٹڈی دل ۲۳۳

فلق : مادہ 'فلق' (بروزنِ شفق) کسی چیز میں شگاف کرنا۔ ایک شے کو دوسری سے جُدا کرنا (بروزنِ خلق) پردۂ شب کو چاک کرنا۔ صبح ہونا، طلوعِ صبح۔ زندہ موجودات کا تولّد (ہر موجود کی خلقت و آفرینش) ۳۹۲

ق

قارعہ : مادہ 'قرع' (بروزن فرع) کسی چیز کو دوسری چیز پر گرانا، جس سے سخت آواز پیدا ہو۔ اہم اور سخت حادثہ۔ قیامت کا ایک نام ۲۳۳

قدحًا : چنگاری نکالنے کے لیے دو پتھروں یا لکڑیوں کو ٹکرانا ۲۲۱

قریش : مادہ 'قرش' (بروزنِ فرش) یہ قبیلے عام طور پر تجارت میں مصروف رہتے تھے۔ ۳۰۵

ک

کبد : (وزنِ حسد) وہ درد جو انسان کے کبد (سیاہ جگر) کو عارض ہوتا ہے ہر قسم کی تکلیف و مشقت ۳۶

کنود : بنجر زمین، ناشکرا، بہت سے معنی۔ ۲۲۳

ل

لُبد : (بروزن لغت) تہ بہ تہ۔ انبوہِ کثیر مُراد بہت زیادہ مال۔ ۳۸

لمزہ : مادہ 'لمز' (بروزن رمز) غیبت کرنا عیب جُوئی کرنا۔ ۲۳۷

لنسفعًا : مادہ سفع (بروزن عفو) پکڑنا۔

اور سختی سے کھینچنا۔ نشان زدہ کرنا۔ ذلیل کرنا۔ ۱۶۱
لَہَب : آگ کا شعلہ۔ نارِ جہنم۔ ۳۶۰
لینبذن : مادہ نبذ (بروزن سبز) حقارت اور بے قدری سے کسی چیز کو دُور پھینکنا۔ ۲۷۷

م

ماعون : مادہ 'معن' (بروزن شأن) کم تھوڑی، کم قیمت اور بے قدر چیز۔ ۳۱۲
مترب : مادہ 'ترب' (بروزن طرب) تراب یا خاک۔ ۵۲
مسغبہ : مادہ سغب (بروزن غضب) بھوک ۵۱
مشئمہ : مادہ شوم : میمنہ کا نقطہ مقابل بدبخت، بائیں طرف یا بائیں ہاتھ والے۔ ۵۳
مطہرہ : ہر قسم کے کذب، شرک، دروغ باطل اور شیاطین جن و انس کے دخل دینے سے پاک۔ ۱۸۸
مغیرات : مادہ 'اغارہ' مغیرہ کی جمع ہجوم کرنا۔ دشمن پر حملہ کرنا۔ ۲۲۱
مقابر : مقبرہ کی جمع قبر کنایۃ موت۔ ۲۴۵
مقربہ : قرابت داری۔ ۵۱
ممنون : مادہ 'من' ختم ہونا، کم ہونا۔ ۱۴۱
من علق : کسی چیز میں چپک جانا۔ ۱۵۰
منفوش : مادہ 'نفش' (بروزن نقش) اون کو پھیلانا۔ دُھننا۔ ۲۳۴
موازین : میزان کی جمع۔ تولنے کا آلہ ترازو۔ ۲۳۴
موریات : مادہ 'ایراء' موریہ کی جمع آگ بھڑکانا۔ ۲۲۱
موصدہ : مادہ ایصاد۔ دروازہ بند کرنا گھیرے میں لینا۔ دروازہ بند کرنا اور محکم کرنا۔ ۵۳، ۲۷۸
میمنہ : مادہ یمن۔ صاحبان برکت ۵۳

ن

نادی : مادہ 'ندا' پکارنا۔ مجلسِ عمومی (وہ جماعت جو دارالندوہ میں جمع ہوتی تھی۔ ۱۶۳
ناصیہ : پیشانی۔ سر کے اگلے حصے کے بال۔ ۱۶۰، ۱۶۱
نشرح : مادہ 'شرح'۔ کشادہ کرنا۔ بہت سے معنی ۱۲۲
نفاسات : مادہ نفس (بروزن حبس) پھونکنا، دم کرنا۔ ۳۹۴
نقع : (بروزن نفع) غبار۔ نقیع، ساکن اور ٹھہرا ہوا پانی۔ ۲۲۲

و

وزر : بوجھ ، وزیر اسی کا مشتق ہے۔ ۱۲۴

وسواس : ایسی آہستہ آواز جو آلاتِ زینت کے ٹکرانے (زیورات کی کھنک) سے پیدا ہوتی ہے دل وجان سے پیدا ہونے والے خیالات (وسوسہ ڈالنے والا) ۴۰۵

وقب : مادہ 'وقب' (بروزن شفق) (بروزن نقب) گڑھا ، خندق ۳۹۴

ونحر : اونٹ کو حلال کرنا۔ ۳۲۳

ھ

ھاویہ : مادہ ھوٰی ۔ سقوط ، گرنا ، دوزخ کا ایک نام۔ ۲۳۶

ھمزہ : مادہ 'ہمز' توڑنا ۲۷۳

ی

یافوخ : سر کا اگلا حصہ ، بچوں کا یہ حصہ بہت نرم ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ہڈی میں تبدیل ہوتا ہے۔ (یہ لفظ حدیث سے ہے) ۷۱

یحض : مادہ 'حض' کسی چیز کے لیے دوسروں کو تحریص وترغیب دینا۔ ۳۱۰

یدع : مادہ 'دع' (بروزن حد) سختی سے دُور کرنا۔ غصہ سے جھڑکنا۔ ۳۱۰

یسری : مادہ 'یسر' گھوڑے کو لگام دینا زین کسنا۔ سواری کے لیے تیار کرنا۔ ہر طرح کی آسانی مُراد ہے۔ ۸۶

یصدر : مادہ 'صدر' (بروزن صبر) اونٹوں کو پانی پلانے کی جگہ سے نکلنا۔ مختلف قوموں کا قبروں سے نکل کر حساب دینے کے لیے آنا۔ ۲۰۸

❖ ❖ ❖

متفرق موضوعات

آنکھ، زبان اور ہدایت کی نعمت

.. ہم نے انسان کو آنکھ اور زبان کی نعمت دی۔ خیر و شر کی معرفت اور ہدایت کی نعمت عطا کی۔ بھلائی اور برائی دونوں راستے دکھائے۔ ۴۰ ، ۴۲

آنکھ کی حیرت انگیزیاں

تصویر سازی میں آنکھ کے طریقِ کار کی تفصیلی بحث۔ ۴۲ تا ۴۵

ابرہہ آنے میں جلدی نہ کرے۔

ابرہہ کا آنا۔ اشراف مکّہ کے اموال لُوٹ کر خوف وہراس پیدا کرنا، بالآخر ابابیل کے جُھنڈ سے تباہ ہونا۔ ۲۹۴ تا ۲۹۶

ابولہب ہلاک ہو جائے

.. ابولہب کے ہاتھ کٹ جائیں۔ اس نے جو مال کمایا۔ اس نے اُسے کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ وہ جلد ہی داخلِ جہنم ہوگا اور اس کی بیوی جو ایندھن اٹھائے پھرتی ہے۔ اس کی گردن میں خرمے کی چھال کی رسّی ہے۔ ۳۵۸ تا ۳۶۲

اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ۔

اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے سارے جہاں کو خلق کیا، انسان کو پیدا کیا۔ اس کا ذکر کرو جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔ ۱۴۷ تا ۱۵۴

اس گھر کے پروردگار کی عبادت کرنی چاہیئے۔

.. ہم نے اصحابِ فیل کو تباہ کیا تاکہ قریش اس سرزمین سے الفت کریں اور آپؐ کے ظہور کے مقدمات فراہم ہوں۔ سورۂ قریش کی تفسیر۔ ۳۰۴ تا ۳۰۶

اِس مقدس شہر کی قسم

.. وہ شہر کہ جس میں تو ساکن ہے کہ انہوں نے تیرے احترام کی ہتک کی ہے۔ ۲۵ تا ۲۹

اللہ بے مثال ہے۔

سورۂ اخلاص کی تفسیر ۳۷۱ تا ۳۸۵

* * *

انجیر و زیتون کے بے شمار خواص

.. خواص پر، اطباء دانش وروں اور آئمہ کے اقوال۔ ۱۳۷ تا ۱۴۰

انفاق اور جہنم کی آگ سے دوری

.. جو لوگ متقی ہیں اور نیک عمل انجام دیتے ہیں آگ سے بچے رہیں گے۔ ۸۹

انقطاعِ وحی کا فلسفہ

.. وحی میں تاخیر سے یہ ثابت ہوا کہ پیغمبر اکرمؐ دین کے معاملہ میں خدائی احکام کے قطعی تابع ہیں۔ اپنی طرف سے نہ کچھ کہتے ہیں نہ کرتے ہیں۔ ۱۰۵

بُت پرستوں سے ہرگز مصالحت نہیں ہوسکتی۔

.. اور نہ تم اس کی پرستش کروگے جس کی میں پرستش کرتا ہوں اور نہ میں ہرگز ان کی پرستش کرونگا جن کی تم پرستش کرتے ہو تمہارا دین تمہارے لیے میرا دین میرے لیے کافی ہے۔ ۳۳۲ تا ۳۳۴

بہترین و بدترین مخلوق

.. جو اس جدید دین سے کافر ہوگئے وہ دوزخی ہیں اور وہ لوگ جو ایمان لائے ان کی جزا بہشت ہے۔ خدا اُن سے خوش اور وہ خدا سے خوش ہیں۔ ۱۹۲ تا ۱۹۴

بے بصیرت رشتہ داری

.. جس رشتہ داری میں ایمان اور عقیدہ کا رشتہ نہ ہو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ۳۶۳

بیدار مجاہدین کی قسم

.. دوڑتے گھوڑوں کی قسم۔ جو اپنے سموں سے چنگاریاں نکالتے اور صبح سے قبل دشمن کی صفوں میں در آتے ہیں۔ انسان ناشکرا، مال سے محبت رکھتا ہے۔ وہ نہیں جانتا قبروں سے مُردے زندہ ہوں گے۔ سینہ کے راز ظاہر ہو جائیں گے۔ ان کا رب واقف کار ہے۔ ۲۱۸ تا ۲۲۶

تفسیر نمونہ اردو ترجمہ

.. تمام جلدوں کی اجمالی فہرست ۴۱۱ تا ۴۱۲
.. اجتماعی کام کا طریق کار ۴۱۳ تا ۴۱۵
.. کلام حق تفسیر نمونہ کے ذریعہ جلوے دکھاتا ہے۔ (اشعار) ۴۱۷ تا ۴۱۹
.. مکتب قرآن ۴۲۰

تقویٰ اور خدائی امدادیں۔

.. رات کی قسم جب وہ ڈھانپ لے، دن کی قسم جب وہ روشن ہو۔ قسم ہے اس کی جس نے مذکر و مونث پیدا کیے۔ جو راہِ خدا میں انفاق کرے اس کی جزا حسنیٰ۔ جو جھٹلائے اس کے لیے عذاب ہے۔ ۸۴ تا ۸۷

تکاثر و تفاخر کی مصیبت

.. مال و اولاد کی کثرت کے تفاخر نے تمھیں مشغول کر لیا ہے۔ یہاں تک کہ گور کنارے پہنچ گئے۔ تمھیں عنقریب پتہ چل جائے گا۔ اگر آخرت پر یقین ہوتا تو بے جا فخر نہ کرتے۔ جہنم کو دیکھو گے۔ نعمتوں کا سوال ہو گا۔ ۲۴۴ تا ۲۵۰

تہذیبِ نفس ایک اخلاقی وظیفہ

.. فلاح و رستگاری تزکیہ نفس میں ہے۔ تزکیہ کو ترک کرنا بدبختی ہے۔ ۷۵ - ۷۶

تہذیبِ نفس کے بغیر نجات ممکن نہیں۔

.. گیارہ یا سات قسمیں ہیں۔ بیشتر قسموں کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ پس زمین پر سورج کی حرارت سے زندگی اور اس کی رونق قائم ہے۔ ۶۰ تا ۶۷

جادو کی تاثیر اور حاسدوں کا شر

.. جادو کی تاثیر کا اجمالی طور پر قبول۔ اس سے پناہ مانگنے کا مطلب کیا ہے؟ حسد ایک شیطانی عادت اور گناہانِ کبیرہ کا سرچشمہ ہے۔ ۲۹۵، ۲۹۶

جاودانی دین

.. اہلِ کتاب نے اختلاف نہیں کیا مگر واضح دلائل اور سچے پیغمبرؐ کی دعوت کے بعد۔ ۱۸۶ تا ۱۹۰

جب خدا کی مدد اور کامیابی آپہنچے

.. تو دیکھے گا کہ لوگ جوق در جوق خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ اپنے ربّ کی حمد و تسبیح کرو۔ استغفار کرو اللہ بخشنے والا ہے۔ ۳۴۳ تا ۳۴۶

جس دن انسان اپنے تمام اعمال دیکھے گا۔

.. زمین کا شدت سے لرزنا۔ اندر کے بھاری بوجھ نکالنا۔ انسان کہے گا اسے کیا ہوا۔ سب خبریں بیان کرنا۔ خدا نے اُسے وحی کی ہے۔ لوگ گروہوں کی صورت میں قبروں سے نکلیں گے۔ پس چھوٹی سے چھوٹی نیکی و بدی سامنے آجائے گی۔ ۲۰۳ تا ۲۰۹

حضرت فاطمہؑ اور کوثر

.. اللہ تعالیٰ نے قریش مکہ کے ابتر سے متہم کرنے کے بدلے اپنے رسولؐ کو فاطمہؑ کے ذریعے خیرِ کثیر عطا کی۔ ۳۲۴ ۳۲۵

خدا تیرے اعمال کو دیکھتا ہے۔

انسان سرکشی کرتا ہے، خود کے بے نیاز سمجھتا ہے۔ سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔ جو نماز سے منع کرے وہ مستحق عذاب نہیں ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ یہ لوگوں کو تقویٰ کا حکم دے۔ کیا نہیں جانتا کہ خدا اس کے اعمال کو دیکھتا ہے۔ ۱۵۶ - ۱۵۹

خوش بختی کا چار نکاتی منصوبہ

.. ایمان، عملِ صالح، تواصی بحق اور تواصی بہ صبر۔ ۲۶۳ ، ۲۶۶

داستانِ اصحابِ فیل

.. ذونواس کے بعد ابرہہ کا اقتدار حاصل کرنا۔ مکہ پر چڑھائی کرنا، پھر تباہی و بربادی۔ ۲۹۰ تا ۲۹۴

دشوار گزار گھاٹی

.. وہ گھاٹی غلام آزاد کرنا۔ بھوکے کو کھانا کھلانا یتیم اور خاک نشین مسکین کو۔ نیز یہ بھی گھاٹی سے گزرنا ہے کہ وہ خود ایمان لائے۔ دوسروں کو وصیت کرے اصحابِ یمین میں سے ہو۔ نہ کہ اصحابِ مشئمہ سے کہ جن کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ ۴۷

زبان کی حیرت انگیزیاں

.. زبان انسانی بدن کے بہت ہی حیرت انگیز اعضاء میں سے ہے۔ ۴۵ ، ۴۶

سرکشوں کا ہلاکت خیز انجام

.. ثمود کا سرکش قدار بن یوسف (سالف جس نے ناقۂ صالحؑ کو ہلاک کیا۔ پوری قوم کا معذب ہونا۔ ۷۰ ، ۷۴

سرکشی اور بے نیازی کا احساس

.. مرفہ الحال متکبر طبقوں سے سرکشی اور بے نیازی وجود پاتی ہے۔ اس بے خبری اور خیرہ سری سے خدا کی پناہ ۱۶۴

سورج کا عالم حیات میں نقش و اثر

.. زندگی کے لیے روشنی و حرارت (جو نہایت ضروری ہے) سورج سے مہیا ہوتی ہے تمام نعمات کی پیداوار اسی حرارت و روشنی کے زیر اثر ہے۔ ۶۷ ، ۶۸

سورۂ عادیات کی قسموں اور ہدف کے درمیان ربط

.. ایک ایسا گروہ ہے جو جہاد پر کمربستہ ہے۔ دوسری جماعت بخیل مال کی محبت میں مبتلا ہے۔ ۲۲۶ ، ۲۲۷

شب قدر، کون سی رات

.. شب قدر کے بارے میں مختلف اقوال انیسویں، اکیسویں، تیئیسویں شب ماہ رمضان۔ ۱۷۶

.. شب قدر کو مخفی رکھنے کے اسباب ۱۷۷

.. گذشتہ اُمتوں میں بھی شب قدر تھی؟ گذشتہ اُمتوں کو یہ نعمت نہیں ملی۔ ۱۷۷ ، ۱۷۸

.. شب قدر ہزار ماہ سے کس طرح بہتر ہے؟ ۱۷۸

.. قرآن شب قدر میں کیوں نازل ہوا؟ کیا مختلف علاقوں میں ایک ہی شب قدر ہوتی ہے؟ ۱۷۹

شب قدر میں کون سے امور مقدر ہوتے ہیں؟

.. ہر شخص کے لیے وہی کچھ مقدر کرتے ہیں جو اس کے لائق ہے۔ ۱۷۵

شب قدر، نزول قرآن کی رات

.. ہم نے قرآن شب قدر نازل کیا۔ ملائکہ اور روح امر الٰہی کے ساتھ نزول کرتے ہیں۔ ۱۷۲ تا ۱۷۴

طبقاتی تفاوت

.. دو گروہ اصحاب میمنہ (صالح المومنین) و اصحاب مشئمہ (کفار و مجرمین) ۳۰

.. مجاہدین کی جماعت جو جان و مال کی پروا کیے بغیر جہاد کرتے ہیں جبکہ دوسری

طرف ناشکرا بخیل انسان جو خود کھاتا اور دوسروں کو روکتا ہے۔ ۲۲۶

عبادت میں خلوصِ نیت لازم ہے

.. تمام اوامر میں قصد قربت ہونا لازم ہے ۱۹۷

علیؑ اور اُن کے شیعہ خیر البریہ ہیں۔

.. اے علیؑ! اس آیت سے مراد تم اور تمہارے شیعہ ہیں جو عرصۂ محشر میں اس طرح حاضر ہوں گے کہ تم بھی خدا سے راضی و خوش اور خدا تم سے راضی و خوش ہوگا۔ (رسول پاکؐ راوی ابن عباسؓ) ۱۹۴

غرور اور تکبر بڑے گناہوں کی بنیاد ہے۔

.. اسی صفت رذیلہ کے باعث دوسروں کی تحقیر کی جاتی ہے۔ ۲۷۹

غیبت اور عیب جوئی کرنے والوں پر وائے

.. عیب جو اور تمسخر کرنے والے پر وائے مال جمع کرتا اور گنتا رہا عنقریب جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ ۲۷۱ تا ۲۷۸

فتح مکہ، اسلام کی عظیم فتح

.. فتح مکہ تین مراحل میں انجام پائی۔ طاقت مجتمع کرنا، فتح کو ماہرانہ انداز میں کم سے کم نقصان پر حاصل کیا۔ اس فتح کے نتائج ۳۴۶ تا ۳۵۲

قرآنی قسموں کا نتائج سے ربط

.. سعادت کی راہ طے کرنے کے لیے بیدار وجدان عطا کیے ہیں۔ پھر اپنے نفس کا تزکیہ کیوں نہیں کرتے شیطان کے بہکاوے میں کیوں آتے ہو؟ ۶۷

قومِ ثمود کی سرگذشت کا خلاصہ

.. مدینہ اور شام کے درمیانی علاقے وادی القریٰ میں رہنے والی بت پرست آسودہ حال قوم کی سرگذشت۔ ۷۴ . ۷۵

کیا انسان طبعاً ناشکرا ہے

.. انسان میں دونوں صفات پائی جاتی ہیں کچھ لوگ شکر گزار و مطیع اور کچھ بخیل و نافرمان۔ ۲۲۷ . ۲۳۸

کیا بُت پرست خُدا کے منکر تھے۔

.. بُت پرست خدا کو خالق مانتے تھے۔ بتوں کو بطورِ وسیلہ پوجتے تھے۔ ۳۳۴

لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہُوں

.. لوگوں کے رب، مالک اور خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ وسوسے ڈالنے والے خناس کے شر سے جو سینوں میں وسوسے

ڈالتا ہے۔ جنوں اور انسانوں میں
وسوسے ڈالنے والے کے شر سے
مجھے محفوظ رکھے۔ ۴۰۴ ، ۴۰۶

مال جمع کرنے کی حرص

.. مال کو حلال و حرام کی تمیز کے بغیر جمع
کرنے کی مذمت ۲۸۰ ، ۲۸۳

مصائب و آلام اور پیغمبری

.. یتیمی نے یتیموں کا احساس پیدا کیا۔ آپ
نے ہمیشہ یتیموں پر شفقت فرمائی۔ لوگوں
کو توجہ دلائی۔ ۱۱۲ تا ۱۱۵

معاد کے انکار کے اثرات

.. اُس شخص کو دیکھا جو معاد کا انکار کرتا
ہے، یتیم کو دھکے دیتا ہے، مسکین و
نادار کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتا۔
ان نمازگزاروں پر وائے جو اپنی نماز
بھول جاتے ہیں، معمولی کم قیمت چیز
کسی کو مانگنے پر بھی نہیں دیتے۔ ۳۱۰ تا ۳۱۳

میزان اعمال کی سنگینی کے اسباب

.. باعتبار ثواب اعمالِ صالح مختلف ہوتے
ہیں۔ بعض میزانِ عمل کو بہت زیادہ
وزن عطا کرتے ہیں جیسے لاالٰہ الااللہ
کا وِرد۔ ۲۳۶ تا ۲۳۸

میں سپیدۂ سحر کے رب
کی پناہ مانگتا ہوں۔

.. صبح کے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔ جو کچھ
پیدا کیا اس کے شر سے، جادو کے
شر سے اور حسد کے شر سے اپنے خالق
کی پناہ مانگتا ہوں۔ ۲۹۲ تا ۲۹۵

نجات کی صرف ایک راہ

.. والعصر کی مختلف تعبیریں۔ بعض نے
وقتِ عصر مراد لیا۔ یقیناً تمام انسان
خسارے میں ہیں۔ طاقت اور قدرت
گھٹتی چلی جاتی ہے مگر وہ لوگ جو ایک
دُوسرے کو حق بات اور صبر و استقامت
کی وصیت کرتے ہیں۔ ۲۵۹ تا ۲۶۳

نعماتِ خداوندی کا شکر ادا کرو

.. پناہ دی، رہنمائی کی، بے نیاز کر دیا۔
اب سائل اور یتیم کو نہ جھڑکو۔ نعمتوں
کا شکر ادا کرو۔ ۱۰۷ تا ۱۱۲

نعمتوں کو بیان کرنا۔

.. خدا کی نعمتوں کو بیان کرنے سے انسان
اپنے پاس سے کسی چیز کے کم ہونے
کا احساس نہیں کرتا۔ ۱۱۵ ، ۱۱۶

❖ ❖ ❖

ہم خدا کی پناہ کیوں مانگتے ہیں۔
.. انسان کے ہر لمحہ انحراف کا امکان ہے خدا تو اپنے پیغمبر کو بھی وسواس خناس کے شر سے پناہ مانگنے کو کہتا ہے بشر تنہا نہیں ہے۔ فرشتے بھی انسانوں کی مدد کرتے ہیں۔ ۴۰۶

ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔
.. انجیر اور زیتون کی قسم۔ طورِ سینا کی قسم ہم نے انسان کو بہترین شکل اور بہتر نظام میں پیدا کیا۔ ۱۳۶ تا ۱۴۲

ہم نے تجھے انواع و اقسام کی نعمتیں دیں
.. سینہ کشادہ کیا، سخت بوجھ کو کم کیا، ذکر کو بلند کیا۔ ہر سختی کے بعد آسانی ہے پس اپنے رب کی طرف رغبت کر۔ ۱۲۲ تا ۱۲۹

یقین اور اس کے مراحل
.. یقین شک کا نقطۂ مقابل۔ ایمان کے اعلیٰ مرحلہ کو یقین کہا جاتا ہے۔ ۲۵۰

* * *

مقامات

بالیس
.. جنگ ذات السلاسل کے لیے مخالفین یہاں مشورہ کے لیے جمع ہوئے۔ ۲۱۸

بیت المقدس
مشہور ترین مقام ۱۳۵

حبشہ
روم کی ذیلی ریاست جس کا حکمران نجاشی تھا۔ ۲۹۱

حجاز
مدینہ و شام کے درمیان قوم ثمود کا مسکن۔ ۷۰
حجون: مکہ کے قریب بلند مقام جہاں جنابِ خدیجۃ الکبریٰ کی قبر ہے۔ ۳۵۰

دمشق
مشہور شہر زیتوں (ملک شام) کی قسم ۱۳۵

ذوی طویٰ
وہ بلند مقام جہاں سے مکہ کے مکانات صاف نظر آتے تھے۔ ۳۵۰

ذی المجاز

.. عرفات کے نزدیک مکہ سے تھوڑے فاصلہ پر ایک مقام جہاں آپؐ تبلیغ فرما رہے تھے۔ ۳۵۸

روم

.. ایک قدیم سلطنت کا نام موجودہ اٹلی کا ایک شہر۔ ۱۳۸

.. عیسائیوں کی ایک طاقتور سلطنت کا صدر مقام۔ ۲۹۱

سدّ مآرب

.. یمن کا ایک عظیم بند۔ ۲۹۷

شام

.. ایک شاداب صوبہ جس کے قریب ثمود کا مسکن تھا۔ ۷۰

.. سرزمینِ شام کی قسم ۱۳۵

کُوفہ

.. ایک بہت پرانا شہر ۱۳۷

مدینہ

.. (مشہور شہر) قبل از ہجرت رسولِ پاکؐ کی دعوت کی شہرت مدینہ پہنچ چکی تھی۔ ۱۲۰

مرالظہران

.. مکہ کے قریب وہ میدان جہاں فتح مکہ کے دن لشکرِ اسلام نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ ۳۴۸

مکہ

.. قسم ہے اس شہر مکہ کی جہاں آپؐ رہتے ہیں۔ ۳۳

.. اس بلد امین کی قسم ۱۳۶

نجران

.. سلطنتِ یمن کے قریب عیسائی ریاست ۲۹۰

نجف

.. کوفہ کے نزدیک ایک شہر ۱۳۷

یمن

.. ابرہہ کی حکومت کا صدر مقام ۲۸۷

یونان

.. ایک ملک کا نام ۱۳۸

❊ ❊ ❊

اختتام توفیقِ ربانی کے ساتھ اللھم صل علی محمدؐ و آل محمدؐ

ترتیب و تدوین: سید شکیل حسین موسوی

۲۸ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ ۸ اکتوبر ۱۹۹۱ء